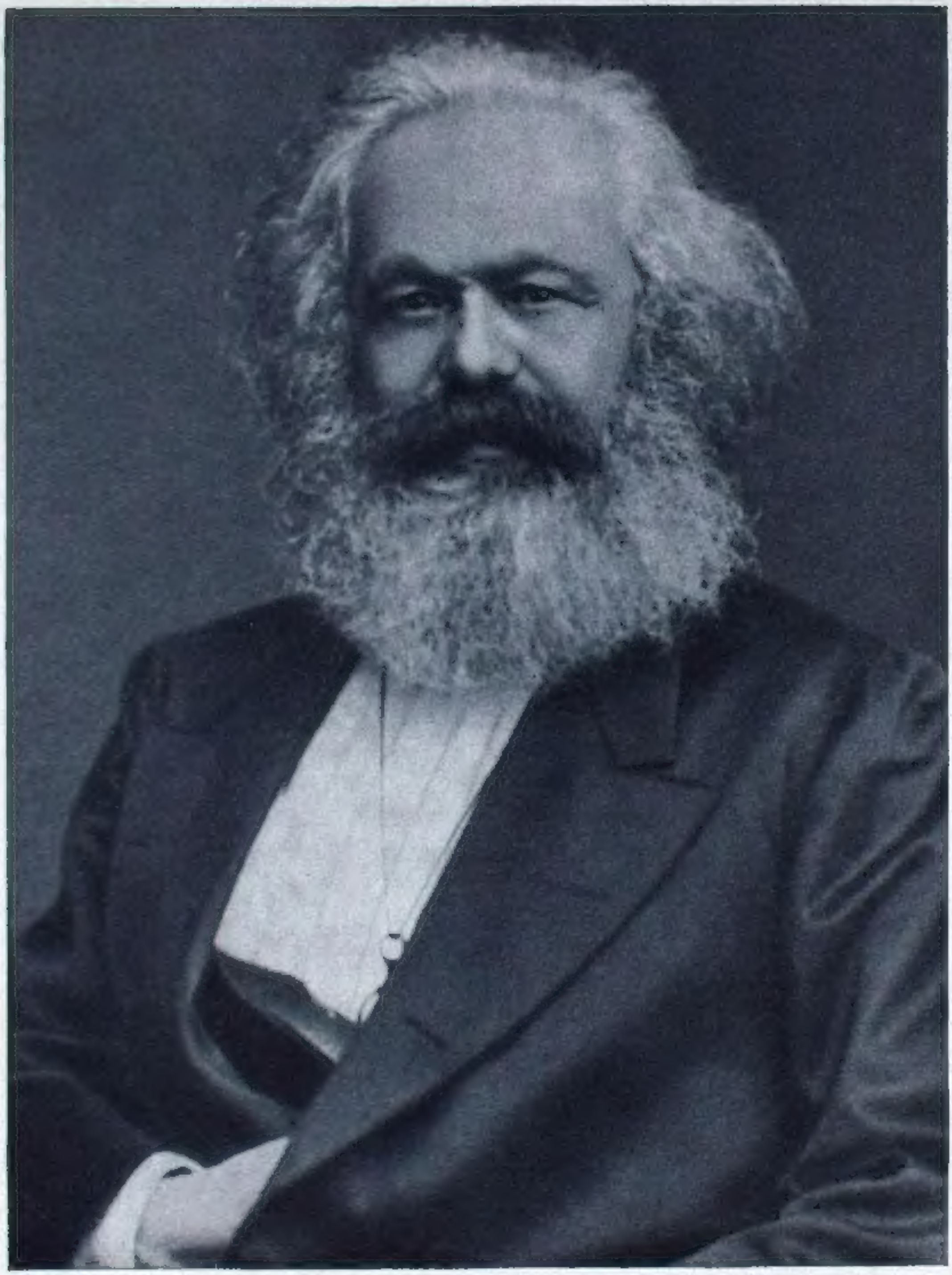
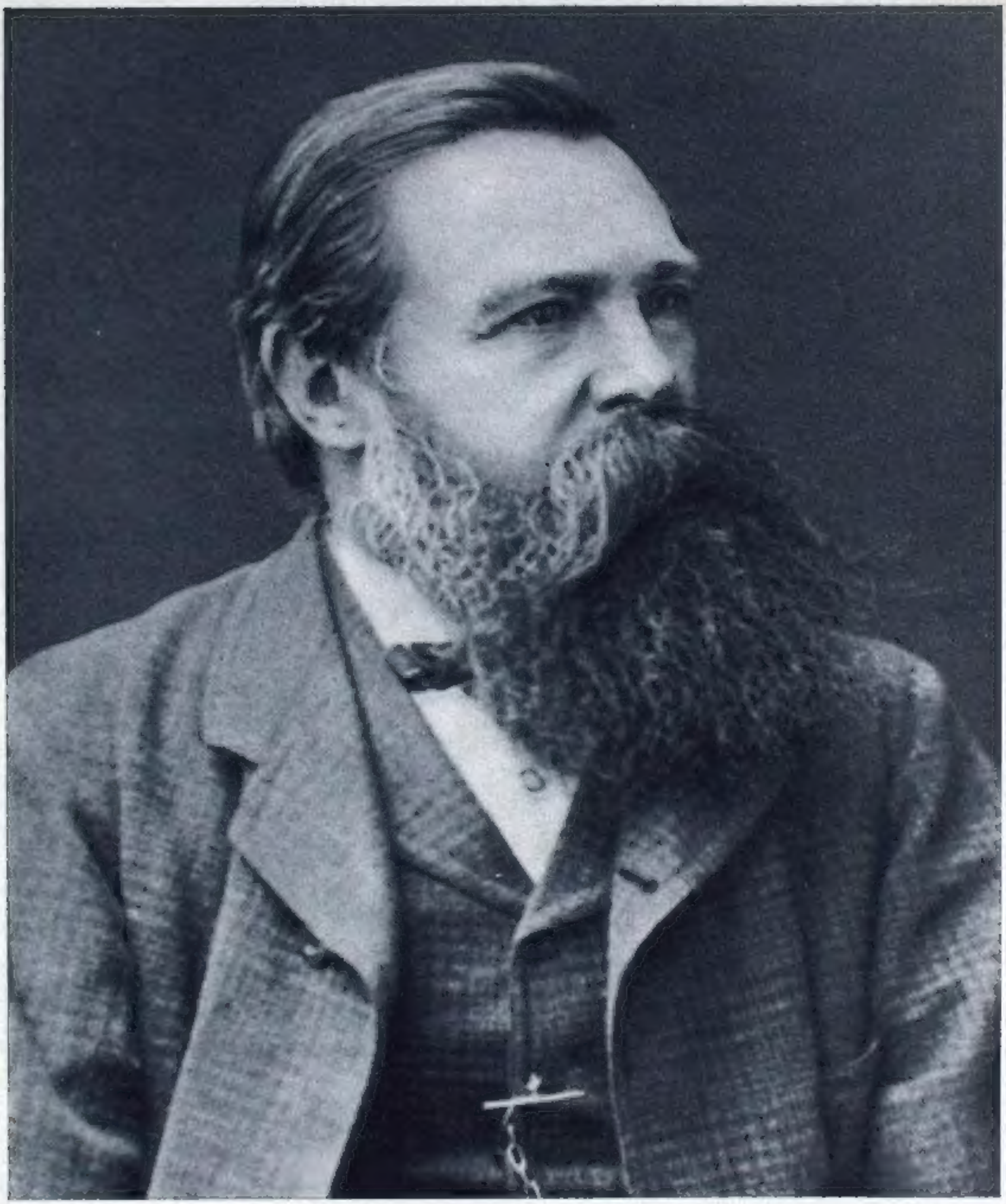
کارل مارکس
فریڈرک اینگلس





کارل مارکس
فریڈرک اینگلس

منتخب تصانیف

حصہ اوّل (۱)

دارالاشاعت ترقی، ماسکو

۱۹۷۱ء

ترجمہ : ظ انصاری

К. МАРКС, Ф. ЭНГЕЛЬС
ИЗБРАННЫЕ ПРОИЗВЕДЕНИЯ
(часть I)

На языке урду

فہرست

صفحہ

پبلشر کی طرف سے

کارل مارکس اور فریڈرک اینگلس کی تعلیمات انسانی فکرونظر کی ایک سب سے اونچی رسائی ہے۔ مارکس‌ازم پرولتاریوں کے نظریات کا علم ہے، پرولتاریہ کے مفادوں کا علمی بیان ہے، تمام محنت کشوں کا روحانی ہتھیار ہے اس جنگ میں جو قومی آزادی، امن اور سوشلزم کےلئے جاری ہے۔

علمی کمیونزم کی داغ بیل ڈالنےوالوں نے اپنی کاوشوں سے دنیائے علم و تحقیق میں، اور سوشلزم کے متعلق فکر ونظر میں سچا انقلاب برپا کردیا۔ سماجی ارتقا کے اصل راز معلوم کرکے مارکس اور اینگلس نے تحقیق سے ثابت کردیا کہ سرمایہ‌داری نظام کی تباہی اور اشتراکی نظام کی فتح قطعی اور یقینی ہے۔ سرمایہ‌داری سماج کا صفایا کرنا، پورے سماجی ڈھچر کی گہری انقلابی کایاپلٹ کرنا، اور آخر ایسا سماج بنانا جس کا اصل اصول ہو آزادی، مساوات، اخوت، امن اور محنت، یہ ہیں وہ عظیم‌الشان اور نیک مقصد جو پرولتاریہ کے عالمی تاریخی مشن میں شامل ہیں اور یہ مشن اسے پورا کرنا ہے محنت کشوں کی بڑی سے بڑی عام تعداد کی خاطر، یہ مشن اسے پورا کرنا ہے کسانوں کی مدد سے اور سماج کی تمام ترقی‌پسند طاقتوں کی مدد سے۔

اشتراکی انقلاب کو یہ کرنا ہے کہ نوآبادیاتی اور نسلی مظالم کی تمام شکلوں کو ہمیشہ کےلئے مٹادے۔ مارکس اور اینگلس کی

تعلیمات کی روشنی میں قومی آزادی کی تحریک مزدور طبقے کی حلیف ھے اور پوری دنیا کے انقلابی عمل کا ایک لازمی حصہ ھے۔

مارکس‌ازم کے بانیوں نے یہ آثار پہلے سے دیکھ لئے تھے کہ ترقی‌یافتہ ملکوں میں مزدور طبقے کی فتح ھوجائے تو اس کی مدد سے پسماندہ ملک غیرسرمایہ‌دارانہ ترقی کے راستے پر بڑھ سکتے ھیں۔

مارکس اور اینگلس نے پرولتاریہ کی انقلابی جدوجہد کی تدبیروں اور ترکیبوں کا پورا نقشہ مرتب کیا اور مزدور طبقے کی اپنے بل پر سیاسی پارٹی بنانے کی تعلیم دی، جس کے بغیر سرمایہ‌داری نظام کا تختہ الٹنا ممکن نہیں۔

مارکس اور اینگلس کے نظریات تاریخ کے نئے نئے تجربات کے حاصل سے مالامال ھوتے جاتے ھیں۔ ان دونوں کے کام کو آگے لےجانےوالے اور ان کے صاحب نظر شاگرد لینن نے مارکس‌ازم کے خزانے میں زبردست دولت کا اضافہ کیا ھے۔ مارکس‌ازم لینن‌ازم کا نظریہ روزبروز کروڑوں آدمیوں کے دل‌ودماغ کو اپنی طرف کھینچ رھا ھے۔ ھر ایک نیا تاریخی دور مارکس، اینگلس اور لینن کے اس نظرئے کی تازہ‌بتازہ تصدیق کرتا ھے جو سدا امر رھےگا اور برابر تازہ دم ھوتا رھےگا۔

سوویت یونین کی مثال سے، دوسرے اشتراکی ملکوں کی مثال سے، تمام دنیا کے محنت کشوں کی جنگ‌آزادی سے، ان قوموں کے تجربے سے جنھوں نے نوآبادیاتی جوا اپنے کاندھے سے اتارپھینکا ھے، یہ ثابت ھوگیا کہ مارکس اور اینگلس کی تعلیم سماجی ترقی کےلئے اور دنیا کو نئی اور منصفانہ لائنوں پر پھر سے ترتیب دینے کی جدوجھد میں سب سے کارگر ھتھیار ھے۔

زیرنظر چاروں جلدوں میں مارکس اور اینگلس کی ان خاص تحریروں اور خطوں کو شامل کیا گیا ھے، جن میں ان کی عظیم انقلابی تعلیم کے بنیادی اجزا سمٹ آتے ھیں یعنی مارکسی فلسفہ، سیاسی معاشیات، علمی کمیونزم کا نظریہ اور پرولتاریہ کی طبقاتی جدوجھد کی تدبیر اور ترکیب دونوں کے اصول۔

کئی بنیادی تصانیف مثلاً ''سرمایہ،، (Capital) اور '' فطرت

کی جدلیات،، وغیرہ، ایسی ہیں جن سے صرف اقتباسات چن دئے گئے ہیں۔

اشاعت گھر نے طے کیا کہ دیباچے کے طور پر اس مجموعے کے شروع میں لینن کے مضمون ''کارل مارکس،، سے کچھ حصے دے دئے جائیں اور ان پر لینن کے دو مضمون اور بڑھا دئے جائیں: ''فریڈرک اینگلس،، اور ''مارکس‌ازم کے تین سرچشمے اور تین اجزائے ترکیبی،،۔

ان مضمونوں میں لینن نے مارکس‌ازم کا بڑی بلندی سے مجموعی جائزہ لیا ہے اور اس کے اجزائے ترکیبی بتائے ہیں، مارکس اور اینگلس کے خیالات کی تشکیل کا پتہ لگایا ہے۔ ولادیمیر ایلیچ لینن نے مختصر طور پر مزدور طبقے کے ان زبردست استادوں کی سوانح حیات بیان کی ہے اور بتایا ہے کہ مارکس‌ازم کی ایجاد اور ترقی میں، انٹرنیشنل پرولتاریہ کی جہد آزادی میں ان دونوں میں سے ہر ایک کی کیا دین رہی ہے۔

مجموعے کی ساری تحریریں ان کی تصنیف کے حساب سے تاریخ وار مرتب کی گئی ہیں، البتہ مصنف کے دیباچوں کی ترتیب میں یہ رعایت نہیں رکھی گئی۔ دیباچے جس جس مضمون سے متعلق ہیں، اسی کے ساتھ دئے گئے ہیں۔ مارکس اور اینگلس کے خطوط چوتھی جلد میں جمع کئے گئے ہیں۔

پڑھنے والوں کی سہولت کی خاطر ایک جلد کو چار میں بانٹ دیا گیا۔ ہر ایک جلد کے ساتھ نام، مقام اور واقعات کے تشریحی نوٹ نمبروار ہر ایک جلد کے آخری صفحوں میں شامل ہیں۔ چار جلدوں کا اشاریہ (Subject Index) چوتھی جلد کے آخر میں رکھا گیا ہے۔

لینن

کارل مارکس

مختصر سوانح حیات

جس میں مارکس ازم کی تشریح بھی شامل ہے

(اقتباس)

کارل مارکس ۵ مئی ۱۸۱۸ء کو شہر تریر (دریائے رائن کے کنارےوالے پروشیا) میں پیدا ہوئے۔ مارکس کے باپ ایک یہودی وکیل تھے جنہوں نے ۱۸۲۴ء میں مسیحی فرقے پروٹسٹنٹ کا مذہب قبول کرلیا۔ پورا گھرانا خوش حال تھا، مہذب تھا مگر انقلابی نہیں تھا۔ تریر میں جمنازیم کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد مارکس نے یونیورسٹی میں داخلہ لےلیا۔ پہلے بون میں اور پھر برلن یونیورسٹی میں، انہوں نے قانون کی تعلیم حاصل کی اور خاص طور سے تاریخ اور فلسفے کا مطالعہ کیا۔ ۱۸۴۱ء تک ان کی باقاعدہ طالبعلمی آخری منزل کو پہنچ گئی اور انہوں نے اپیی کیوریس کے فلسفے پر اپنا تحقیقی مقالہ ڈاکٹری کی سند حاصل کرنے کےلئے پیش کر دیا۔ خیالات کے لحاظ سے کارل مارکس اس وقت تک ہیگل فلسفی کے عینی (آئڈیلسٹ) نظرئے کو مانتے تھے۔ برلن میں بھی ان کا حلقہ "ہیگل کے بائیں بازووالے حامیوں" کا تھا (مثلاً برونو باؤیر وغیرہ)۔ ان لوگوں کی کوشش یہ رہتی تھی کہ ہیگل کے فلسفے سے لامذہبیت کے خیالات اور انقلابی نتیجے اخذ کریں۔

یونیورسٹی سے گریجویٹ ہو چکنے کے بعد مارکس شہر بون آ گئے جہاں ان کا ارادہ پروفیسری کرنے کا تھا۔ لیکن یہاں انہیں

نظر آیا کہ حکومت کی پالیسی سخت رجعت‌پرستی کی ہے۔ حکومت نے فلسفی لڈوگ فائرباخ کو ۱۸۳۲ء میں یونیورسٹی کی مسند سے نکال دیا اور ۱۸۳۶ء میں اسے یونیورسٹی واپس آنے سے روک دیا اور ۱۸۴۱ء میں نوجوان پروفیسر برونو باؤیر کے بون یونیورسٹی میں لکچر دینے پر پابندی لگادی۔ یہ سب دیکھ کر مارکس نے استاد کی زندگی بسر کرنے کے ارادے سے ہاتھ دھو لئے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب ہیگل کے بائیں بازووالے حامیوں کے خیالات جرمنی میں بہت تیزی سے پھیل رہے تھے۔ لڈوگ فائرباخ نے ۱۸۳۶ء اور اس کے بعد خاص طور پر دینیات پر کھلی نکتہ‌چینی شروع کردی اور وہ مادیت کے نظریے کی جانب مڑنے لگے جو آگے چل کر ۱۸۴۱ء میں فائرباخ کے فلسفے پر حاوی ہو گیا (''مسیحیت کی اصلیت،، تصنیف کیا)۔ پھر ۱۸۴۳ء میں ان کی کتاب ''مستقبل کے فلسفے کے اصول،، سامنے آئی۔ ان کتابوں کے بارے میں اینگلس نے آگے چل کر لکھا کہ ان کتابوں میں ''کس قدر نجات دینےوالا گہرا اثر ہے اس کا تجربہ ہر ایک کو ضرور ہوگا۔ ہم،، (یعنی ہیگل کے بائیں‌بازووالے حامی جن میں مارکس بھی شامل تھے) ''سب کے سب ایک دم فائرباخ کے حامی ہو گئے۔،،* ان ہی دنوں رائنی علاقے کے ریڈیکل بورژوا لوگوں نے، جنھیں ہیگل کے گرم حامیوں سے کہیں کہیں اتفاق رائے تھا، کولون شہر سے ایک مخالفانہ پرچہ نکالا «Rheinische Zeitung» (یکم جنوری ۱۸۴۲ء کو اس کا پہلا نمبر آیا)۔ مارکس اور برونو باؤیر دونوں کو دعوت دی گئی تھی کہ وہ خاص طور پر اس پرچے کے لئے لکھا کریں۔ اکتوبر ۱۸۴۲ء میں کارل مارکس اس اخبار کے چیف ایڈیٹر ہو گئے اور شہر بون سے کولون چلے آئے۔ مارکس کی ایڈیٹری میں اس اخبار کا انقلابی جمہوری رنگ زیادہ سے زیادہ کھلتا گیا۔ پہلے تو حکومت نے اس اخبار پر دھری تہری سنسرشپ لگائی اور پھر یکم جنوری ۱۹۴۳ء کو فیصلہ کیا کہ پرچے کو بالکل ہی کچل دیا جائے۔ قریب قریب اسی زمانے میں مارکس کو مجبور ہو کر ایڈیٹری سے استعفا دینا پڑا۔ لیکن بچاؤ کی صورت یوں بھی نہ

*اینگلس ''لڈوگ فائرباخ اور جرمن کلاسیکی فلسفے کا خاتمہ،،۔(ایڈیٹر)

ہوئی اور بالآخر مارچ ۱۸۴۳ ء میں یہ اخبار بالکل بیٹھ گیا۔ مارکس نے اس اخبار میں جو خاص اہم مضامین لکھے ہیں اور ان میں مندرجۂذیل مضامین کے علاوہ (دیکھئے فہرست کتب *) اینگلس نے ایک اور مضمون کا اندراج کیا جو موزل ** کی وادی میں انگور کے کاشتکاروں کی حالت کے بارے میں لکھا گیا۔ اخباری سرگرمیوں نے مارکس پر واضح کر دیا کہ سیاسی معاشیات سے ان کی واقفیت کافی نہیں ہے، چنانچہ وہ اسی موضوع کا مطالعہ کرنے میں پورے جوش‌وخروش سے لگ گئے۔

مارکس نے ۱۸۴۳ ء میں کروزناخ شہر میں جینی فون‌ویسٹ‌فالین سے شادی کرلی۔ دونوں بچپن کے دوست تھے اور طالب علمی کے ہی زمانے میں شادی طے ہو چکی تھی۔ مارکس کی بیوی پروشیا کے اونچے گھرانوں میں سے ایک رجعت‌پرست خاندان کی لڑکی تھیں۔ ان کا بڑا بھائی ۱۸۵۰ ء — ۱۸۵۸ ء کے نہایت رجعت‌پرست دور میں پروشیا کا وزیرداخلہ رہا تھا۔ ۱۸۴۳ ء کے موسم خزاں میں مارکس پیرس گئے تاکہ وہاں سے ایک ریڈیکل رسالہ نکال سکیں۔ مارکس کے ساتھ آرنلڈ روگے بھی تھا (جو ۱۸۰۲ ء میں پیدا ہوا۔ وہ بھی ہیگل کے گرم حامیوں میں سے تھا۔ ۱۸۲۵ ء سے ۱۸۳۰ ء تک جیل میں رہا۔ ۱۸۴۸ ء کے بعد سیاسی جلاوطن قرار پایا اور ۱۸۶۶ ء سے ۱۸۷۰ ء تک بسمارک کا حامی رہا۔ ۱۸۸۰ ء میں مر گیا)۔ اس رسالے «Deutsch-Französische Jahrbücher» کا صرف ایک ہی شمارہ نکل پایا کیونکہ جرمنی میں چھپے چوری اخبار تقسیم کرنے کی مشکلات نے اور روگے سے اختلاف نے رسالے کی اشاعت رکوا دی۔ اس رسالے میں مارکس نے جو مضامین لکھے انھی میں مارکس ایک انقلابی نظر آتے ہیں، وہ پرچار کرتے ہیں کہ ”موجودات میں ہر چیز پر بےباک اور بےلاگ تنقید ہونی چاہئے“، خاص طور سے

* لینن کے اس مضمون کے آخرمیں مارکس‌ازم اور مارکسی ادب کے بارے میں تبصرہ دیا ہوا تھا جو اس ایڈیشن سے خارج ہے۔ (ایڈیٹر)

** یہاں لینن مارکس کے مضمون ”موزل کے نامہ‌نگار کی بریت“ کا ذکر کرتے ہیں۔ (ایڈیٹر)

”ہتھیاروں سے تنقید“ اور انھی میں مارکس نے عوام اور پرولتاریہ سے اپیل شروع کردی تھی۔

ستمبر ۱۸۴۴ء میں فریڈرک اینگلس کچھ دنوں کے لئے پیرس آئے تھے، اس کے بعد سے وہ مارکس کے بہترین اور جگری دوست بن گئے۔ ان دنوں پیرس میں انقلابی ٹولیوں کی زندگی اندر ھی اندر ابل رہی تھی، مارکس اور اینگلس دونوں نے اس میں خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لیا (خاص طور سے فلسفی پرودھوں کے نظریے کا ذکر کیا جاسکتا ھے جسے مارکس نے اپنی تصنیف ”فلسفے کا افلاس“ ۱۸۴۷ء سے بالکل ڈھا دیا)۔ ان دونوں نے بڑی پامردی سے پیٹی بورژوا قسم کے سوشلزم کے مختلف نظریوں سے جنگ کی اور اس نظرئے کا نقشہ تیار کیا جو انقلابی پرولتاری سوشلزم یا کمیونزم (مارکس‌ازم) کا نظریہ تھا، اور اس کا طریق‌کار طے کیا۔ اس سلسلے میں مارکس کی اس زمانے کی (۱۸۴۸ء—۱۸۴۴ء) تحریریں دیکھی جا سکتی ھیں (آخر میں فہرست کتب ھے)۔ ۱۸۴۵ء میں پروشیا کی حکومت کے لگاتار اصرار پر مارکس کو پیرس سے اس الزام میں نکال دیا گیا کہ وہ ایک خطرناک انقلابی ھیں۔ یہاں سے وہ بروسلز شہر چلے گئے۔ ۱۸۴۷ء کے موسم بہار میں مارکس اور اینگلس دونوں نے ایک خفیہ پروپیگنڈا سوسائٹی میں شرکت کر لی۔ سوسائٹی کا نام ”کمیونسٹ لیگ“ تھا۔ اور جب (لندن میں نومبر ۱۸۴۷ء میں) ”کمیونسٹ لیگ“ کی دوسری کانگرس ہوئی تو ان دونوں نے اس میں بہت نمایاں حصہ لیا۔ اسی سوسائٹی کے کہنے پر انہوں نے مشہور ”کمیونسٹ پارٹی کا مینی‌فسٹو“ تیار کیا جو فروری ۱۸۴۸ء میں چھپ کر سامنے آیا۔ یہ مینی‌فسٹو نہایت وضاحت اور کمال ذھانت کے ساتھ دنیا کے ایک نئے تصور کا خاکہ پیش کرتا ھے، ایک نہایت مرتب اور باضابطہ مادیت کے نظرئے کا پتہ دیتا ھے، ایسا نظریہ جس کے دائرے میں پوری سماجی زندگی آجاتی ھے، جدلیات آجاتی ھیں، جو ارتقائے کائنات کا نہایت گہرا اور جامع تصور ھے، وہ نظریہ جو طبقاتی جدوجہد اور اس پرولتاریہ کے تاریخی انقلابی رول کو اجاگر کرتا ھے جو نئے کمیونسٹ سماج کا جنم داتا ھے۔

جب فروری ۱۸۴۸ ء کا انقلاب شروع ہوا تو مارکس کو بلجیم سے بھی نکال دیا گیا۔ وہ پھر پیرس آئے ، یہاں مارچ کے انقلاب کے بعد وہ جرمنی کے کولون شہر چلے آئے۔ کولون میں پہلی جون ۱۸۴۸ ء سے «Neue Rheinische Zeitung» (نیا رائنی اخبار) نکلنا شروع ہوا۔ مارکس اس کے چیف ایڈیٹر تھے۔ یہ اخبار ۱۹ مئی ۱۸۴۹ ء تک نکلا۔ ۱۸۴۸ ء اور ۱۸۴۹ ء کے انقلابی واقعات نے نئے نظرئے کی بہت روشن طریقے سے عملی تصدیق کردی — اور یہ تصدیق اس کے بعد سے دنیا کے تمام ملکوں کی پرولتاری اور جمہوری تحریک ہمیشہ کرتی رہی ہے۔ انقلاب کے دشمنوں کو فتح ھاتھ آئی تو انہوں نے چھوٹتے ھی مارکس کے خلاف عدالتی کارروائی کی (۹ فروری ۱۸۴۹ ء کو مارکس اس مقدمے سے بری ہو گئے) اور بعد میں انہیں جرمنی سے نکال دیا (۱۶ مئی ۱۸۴۹ ء)۔ مارکس اس بار پھر جلاوطن ہو کر سیدھے پیرس پہنچے لیکن جب ۱۳ جون ۱۸۴۹ ء کا مظاہرہ ہوا تو انہیں پھر پیرس سے نکالا گیا اور یہاں سے وہ لندن چلے گئے ، مارکس اپنی زندگی کے آخری لمحے تک لندن میں ھی رہے۔

سیاسی جلاوطن کی حیثیت سے مارکس کی زندگی بڑی مصیبتوں کی زندگی تھی۔ مارکس اور اینگلس کے درمیان جو خط و کتابت ہوتی رہی (اور ۱۹۱۳ ء میں شائع ہوئی ہے) اس سے یہ صاف نظر آتا ہے۔ مارکس اور ان کے کنبے کو انتہائی غریبی اور افلاس کے دن کاٹنے پڑے۔ اگر اینگلس نے مسلسل ایثار کر کے مارکس کی مالی امداد نہ کی ہوتی تو مارکس ''سرمایہ،، پر اپنا کام تو کیا ختم کرتے ، خود بھوک اور افلاس کے ھاتھوں ختم ہو جاتے۔ ایک طرف یہ حالات تھے ، دوسری طرف پیٹی بورژوا طبقے کے رجحانات اور ایسے نظرئے جو بالکل غیرپرولتاری سوشلزم کے خیالات پھیلاتے ھیں ، ھر طرف چھائے ہوئے تھے ، انہوں نے مارکس کو مجبور کیا کہ وہ ان نظریوں سے لگاتار اور بےباکانہ جنگ کریں اور کبھی کبھی تو انہیں نہایت بے شرم گندے اور رکیک ذاتی حملوں کا جواب دینا پڑا (مثلاً * «Herr Vogt» میں)۔ سیاسی جلاوطنوں

* ک۔ مارکس ''مسٹر فوگٹ،،۔ (ایڈیٹر)

کے حلقوں سے الگ‌تھلگ رہ کر مارکس نے کئی تاریخی تصنیفوں میں اپنا مادیت کا نظریہ ڈھالا (دیکھئے فہرست کتب) اور اپنی تمام کوششوں کو سیاسی معاشیات کے مطالعے کے لئے بڑی حد تک وقف کر دیا۔ مارکس نے اس علم کی پوری کائنات میں (آگے دیکھئے عنوان: ''مارکس کے افکار،،) ''سیاسی معاشیات کی تنقید پر،، (۱۸۵۹ء) اور کتاب ''سرمایہ،، (۱۸٦۷ء جلد ۱) لکھکر انقلاب برپا کر دیا۔

انیسویں صدی کی چھٹی دھائی کے آخر اور ساتویں دھائی کے زمانے میں جمہوری تحریکوں میں جو دوبارہ جان پڑی تو مارکس کو پھر سے عملی سرگرمیوں کا بلاوا ملا۔ (۲۸ ستمبر) ۱۸٦۴ء میں لندن میں ''محنت کرنےوالوں کی انٹرنیشنل ایسوسی‌ایشن،، قائم کی گئی جو پہلی انٹرنیشنل کے نام سے مشہور ھے۔ مارکس اس انجمن کے روح‌رواں بن گئے۔ اس کی پہلی ''اپیل،،* بھی مارکس نے تیار کی اور نہ‌جانے کتنی ھی تجویزیں، کتنے ھی اعلان اور اعلان‌نامے مارکس کے قلم سے ترتیب پائے۔ مختلف ملکوں کی مزدور تحریکوں میں اشتراک پیدا کرکے اور اس کی زبردست کوشش کرکے کہ مارکسی نظرئے سے پہلے کے غیرپرولتاری سوشلزم کو ماننےوالی مختلف شکلیں جوڑ کر سرگرمیوں کی ایک ھی راہ پر لگادی جائیں، اور ان مختلف شکلوں، مختلف گروھوں اور فرقوں کے نظرئے سے مقابلہ کرکے مارکس نے مختلف ملکوں کے مزدور طبقے کی پرولتاری جدوجہد کے لئے ایک متناسب اور سڈول حکمت‌عملی ڈھال لی۔ (مارکسی نظرئے سے پہلے غیرپرولتاری سوشلزم کی شکلیں اس طرح کی تھیں جیسے ماتسینی، پرودھوں اور باکونن کے نظرئے، انگلینڈ کی لبرل ٹریڈیونین تحریک، جرمنی کی لاسال‌والی تحریک جو داھنی طرف جھکی ھوئی تھی، وغیرہ۔) ۱۸۷۱ء میں جب پیرس کمیون ختم ھو گیا (اپنے مضمون ۱۸۷۱ء کی ''فرانس میں خانہ‌جنگی،، میں) مارکس نے اس واقعے کا گھرا،

---

* کارل مارکس ''محنت کرنےوالوں کی انٹرنیشنل ایسوسی‌ایشن کا تاسیسی مینی‌فسٹو،،۔ (ایڈیٹر)

واضح ، روشن ، موثر اور انقلابی تجزیه کیا ہے اور اس کے بعد باکونن کے ماننےوالوں کے ہاتھوں پہلی انٹرنیشنل کے ٹکڑے ہو گئے تو یورپ میں اس جماعت کا باقی رھنا ممکن نہیں رھا۔ ھیگ میں پہلی انٹرنیشنل کی کانگرس ۱۸۷۲ ء میں ھوئی تو مارکس نے اس کی جنرل کونسل کو یورپ سے نیویارک منتقل کرا دیا۔ پہلی انٹرنیشنل نے اپنا تاریخی فریضہ انجام دے دیا تھا اور ایک ایسے دور کی راہ ھموار کر دی تھی جس میں تمام دنیا کے ملکوں کی مزدور تحریک بےپناہ طریقے پر بڑھ سکے اور پھیل سکے۔ ایسا دور آیا جب کہ تحریک وسعت میں بھی بڑھی اور الگ الگ قومی ریاستوں میں عوام کے درمیان سوشلسٹ مزدور پارٹیاں وجود میں آگئیں۔

انٹرنیشنل کے لئے جان‌توڑ کوششوں نے اور اس سے بھی زیادہ فکری مصروفیتوں نے مارکس کی صحت بالکل خاک میں ملا دی۔ سیاسی معاشیات کو ادل بدل کر ٹھیک شکل دینے کے لئے اور اپنی تصنیف ”سرمایه“ کو پورا کرنے کے لئے انہوں نے بےشمار نیا مسالہ فراھم کیا ، کئی زبانیں (مثلاً روسی) سیکھیں۔ وہ اس قدر کام کرتے تھے که تندرستی ھاتھ سے جاتی رھی اور صحت کی خرابی نے انہیں اپنی تصنیف ”سرمایه“ کو مکمل نہ کرنے دیا۔

۲ دسمبر ۱۸۸۱ ء کو ان کی بیوی جینی کا انتقال ھو گیا اور ۱۴ مارچ ۱۸۸۳ ء کو مارکس اپنی آرام کرسی پر ھمیشه کے لئے سو گئے۔ آج لندن کے ھائی گیٹ قبرستان میں مارکس اور ان کی بیوی آرام کر رھے ھیں۔ مارکس کی اولاد میں سے کچھ تو بچپن میں انتقال کر گئے جب اس خاندان کو سخت افلاس کا سامنا تھا۔ تین بیٹیوں ایلیونورا ایولینگ ، لاؤرا لافارگ اور جینی لونگے نے انگریز اور فرنچ سوشلسٹوں سے شادی کرلی۔ جینی لونگے کا بیٹا فرانسیسی سوشلسٹ پارٹی کا ممبر ھے۔

جولائی — نومبر ۱۹۱۴ ء میں لکھا گیا۔ پہلی بار ۱۹۱۵ ء میں ”گرانات“ انسائیکلوپیڈیا کے ساتویں ایڈیشن کی جلد ۲۸ میں شائع ھوا۔

لینن کا مجموعۂ تصانیف ، پانچواں روسی ایڈیشن ، جلد ۲۶ ، صفحات ۵۰ — ۴۳

لینن

فریڈرک اینگلس کی وفات پر

کیا عقل کا چراغ تھا، خاموش ہوگیا
کیادل تھا، دھڑکنوں کے تلاطم میں سوگیا! *

نئے کیلنڈر سے ۵ اگست (۲۴ جولائی) ۱۸۹۵ ء کو فریڈرک اینگلس نے لندن میں انتقال کیا۔ اپنے دوست کارل مارکس کی وفات (۱۸۸۳ ء) کے بعد وہی ایک شخص تھا جسے تمام متمدن دنیا میں موجودہ پرولتاری طبقے کا بہترین استاد اور علامہ کہنا چاہئے۔ جس دن سے کارل مارکس اور فریڈرک اینگلس کو یکجائی نصیب ہوئی دونوں دوستوں نے اپنی زندگی ایک ہی مقصد میں لگادی۔ چناں‌چہ فریڈرک اینگلس نے پرولتاریہ کے لئے جو کچھ کیا ہے، اسے سمجھنے کے لئے صاف صاف یہ ذہن‌نشین کرنا ضروری ہے کہ آج محنت کش طبقے کی تحریک کو فروغ دینے میں کارل مارکس کی تعلیمات اور اس کے کام کی کیا اہمیت ہے۔ مارکس اور اینگلس یہ ثابت کرنے میں سب سے اول ہیں کہ مزدور طبقہ اور اس کی مانگیں لازمی نتیجہ ہیں موجودہ معاشی نظام کا اور یہی نظام ہے جو بورژوازی کے ساتھ بہرحال پرولتاریہ کو جنم بھی دیتاہے اور اس‌کی تنظیم بھی کرتا ہے۔ مارکس اور اینگلس نے یہ دکھا دیا کہ کچھ بھلے مانسوں اور نیک بندوں کی دیانت‌دارانہ کوششوں کی بدولت نہیں، بلکہ منظم

* دوبرولیوبوف کی یاد میں شاعر نکراسوف کے الفاظ۔ (ایڈیٹر)

پرولتاریہ کی طبقاتی جدوجہد کے زور سے ہی انسانیت کو ان برائیوں سے نجات ملےگی جو آج اسے شکنجے میں کسے ہوئے ہیں۔ اپنی علمی تحریروں کے ذریعے مارکس اور اینگلس نے سمجھایا کہ سوشلزم خواب‌وخیال کی شعبدہ‌کاری نہیں بلکہ ایک منزل‌مقصود اور لازمی نتیجہ ہے موجودہ سماج کی پیداواری قوتوں کے بڑھنے چڑھنے کا۔ آج تک جتنی تاریخ لکھی جا چکی ہے وہ تمام تر طبقاتی کش‌مکش کی تاریخ ہے، لگاتار بعض سماجی طبقوں کو اوروں پر حاکمانہ اختیارات اور غلبہ حاصل رہنے کی تاریخ ہے۔ یہ سلسلہ اس وقت تک چلتا رہےگا جب تک طبقاتی کش‌مکش اور طبقاتی غلبے کی جڑ بنیاد، یعنی ذاتی ملکیت اور اندادھند سماجی پیداوار کا صفایا نہیں ہو جاتا۔ پرولتاریہ کا مفاد اس میں ہے کہ ان بنیادوں کا خاتمہ کر دیا جائے۔ لہازا منظم مزدوروں کی باشعور طبقاتی کش‌مکش کا رخ انھی بنیادوں کے خلاف ہونا چاہئے۔ ہر ایک طبقاتی کش‌مکش سیاسی جدوجہد ہوتی ہے۔

مارکس اور اینگلس کے ان خیالات کو اب ان تمام پرولتاریوں نے اپنا لیا ہے جو اپنی رہائی کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔ لیکن ۱۸۴۰ء کے دھلے میں جب ان دونوں دوستوں نے اشتراکی لٹریچر اور اپنے زمانے کی سماجی تحریکوں میں قدم رکھا تو وہ بالکل ہی نئے تھے۔ بہتیرے لوگ، جن میں لائق اور نالائق، ایماندار اور بےایمان سبھی تھے، سیاسی آزادی کی جدوجہد میں، بادشاہوں، پولیس‌والوں اور پادریوں کی مطلق‌العنانی کے مقابل صف‌آرائی میں لگے ہوئے، وہ لوگ اس حقیقت کو نظر میں نہ رکھ سکے کہ بورژوازی کے مفاد اور پرولتاریہ کے مفادوں میں مستقل ٹکراؤ چلتا ہے۔ وہ اس خیال کو گلے نہیں اتار سکے تھے کہ مزدور ایک آزادانہ سماجی طاقت کی حیثیت سے عمل کریں۔ دوسری طرف ایسے بہت سے خیالی لوگ، جن میں بعض جی‌نی‌یس (geniuses) بھی تھے، یہ سوچتے رہے کہ حاکموں اور حاکمانہ اختیار رکھنےوالے طبقوں سے صرف اتنا منوا لینا ضروری ہے کہ موجودہ سماجی نظام انصاف سے محروم ہے، یہ منوا لیا تو زمین پر امن‌چین کا راج ہو جائےگا اور عام بھلائی پھیل جائےگی۔ یہ لوگ ایسے سوشلزم کا خواب دیکھتے تھے جس تک

رسائی کے لئے جدوجہد کی کوئی ضرورت نہیں ۔ آخر میں اس زمانے کے قریب قریب سارے ھی سوشلسٹ اور مزدور طبقے کی بھلائی چاھنےوالے عام طور سے پرولتاریہ کو ناسور سمجھتے تھے اور ان پر دھشت سوار تھی کہ انڈسٹری بڑھنے کے ساتھ ساتھ پرولتاریہ کتنا بڑھ گیا ھے ۔ چناںچہ یہ سبھی اس فکر میں مبتلا تھے کہ کسی تدبیر سے انڈسٹری کا بڑھنا اور اسی کے ساتھ پرولتاریہ کا بڑھنا روکا جائے ، ''تاریخ کے پہیے کا گھماؤ،، روکا جائے ۔ مارکس اور اینگلس کو پرولتاریہ کے بڑھنے پر اس عام دھشت سے کوئی سروکار نہ تھا ، الٹا اور اسی کی مسلسل ترقی پر انھوں نے اپنی امیدیں لگا دیں ۔ پرولتاری جتنے زیادہ ھوں گے ، انقلابی طبقے کی حیثیت سے ان کی طاقت بھی اتنی ھی زیادہ ھوگی اور سوشلزم اتناھی نزدیک اور قابل‌حصول ھوجائےگا ۔ مارکس اور اینگلس نے محنت‌کش طبقے کی جو خدمات انجام دی ھیں انھیں گنے چنے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ھے : مزدور طبقے کو انھوں نے خودشناسی اور خودآگاھی سکھائی ، خواب‌وخیال کی جگہ علم‌وتحقیق کا پایہ رکھ دیا ۔

اس لئے ضروری ھے کہ اینگلس کا نام اور زندگی کے حالات کا علم ھر ایک مزدور تک پہنچے ۔

اسی لئے مضامین کے اس مجموعے میں ، جس کا مقصد ، ھماری اور تمام مطبوعات کی طرح ، روسی مزدوروں میں طبقاتی شعور بیدار کرنا ھے ، ھمیں فریڈرک اینگلس کی زندگی اور کارنامے کا ایک خاکہ دینا چاھئے جو موجودہ پرولتاریہ کے دو عظیم رھنماؤں میں سے ایک تھا ۔

اینگلس ۱۸۲۰ ء میں پروشیا سلطنت کے صوبہ رائن کے شہر بارمن مقام پر پیدا ھوا ۔ اس کے باپ کارخانہ‌دار تھے ۔ ۱۸۳۸ ء میں گھر کے حالات سے مجبور ھو کر بیٹے نے ھائی اسکول کی تعلیم چھوڑی اور بریمن کے ایک تجارتی دفتر میں کلرکی اختیار کرلی ۔ بیوپاری مصروفیتوں کے باوجود اینگلس نے اپنی علمی اور سیاسی تعلیم کی لگن باقی رکھی ۔ ھائی سکول کے زمانے سے ھی اسے بادشاھی اور سرکاری اھل‌کاروں کے ظلم زبردستی سے سخت نفرت ھوگئی تھی ۔ فلسفہ پڑھا

تو یہ نفرت اور منجھ گئی۔ ان دنوں جرمن فلسفے پر ہیگل کا رنگ چڑھا ہوا تھا اور اینگلس بھی اس کی لپیٹ میں آ گیا۔ اگرچہ ہیگل بذات خود پروشیا کی شخصی حکومت کا مداح تھا، اور برلن یونیورسٹی میں فلسفے کا پروفیسر ہونے کی حیثیت سے اسی حکومت کا نمک خوار بھی رہاتھا، تاہم اس کی تعلیمات انقلابی تھیں۔ ہیگل کو انسانی عقل اور اس کے حقوق پر جو ایمان تھا، ہیگل کے فلسفے کا جو بنیادی نکتہ تھا کہ تمام کائنات کے رگ و پے میں تغیر، تبدیلی اور ارتقا جاری وساری ہے، اس کی بدولت جرمن فلسفی کے بعض شاگردوں نے، جو موجودہ صورت‌حال کو برحق ماننے کے لئے تیار نہ تھے، یہ خیال اپنا لیا کہ اس صورت‌حال کے خلاف قدم بڑھانا، جو ظلم‌وجبر پھیلا ہوا ہے، اس کے سامنے سر اٹھانا بھی اسی ہمہ گیر اصول کی جڑبنیاد میں شامل ہے کہ ہمیشہ ہمیش تغیر اور ارتقا ہوتا رہے۔ اگر ہر چیز کچھ سے کچھ ہوتی جاتی ہے، اگر ایک قسم کے ادارے یا ڈھانچ ٹوٹتے ہیں اور دوسرے ان کی جگہ لے لیتے ہیں تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ پروشیائی بادشاہ سلامت یا زار روس کی فرماں روائی، یا لوگوں کی بہت بڑی تعداد کے نقصان سے برائے نام تھوڑے سے لوگوں کی دولت‌مندی یا عام لوگوں پر سرمایہ‌دار طبقے کا غلبہ ایسے ہی (بے تبدیلی کے) ہمیشہ چلتا رہے۔ ہیگل کا فلسفہ ذہن اور خیالات کی تبدیلی کی بات کرتا تھا — وہ عینیت‌پرست یا خیال‌پرست تھا۔ ذہن کی تبدیلی سے اس کا مطلب تھا کہ فطرت میں، انسان میں، انسانی اور سماجی تعلقات میں تبدیلی پیدا ہو۔ مارکس اور اینگلس نے ہیگل کے فلسفے میں سے مسلسل تغیروتبدل کا اصول قائم رکھ کر * خیال‌پرستی کے نظریے کا خول اتار ڈالا۔ اصلی زندگی کی طرف رخ کر کے انھوں نے یہ دیکھا کہ ذہنی تبدیلی سے عالم فطرت کی تبدیلی

* مارکس اور اینگلس نے بتایا ہے کہ اپنے ذہنی ارتقا کے سلسلے میں وہ عظیم جرمن فلسفیوں کے اور خاص طور پر ہیگل کے بہت زیادہ مرہون منت ہیں۔ اینگلس کا کہنا ہے ''جرمن فلسفے کے بغیر سائنسی سوشلزم کا کوئی وجود نہ ہوتا۔''

کو نہیں سمجھایا جاسکتا بلکہ اس کے برعکس ذہنی تبدیلی خود عالم فطرت یا مادی تبدیلی سے نکلتی ہے ... فلسفی ہیگل کے اور ہیگل والے خیالات رکھنےوالوں کے برخلاف مارکس اور اینگلس نے مادیت اختیار کی۔ دنیا اور عالم انسانیت کو انھوں نے مادی پہلو سے دیکھ کر یہ نتیجہ نکالا کہ جس طرح فطرت کے مظاہر کی تہہ میں مادی اسباب پوشیدہ ہوتے ہیں اسی طرح انسانی سماج میں جو تغیر و تبدل ہوتے ہیں وہ مادی طاقتوں یعنی پیداواری طاقتوں کی تبدیلیوں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ انسانی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے جن چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے، ان چیزوں کی پیداوار میں آدمی کے آدمی سے جس قسم کے تعلقات بنتے ہیں، جو رشتے قائم ہوتے ہیں، ان رشتوں یا تعلقات کا دارومدار پیداواری طاقتوں کے تغیروتبدل پر ہوتا ہے۔ انھی رشتوں میں سماجی زندگی کے، انسانی آرزوؤں، امنگوں، خیالات اور قوانین کے سارے مظاہر کو سمجھا جاسکتا ہے۔ پیداواری طاقتوں کے بڑھنے سے وہ سماجی تعلقات پیدا ہوئے جن کی بنیاد ذاتی ملکیت پر ہے لیکن اب دیکھئے تو پیداواری طاقتوں کے بڑھنے کی بدولت ہی آبادی کی بڑی اکثریت اپنی ملکیت سے محروم کر دی گئی اور تھوڑے سے لوگوں کے قبضہ قدرت میں یہ ملکیت سمٹتی چلی گئی۔ یہ ارتقا جائداد اور ملکیت کا، جو آج کے سماجی نظام کی اصل بنیاد ہے، خاتمہ کر رہاہےاور خود اسی مقصد کی طرف قدم بڑھارہاہے جو اشتراکیوں نے اپنے پیش نظر رکھا ہے۔ اشتراکیوں کو صرف اتنا ہی کرنا ہے کہ اس سماجی طاقت کا پتہ لگائیں جو، موجودہ سماج میں اپنی حیثیت کے کارن، اشتراکیت کے لانے میں غرضمند ہو اور پھر اس سماجی طاقت کو خود اس کے مفاد اور تاریخی عمل سے باخبر کریں۔ یہ سماجی طاقت پرولتاریہ ہے۔ اینگلس نے اسی پرولتاریہ سے انگلینڈ میں، انگریزی صنعت کے مرکز مانچسٹر میں آگاھی حاصل کی جہاں ۱۸۴۲ء میں وہ رہنے لگا تھا، اور ایک ایسی تجارتی کمپنی میں نوکری کر رہا تھا جس میں اینگلس کا باپ بھی حصہ‌دار تھا۔ مانچسٹر میں اینگلس کارخانے میں ہی نہیں بیٹھا رہا بلکہ ان گندی بستیوں میں بھی مارا مارا پھرتا تھا جہاں مزدور لبالب بھرے تھے،

ان کی غریبی اور تباہ حالی اپنی آنکھوں سے دیکھی۔ اس نے صرف ذاتی مشاهدوں پر بس نہیں کی۔ برطانیہ کے مزدور طبقے کے حالات پر پہلے سے جو کچھ لکھا جاچکا تھا ، اینگلس نے اس کا بھی مطالعہ کیا اور جتنی سرکاری دستاویزوں تک وہ پہنچ سکتا تھا سب اس نے نہایت غور کے ساتھ پڑھ ڈالیں۔ ان تمام مطالعوں اور مشاهدوں کا حاصل تھی وہ کتاب جو ۱۸۴۵ ء میں شائع ہوئی : ” انگلستان میں مزدور طبقے کی حالت ،،۔ هم پہلے ذکر کر چکے هیں که اس کتاب کے تحریر کرنے میں اینگلس نے کیا اهم خدمت انجام دی هے۔ اینگلس سے پہلے بھی بہت لوگوں نے پرولتاریہ کے مصائب بیان کئے تھے اور اس طبقے کی حالت سدھارنے کی ضرورت پر توجه دلائی تھی۔ لیکن اینگلس وہ پہلا شخص هے جس نے کہا که پرولتاریه ایک مصیبت‌زدہ طبقه هی نہیں ، بلکه حقیقت میں اس طبقے کی شرمناک معاشی حالت هی اسے آمادہ کرکے آگے بڑھاتی هے اور مجبور کرتی هے که بالآخر وہ اپنا بوجھ اتارنے کے لئے میدان میں اترے۔ پرولتاریه میدان میں اترا تو آپ اپنی مدد کر لیتا هے۔ مزدور طبقے کی سیاسی تحریک بہرحال مزدوروں پر یہ روشن کر دےگی که ان کی نجات کا ایک هی راسته هے اور وہ هے سوشلزم میں۔ دوسری طرف سوشلزم تبھی طاقت بنےگا جب وہ مزدور طبقے کی سیاسی جدوجہد کی منزل قرار پائے۔ انگلینڈ کے محنت کشوں کی حالت پر اینگلس کی کتاب میں اس قسم کے خیالات تھے ، وہ خیالات جنھیں آج کے زمانے میں تمام سوچنےوالے اور مقابله کرنےوالے پرولتاریه نے اپنا لیا هے ، لیکن جب وہ پہلی بار پیش کئے گئے تو بالکل نئے یا اجنبی تھے۔ یه خیالات اس کتاب میں منظرعام پر لائے گئے جو نہایت دل‌نشیں انداز میں لکھی گئی تھی اور جس میں انگریزی پرولتاریه کی تباہ حالی کی بھر پور مستند اور هیبت‌ناک تصویر کھینچی گئی تھی۔ یه کتاب سرمایه‌داری اور سرمایه‌داروں (بورژوازی) کے منه پر طمانچه ثابت هوئی اور گہرا اثر چھوڑ گئی۔ موجودہ زمانے میں پرولتاریه کے حالات کی صحیح تصویر کشی کے لئے جا بجا اسی کتاب کے حوالے دئے جانے لگے۔ سچ پوچھئے تو مزدور طبقے کی تباہ حالی کی ایسی سچی اور بےلاگ

تصویر نہ ۱۸۴۵ء سے پہلے کبھی کھینچی گئی تھی نہ اس کے بعد کھینچی گئی۔

انگلستان پہنچنے کے بعد اینگلس سوشلسٹ ہو گیا۔ مانچسٹر میں اس نے ان لوگوں سے تعلقات پیدا کئے جو اپنے وقت میں انگریزوں کی مزدور تحریک میں سرگرم تھے اور انگریزی کے اشتراکی اخبارات‌ورسائل کے لئے لکھنا شروع کر دیا۔ ۱۸۴۴ء میں جب وہ جرمنی واپس جا رہاتھا تو پیرس میں مارکس سے ملاقات ہوئی۔ ملاقات سے پہلے ہی دونوں میں خطوکتابت رہ چکی تھی۔ پیرس میں کارل مارکس بھی فرانسیسی اشتراکیوں اور فرانس کی زندگی کے زیراثر سوشلسٹ ہوچکا تھا۔ یہاں ان دونوں دوستوں نےمل کر ایک کتاب تصنیف کی جس کا عنوان تھا: ''مقدس خاندان یا تنقیدی تنقید کی تنقید''۔ یہ کتاب اینگلس کی ''انگلستان میں مزدور طبقے کی حالت'' نکلنے سے ایک سال پہلے ہی چھپ کر آ گئی۔ اس کا بیشتر حصہ مارکس نے لکھا تھا اور اس میں انقلابی مادی اشتراکیت کی بنیادیں موجود تھیں، جن کے اصل خیالات ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ ''مقدس خاندان'' کا لفظ باؤیر نام کے جرمن فلسفی بھائیوں اور ان کے ماننےوالوں پر ایک پھبتی کے طور سے استعمال کیا گیا تھا۔ یہ حضرات ایسی تنقید کا پرچار کرتے تھے جسے نہ حقیقت سے کوئی سروکار تھا، نہ پارٹیوں اور سیاست سے، اور نہ اسے عملی سرگرمی گوارا تھی۔ اسے تو گردوپیش کی دنیا پر اور جو واقعات دنیا میں گزرتے تھے، ان پر صرف ''تنقیدی'' نظر ڈالنے سے غرض تھی۔ باؤیر صاحبان کی نظر میں پرولتاریہ ایک بےوقعت انبوہ تھا، تنقید سے کورا۔ مارکس اور اینگلس نے اس بےہودہ اور نقصان‌دہ رجحان کی زبردست مخالفت کی۔ ایک جیتے جاگتے انسانی وجود کے لئے، جو مزدور ہے، اور حکمراں طبقوں اور سرکار کے بوجھ تلے پس رہا ہے، انھوں نے قیاس‌آرائی کا نہیں، بلکہ ایسی جدوجہد کا مطالبہ کیا جو بہتر نظام زندگی کے لئے کی جائے۔ ظاہر ہے کہ ان کی نظر میں پرولتاریہ ہی وہ طاقت تھی جو ایسی جدوجہد چلانے کی اہلیت رکھتی تھی اور اس کی غرضمند بھی تھی۔ ابھی یہ کتاب ''مقدس خاندان'' نکلی نہ تھی کہ فریڈرک

اینگلس نے مارکس اور روگے کے مجموعۂ مضامین «Deutsch-Französische Jahrbücher» میں اپنے تفصیلی ''سیاسی معاشیات کے تنقیدی مضامین،، شائع کر دئے تھے اور ان میں اشتراکی نقطۂ نظر سے موجودہ معاشی نظام کے اصل مظاہر پر بحث کرتے ہوئے یہ بتایا گیا تھا کہ ذاتی ملکیت کی حکمرانی سے یہی لازمی نتیجے نکلنےوالے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مارکس نے جو یہ فیصلہ کیا کہ سیاسی معاشیات کا، اس علم کا مطالعہ کیا جائے جس میں آگے چل کر اس کی تحریروں نے بنیادی انقلاب برپا کر دیا، اس فیصلے میں اینگلس سے ربط ضبط پیدا ہونے کا بڑا ہاتھ ہے۔

۱۸۴۵ء سے ۱۸۴۷ء تک اینگلس بروسلز اور پیرس میں رہا۔ علمی کام کے ساتھ ساتھ اس نے بروسلز اور پیرس میں جرمن مزدوروں کے درمیان عملی سرگرمی بھی جاری رکھی۔ یہاں مارکس اور اینگلس نے خفیہ جرمن ''کمیونسٹ لیگ،، سے ربط قائم کیا اور اس کی طرف سے یہ ذمہ‌داری سنبھالی کہ سوشلزم کے جن خاص اصولوں پر جم کر کام کیا ہے، انھیں تفصیل کے ساتھ پیش کریں۔ چناں‌چہ مارکس اور اینگلس کا لکھا ہوا وہ مشہور ''کمیونسٹ پارٹی کا مینی‌فسٹو،، تیار ہوا جو ۱۸۴۸ء میں شائع کردیا گیا۔ یہ کتابچہ کئی جلدوں کی کتاب کا درجہ رکھتا ہے، جو روح اس میں سمائی ہے وہ آج بھی متمدن دنیا کے تمام منظم اور مقابلہ کرتے ہوئے پرولتاریہ کو حوصلہ عطا کررہی ہے اور اسے راہ دکھا رہی ہے۔

۱۸۴۸ء کا انقلاب جو پہلے فرانس میں پھوٹ پڑا اور پھر مغربی یورپ کے دوسرے ملکوں میں، مارکس اور اینگلس کو ان کے وطن (جرمنی) میں واپس لے گیا۔ یہاں پہنچ کر انھوں نے پروشیا کے رائن‌والے صوبے میں جمہوری اخبار «Neue Rheinische Zeitung» کا چارج لے لیا جو کولون شہر سے شائع ہوا کرتا تھا۔ یہ دونوں دوست رائنی پروشیا کی تمام انقلابی جمہوری امنگوں کے روح رواں بن گئے۔ انھوں نے آزادی کی حمایت میں اور رجعت‌پرستی کی طاقتوں کے مقابلے پر عوام کے حق میں ایک ایک قدم پر جم کر جنگ لڑی لیکن جیسا کہ ہمیں

معلوم ہے رجعت‌پرستی جیت گئی۔ یہ اخبار «Neue Rheinische Zeitung» کچل کر ختم کر دیا گیا۔ مارکس اپنی جلاوطنی کے زمانے میں پروشیائی شہریت سے محروم ہو چکا تھا، اب اسے وہاں سے بدیسی کی طرح نکال دیا گیا۔ اینگلس مسلح عوامی بغاوت میں شریک ہو گیا، تین جنگوں میں آزادی کے لئے لڑا اور جب باغیوں کو شکست ہوئی تو وہ پسپا ہو کر سوئٹزرلینڈ کے راستے لندن کی طرف نکل گیا۔

مارکس نے بھی لندن میں ڈیرا ڈال دیا تھا۔ اینگلس نے وہاں پہنچ کر پھر کلرکی اختیار کرلی اور کچھ دنوں بعد مانچسٹر کی اسی کمپنی کا حصہ‌دار بن گیا جس میں ۱۸۴۰ء کے بعدوالے برسوں میں نوکری کر چکا تھا۔ ۱۸۷۰ء تک وہ مانچسٹر میں ہی رہا اور اس عرصے میں مارکس نے لندن میں رہائش رکھی۔ اس فاصلے نے ان دونوں کے تازہ‌بہ‌تازہ تبادلۂ خیالات میں کوئی رخنہ نہیں ڈالا۔ قریب قریب روزانہ خط آتے جاتے تھے۔ خط و کتابت کے ذریعے دونوں دوستوں نے اپنے خیالات اور اپنی تحقیقات کو ایک دوسرے تک پہنچایا اور علمی سوشلزم کا خاکہ تیار کرنے میں باہم ہاتھ بٹاتے رہے۔ ۱۸۷۰ء میں اینگلس لندن چلا آیا۔ ان دونوں کی ذہنی زندگی، انتہائی شدومد کے ساتھ اس وقت تک باہمی رفاقت سے چلتی رہی جب تک ۱۸۸۳ء میں کارل مارکس کا انتقال نہیں ہو گیا۔ اس کا ثمرہ یہ تھا کہ مارکس نے ''سرمایہ'' لکھا جو ہمارے زمانے میں سیاسی معاشیات کی سب سے زبردست تصنیف ہے اور اینگلس نے چھوٹی اور بڑی کئی تصانیف پیش کر دیں۔ سرمایہ‌دارانہ معیشت کے جو پیچ درپیچ مظاہر ہوتے ہیں، ان کے تجزیے پر مارکس نے کام کیا۔ اینگلس نے اپنی سادہ اور سلیس تحریروں میں، جن میں اکثر جوابی استدلال سے کام لیا گیا ہے، عام علمی مسائل سے بحث کی اور تاریخ کے مادی نظرئیے سے اور مارکس کے معاشی نظرئیے کی روشنی میں ماضی اور حال کے مختلف مظاہروواقعات سے بحث کی۔ اینگلس کی ان تحریروں میں سے ہم فی‌الحال یہ نام لیں گے: جرمن فلسفی ڈیورنگ سے مناظرہ (یہ کتاب فلسفے، قدرتی سائنس اور سماجی علوم کے دائرے میں آنےوالے انتہائی اہم مسائل کا تجزیہ کرتی

ہے) * ، ”خاندان، ذاتی ملکیت اور ریاست کا آغاز“، (جو روسی زبان میں ترجمہ ہو چکی ہے اور سینٹ پیٹرسبرگ سے اس کا تیسرا ایڈیشن ۱۸۹۰ء میں نکل چکا ہے)، ”لوڈوگ فائرباخ“، (اس کا روسی ترجمہ پلیخانوف کی تشریحات کے ساتھ جنیوا سے ۱۸۹۲ء میں شائع ہوا ہے)، روسی حکومت کی خارجہ پالیسی پر مضمون (یہ مضمون جنیوا سے ”سوشل ڈیموکریٹ“، رسالے کے پہلے اور دوسرے شمارے میں بزبان روسی ترجمہ ہوکر چھپا)، رہائشی مسئلے پر شاندار مضامین، اور آخر میں دو مختصر مگر نہایت قیمتی مضمون جو روس کی معاشی اٹھان پر لکھے گئے ہیں۔ (یہ دونوں مضمون زاسولیچ کے روسی ترجمے کی صورت میں بہ عنوان ”روس کی بابت فریڈرک اینگلس“، جنیوا سے ۱۸۹۴ء میں چھپے)۔ سرمائے پر اپنی زبردست تصنیف کو تمام کرنے سے پہلے ہی کارل مارکس کا انتقال ہو گیا۔ صرف اس کا خاکہ مکمل ہو چکا تھا اور جب مارکس دنیا سے اٹھ گیا تو اینگلس نے اس عظیم‌الشان کام کی تکمیل کا اہتمام کیا کہ ”سرمایہ“، کتاب کی دوسری اور تیسری جلد ترتیب دے کر شائع ہو جائے۔ ۱۸۸۵ء میں اس نے دوسری جلد اور ۱۸۹۴ء میں تیسری جلد شائع کر دی (اینگلس کی موت نے چوتھی جلد کی تیاری اور تکمیل نہ ہونے دی)۔ دوسری اور تیسری جلد کی ترتیب‌وتکمیل میں بےانتہا محنت کرنی پڑی۔ آسٹریا کے سوشل ڈیموکریٹ اڈلر کا یہ کہنا بجا ہے کہ ”سرمایہ“، کی دوسری اور تیسری جلد شائع کرکے اینگلس نے اس زبردست عالی دماغ کی ایک عظیم‌الشان یادگار قائم کر دی، جو اس کا دوست رہا تھا، بلکہ ایک ایسی یادگار قائم کی جس پر، انجانے میں، خود اینگلس کا نام نامی بھی نقش ہوگیا ہے۔ حق بات یہ ہے کہ ”سرمایہ“، کی یہ دونوں جلدیں دو آدمیوں — مارکس اور

---

* یہ بہت ہی کارآمد اور معلومات سے مالامال کتاب ہے۔ بدقسمتی سے اس کا صرف ایک حصہ جس میں سوشلزم کے ارتقا کا تاریخی خاکہ پیش کیا گیا ہے، روسی میں ترجمہ ہوا ہے (”سائنسی سوشلزم کا ارتقا“، دوسرا ایڈیشن، جنیوا، ۱۸۹۲ء)۔

اینگلس کا مشترکہ کارنامہ ہیں۔ داستانوں میں دوستی یا ہمدمی کی بعض ایسی مثالیں آئی ہیں جو دل ہلا دیتی ہیں۔ یورپی پرولتاریہ دعوا کر سکتا ہے کہ اس کا علم دو ایسے عالموں اور جاں‌بازوں کی دین ہے جن کی باہمی رفاقت، دوستی کے تمام پرانے قصے کہانیوں میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ اینگلس نے ہر جگہ خود کو مارکس کے بعد دوسرے نمبر پر شمار کیا ہے اور عام طور سے وہ حق بجانب ہے۔ اس نے اپنے ایک دوست کو لکھا "مارکس کے جیتے جی میں ہمیشہ اس کے بازو پر رہا"۔ مارکس کی زندگی میں جو محبت اینگلس نے دی اور مرنے کے بعد جو تعظیم دی اس کی کوئی انتہا نہیں۔ اس بےباک جواں مرد اور محتاط مفکر کے وجود میں ایک بےپناہ محبت کرنےوالی روح تھی۔

۱۸۴۸ — ۴۹ ء کی تحریک کے بعدوالے زمانے میں جلاوطن رہ کر مارکس اور اینگلس نے خود کو صرف علمی دیدہ ریزی تک محدود نہیں رکھا۔ ۱۸۶۴ ء میں مارکس نے "محنت کرنےوالوں کی انٹرنیشنل ایسوسی‌ایشن"، بنائی اور پورے دس برس تک اسے چلاتا رہا۔ اینگلس نے بھی اس کے کاموں میں عملی حصہ لیا۔ "انٹرنیشنل ایسوسی‌ایشن"، جو مارکس کے خیالات کے مطابق تمام ملکوں کے پرولتاریہ میں اتحاد کی علمبردار تھی، اس کی خدمات محنت‌کش طبقے کی تحریک کو بڑھانے میں زبردست اہمیت رکھتی ہیں۔ جب ۱۸۷۰ ء کے بعدوالے برسوں میں یہ ایسوسی‌ایشن بند کردی گئی، تب بھی مارکس اور اینگلس نے اپنے ربط ملانےوالے رول کو نہیں چھوڑا۔ بلکہ اس کے برخلاف یہ کہنا چاہئے کہ مزدور طبقے کی تحریک کے روحانی رہنماؤں کی حیثیت سے ان کی اہمیت برابر بڑھتی ہی گئی کیوں‌کہ خود یہ تحریک بھی لگاتار آگے بڑھتی رہی۔ مارکس کے مرنے کے بعد اکیلا اینگلس ہی یورپی اشتراکیوں کے صلاح‌کار اور رہنما کی حیثیت سے کام چلاتا رہا۔ جرمن اشتراکی جن کی طاقت گورنمنٹ کے ظلم اور زیادتی کے باوجود تیزی سے اور ایک جماؤ کے ساتھ آگے جاری تھی اور پس‌ماندہ ملکوں مثلاً اسپین، رومانیہ اور روس کے نمائندے جنھیں اگلاقدم اٹھانے سے پہلے کافی سوچ بچار اور ناپ‌تول کرنی پڑتی تھی،

ان سب کو یکساں طور پر اینگلس کے مشورے اور ہدایت کی ضرورت پیش آتی تھی۔ بڑھاپے میں اینگلس کے علم اور تجربے کا بھرپور خزانہ ان سب کے کام آتا تھا۔

مارکس اور اینگلس دونوں روسی زبان جانتے تھے، روسی کتابیں پڑھتے تھے۔ اس ملک سے دلچسپی برقرار رکھتے تھے، روسی انقلابی تحریک پر ہمدردی کی نظر رکھتے تھے اور روس کے انقلابیوں سے ان کا ربط ضبط رہتا تھا۔ وہ اول جمہوریت‌پسند تھے، پھر اشتراکی ہوئے اور سیاسی جبر اور من‌مانی کے نظام سے نفرت کا جمہوری جذبہ ان میں ہمیشہ بہت سخت رہا۔ یہ سیدھا سیاسی جذبہ، پھر گہرا نظریاتی علم اس بات کا کہ سیاسی جبر اور من‌مانی کارروائی کا معاشی لوٹ سے تعلق ہے، اوپر سے زندگی کا پکا تجربہ، ان سب باتوں نے مارکس اور اینگلس کو سیاسی طور سے غیرمعمولی حساس بنا دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب مٹھی بھر انقلابی روسیوں نے شہنشاہ روس کی زبردست حکومت کے مقابلے پر جاں‌بازانہ جدوجہد چھیڑی تو ان دونوں آزمودہ‌کار انقلابیوں کے سینے اس کی ہمدردی سے گونجنے لگے۔ اور یہ رجحان کہ روسی اشتراکیوں کا جو فوری اور نہایت اہم فریضہ ہے کہ سیاسی آزادی چھین کر حاصل کی جائے، اس فریضے سے صرف دکھاوے کے معاشی فائدوں کی خاطر منہ موڑ لیا جائے اس رجحان کو مارکس اور اینگلس نے شک و شبہ کی نظر سے دیکھا، یہاں تک کہ اسے انھوں نے سماجی انقلاب سے کھلم کھلا غداری قرار دے دیا۔ ان دونوں کی مستقل ہدایت تھی کہ ''مزدوروں کے سر کا بوجھ اترنا خود مزدور طبقے کے عمل سے ہونا چاہئے''۔ لیکن اپنی معاشی نجات کی خاطر صف‌آرائی کرنے کے لئے پرولتاریہ کو کچھ سیاسی حق حاصل کرنے ضروری ہیں۔ مزید یہ کہ مارکس اور اینگلس نے صاف دیکھ لیا کہ روس میں سیاسی انقلاب برپا ہونا مغربی یورپ کے مزدور طبقے کی تحریک کے لئے بے انتہا کارگر ثابت ہوگا۔ شخصی بادشاہی کا روس ہمیشہ سے یورپی رجعت‌پرستی کی آماجگاہ رہا ہے۔ ۱۸۷۰ء کی جنگ کے نتیجے میں، جو ایک زمانے تک جرمنی اور فرانس کے درمیان نفرت کے بیج بوگئی، روس کو ایسی غیرمعمولی اور مفید مطلب

بین اقوامی پوزیشن ہاتھ آئی کہ اس کی بدولت ، بہرحال روسی زارشاہی کی کمان چڑھ گئی اور رجعت پرستانہ طاقت کی حیثیت سے اس نے اور زیادہ اہمیت اختیار کر لی۔ صرف آزاد روس ، ایسا روس جسے پولینڈ ، فن لینڈ ، جرمنی ، آرمینیاوالوں کو اور دوسری چھوٹی چھوٹی قوموں کو دبائے رکھنے کی ضرورت نہ ہو ، جو برابر اس تاک میں نہ لگا رہے کہ جرمنی اور فرانس ایک دوسرے سے ٹکر لیں ، وہی روس موجودہ یورپ کو ، جو جنگ کے بوجھ سے ہلکا ہو چکا ہو ، امن چین کے سانس لینے میں مددگار ثابت ہوگا ، وہی روس یورپ میں رجعت پرستی کے تمام عناصر کو کمزور کرےگا ، یورپ کے مزدور طبقے کو مضبوطی دےگا۔ اسی غرض سے اینگلس نے روس میں سیاسی آزادی قائم کرنے پر پورا زور دیا کہ اس کی بدولت مغرب میں مزدور طبقے کی تحریک کو بھی بڑھاوا ملےگا۔ وہ کیا سدھارا کہ روسی انقلابیوں کا بہترین دوست دنیا سے اٹھ گیا۔

آئیے ، فریڈرک اینگلس کی یاد میں سر جھکائیں ، وہ جو پرولتاریہ کا استاد اور زبردست جانباز تھا!

۱۸۹۵ ء کی برسات میں لکھا گیا۔
پہلی بار ۱۸۹۶ ء میں ”ربوتنک،، نامی مجموعے کے پہلے اور دوسرے شماروں مین شائع ہوا۔

لینن کا مجموعۂ تصانیف ، پانچواں روسی ایڈیشن ، جلد ۲ ، صفحات ۱۴ — ۵

لینن

مارکس‌ازم کے تین سرچشمے اور تین اجزائے ترکیبی

تمام متمدن دنیا میں مارکس کی تعلیمات سے بورژوا علم (سرکاری بھی اور اعتدال‌پسند بھی) بھڑکتا ہے اور سخت عداوت رکھتا ہے۔ اس کی نظر میں مارکس‌ازم کیا ہے، ایک "مہلک فرقہ"۔ اس کے سوا اور کسی قسم کے سلوک کی امید بھی نہیں کی جا سکتی کیونکہ ایسے سماج میں جس کی بنا طبقاتی جدوجہد پر ہو، "غیرجانبدار" سماجی سائنس کا پایا جانا ممکن نہیں ہے۔ تمام سرکاری اور اعتدال پسند سائنس کسی نہ کسی طرح سے اجرتی غلامی کی وکالت کرتی ہے۔ لیکن مارکس‌ازم نے تو اس غلامی کے خلاف بےرحم جنگ چھیڑ رکھی ہے۔ اجرتی غلامی کے سماج میں سائنس سے یہ آس رکھنا کہ وہ غیرجانب‌داری برتے گی، بالکل ایسی ہی نادانی ہے جیسے کارخانہ‌دار سے اس سوال پر غیرجانب‌داری کی امید رکھنا کہ سرمائے کا منافع کم کر کے مزدوروں کی اجرت بڑھا دی جائے۔

مگر بات صرف اسی قدر نہیں ہے۔ فلسفے کی تاریخ اور سماجی سائنس کی تاریخ نہایت وضاحت کے ساتھ یہ جتاتی ہے کہ مارکس‌ازم میں "تنگ نظری" قسم کی کوئی چیز دور دور موجود نہیں ہے، اس معنی میں کہ وہ کوئی بندھا ٹکا اور جامد نظریہ ہو، ایسا نظریہ جو دنیا کے تمدن کے ارتقا کی شاہراہ سے الگ تھلگ ابھرا ہو۔ اس کے برعکس مارکس کی بصیرت خاص طور پر اس حقیقت میں پوشیدہ ہے

کہ انہوں نے ان سوالوں کا جواب تیار کیا جو عالم انسانیت کے سب سے ممتاز دماغوں کی جانب سے اٹھائے گئے تھے۔ مارکس کی تعلیمات فلسفے، سیاسی معاشیات (پولٹکل اکانومی) اور اشترا کیت (سوشلزم) کے سب سے بڑے نمائندوں کی تعلیمات کا براہ‌راست اور فوری تسلسل ھیں۔

مارکس کا نظریہ طاقتور ھے کیونکہ وہ سچا ھے۔ یہ نظریہ مکمل اور مربوط ھے اور لوگوں کو ایک ایسا باضابطہ عالمی تصور مہیا کرتا ھے جو وهم‌پرستی، رجعت‌پرستی اور بورژوا زورزبردستی کی حمایت کی کسی شکل سے بھی میل نہیں کھا سکتا۔ یہ نظریہ جائز وارث ھے ان بہترین خیالات کا جو بنی نوع انسان نے انیسویں صدی میں تخلیق کئے تھے جرمن فلسفے، انگریزی سیاسی معاشیات اور فرانسیسی اشتراکیت کی صورت میں۔

مارکس‌ازم کے ان تین سرچشموں اور اس کے تینوں اجزائے ترکیبی کے بارے میں ہم مختصر طور پر کچھ کہیں گے۔

۱

مارکس‌ازم کا فلسفہ مادیت ھے۔ یورپ کی جدید تاریخ کے تمام دور میں اور خاص طور سے اٹھارھویں صدی کے آخر میں فرانس میں، جہاں قرون‌وسطی کی ہر قسم کی خرافات کے خلاف، اداروں اور خیالات میں جاگیرداری کے خلاف فیصلہ‌کن جنگ ہوئی، مادیت نے ثابت کر دیا کہ یہی ایک ایسا فلسفہ ھے جو مربوط اور بااصول ھے، جو طبعی سائنس کی تمام تعلیمات سے مطابقت رکھتا ھے اور وهم‌پرستی اور ریاکاری وغیرہ کا مخالف ھے۔ چنانچہ جمہوریت کے دشمنوں نے اپنا سارا زور اس پر صرف کر دیا کہ مادیت کی "تردید کریں"، اس کی جڑ کھود ڈالیں اور اسے بدنام کر دیں۔ انہوں نے فلسفیانہ عینیت (idealism) کی مختلف شکلوں کی حمایت کی جو ہمیشہ کسی نہ کسی صورت میں مذہب کی تبلیغ یا اس کی تائید کو پہنچتی ھیں۔

مارکس اور اینگلس نے نہایت ثابت‌قدمی کے ساتھ فلسفیانہ مادیت کی مدافعت کی اور اس بنیاد سے ہر انحراف اور گریز میں

پوشیدہ سنگین غلط‌کاری کی بار بار وضاحت کی۔ مارکس اور اینگلس کے خیالات نہایت وضاحت کے ساتھ پورے طور پر اینگلس کی تصنیفات ”لڈوگ فائرباخ“ اور ”اینٹی ڈیورنگ“ میں موجود ہیں اور یہ دونوں کتابیں ”کمیونسٹ پارٹی کا مینی‌فسٹو“ کی طرح ہر ایک طبقاتی شعور رکھنےوالے مزدور کے دم کے ساتھ ہیں۔

لیکن مارکس نے اٹھارھویں صدی کی مادیت پر بس نہیں کی۔ انہوں نے فلسفے کو آگے بڑھایا۔ انہوں نے فلسفے کو جرمن کلاسیکی فلسفے کی دریافتوں، خاص کر ہیگل کے نظام فکر سے مالامال کیا جس نے خود فائرباخ کے نظریہ مادیت کو جنم دیا تھا۔ ان دریافتوں کی سب سے بڑی چیز ہے جدلیات یعنی ارتقا اور نشو و نما کا نظریہ نہایت مکمل اور سب سے گہری شکل میں، جو یک طرفہ‌پن سے پاک ہے، اس انسانی علم و آگاھی کی نسبت کا نظریہ جو ہمیشہ نشوونما پاتے ہوئے مادے کی عکسی کرتی ہے۔ باوجودیکہ بورژوا فلسفیوں کی تعلیمات ”نئی“ تراش خراش کے ساتھ پرانی اور فرسودہ عینیت کی طرف جاتی ہیں طبعی سائنس کی تازہ دریافتوں نے — ریڈیم، الیکٹرون اور اجزا کے قلب ماہیت نے مارکس کی جدلیاتی مادیت کی بہت نمایاں طور پر تصدیق کردی ہے۔

مارکس نے فلسفیانہ مادیت کو گہرائی اور نشو و نما بخشتے ہوئے مکمل کیا اور فطرت کے متعلق اس کی معلومات کو انسانی سماج کے علم تک پھیلا دیا۔ مارکس کی تاریخی مادیت سائنسی فکر کا سب سے بڑا کارنامہ تھا۔ تاریخ اور سیاست کے بارے میں مختلف خیالات کے اندر اس سے پیشتر افراتفری اور یک‌طرفہ فیصلوں کا جو بازار گرم تھا اس کی جگہ نمایاں طور پر ایک سربوط اور ہموار سائنسی نظریہ نے لے لی جو ہمیں بتاتا ہے کہ پیداواری طاقتوں کی نشوونما کے نتیجے میں سماجی زندگی کے ایک ڈھانچے میں سے دوسرا زیادہ ترقی‌یافتہ ڈھانچہ کیونکر ابھرتا ہے۔ مثال کے طور پر کیونکر جاگیرداری میں سے سرمایہ‌داری نمودار ہوتی ہے۔

ٹھیک اسی طرح، جیسے انسان کا علم عالم‌فطرت (دوسرے لفظوں میں آگے بڑھتے ہوئے مادے) کا عکس ہے جو کہ انسان سے

بے نیاز خود اپنا وجود رکھتا ہے، اسی طرح انسان کا سماجی علم (یعنی مختلف خیالات اور فلسفیانہ، مذہبی، سیاسی نظریے وغیرہ) سماج کے اقتصادی نظام کا عکس ہے۔ سیاسی ادارے اقتصادی بنیاد پر اوپر کے ڈھانچے ہیں۔ مثلاً ہم دیکھ سکتے ہیں کہ موجودہ یورپی ریاستوں کی مختلف سیاسی شکلیں یہ خدمت انجام دیتی ہیں کہ پرولتاریہ پر بورژوازی کی حکمرانی کی قلعہ‌بندی کریں۔

مارکس کا فلسفہ مکمل فلسفیانہ مادیت ہے جس نے بنی نوع انسان کو اور خاص کر مزدور طبقے کو علم و خبر کا طاقت‌ور آلہ عطا کیا ہے۔

۲

یہ تسلیم کرلینے کے بعد کہ معاشی نظام ہی وہ بنیاد ہے جس پر سیاسی عمارت کی اٹھان ہوتی ہے، مارکس نے اپنی بیشتر توجہ اس معاشی نظام کے مطالعے پر لگادی۔ مارکس کی خاص تصنیف ''سرمایہ''، موجودہ یعنی سرمایہ‌دار سماج کے معاشی نظام کے مطالعے کا حاصل پیش کرتی ہے۔

کلاسیکی سیاسی معاشیات مارکس سے پہلے انگلینڈ میں جو تمام سرمایہ‌دار ملکوں میں سب سے زیادہ ترقی‌یافتہ تھا، تشکیل پا چکی تھی۔ آدم اسمتھ اور ڈیوڈ ریکارڈو نے معاشی نظام میں چھان بین کر کے محنت کے نظریۂ قدر (value) کی بنیاد ڈال دی تھی۔ مارکس نے ان کے کام کو جاری رکھا۔ اس نظریے کو سختی سے ثابت کیا اور تسلسل و ربط کے ساتھ آگے بڑھایا۔ انھوں نے بتایا کہ ہر ایک مال کی قدر کا فیصلہ اس بات سے ہوتا ہے کہ اس مال کی پیداوار پر سماجی اعتبار سے ضروری محنت کا جو وقت لگتا ہے اس کی مقدار کتنی ہے۔

جہاں پر بورژوا ماہرین معاشیات نے وہ تعلق دیکھ لیا جو چیزوں کے درمیان پایا جاتا ہے (ایک مال کا دوسری مال سے تبادلہ) وہاں مارکس نے وہ تعلق دیکھا جو لوگوں کے درمیان ہوتا ہے۔ مالوں کا باہمی تبادلہ اس بندھن کو ظاہر کرتا ہے جو الگ الگ

پیداوار کرنےوالوں میں بازار کے ذریعے قائم ہوتا ہے۔ روپیہ اس بات کی علامت ہے کہ یہ بندھن زیادہ سے زیادہ قریبی ہوتا جا رہا ہے اور الگ الگ پیداوار کرنےوالوں کی ساری معاشی زندگی کو ایک کل میں اس طرح جوڑتا جارہا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے بےتعلق نہیں ہو سکتے۔ سرمایہ اسی بندھن کے اور آگے بڑھ جانے کی علامت ہے : آدمی کی محنت کی قوت ایک مال بن جاتی ہے۔ اجرت پر کام کرنےوالا اپنی محنت کی قوت کو اس کے ہاتھ بیچتا ہے جو زمین کا، کارخانوں کا اور کام کے اوزاروں کا مالک ہے۔ مزدور کام کے دن بھر کا ایک حصہ اس لاگت کے لئے کام کرنے میں لگاتا ہے جو خود اس کے اور گھربار کے خرچ کے لئے ضروری ہے (یہ ہے مزدوری یا اجرت)، جب کہ دن کا دوسرا حصہ وہ بغیر اجرت کے کام کرتا ہے اور سرمایہ‌دار کے لئے قدرزائد (surplus-value) پیدا کرتا ہے، جو نفع کا اصل سرچشمہ، سرمایہ‌دار طبقے کی دولت کا سرچشمہ ہے۔

قدرزائد کا نظریہ مارکس کے معاشی نظریے میں بنیاد کا پتھر ہے۔

مزدور کی محنت سے جو سرمایہ پیدا ہوتا ہے وہ چھوٹے مالکوں کا دیوالہ نکال کر اور بےروزگاروں کی فوج کھڑی کرکے مزدور کو دباتا ہے۔ صنعت میں تو بڑے پیمانے کی پیداوار کی جیت فوراً نظر میں آجاتی ہے لیکن زراعت میں بھی ہمیں یہی مظہر دکھائی دیتا ہے: بڑے پیمانے کی سرمایہ‌دارانہ زراعت کی برتری بڑھتی جاتی ہے، مشینری کا استعمال بڑھتا جاتا ہے، کسانوں کی معیشت نقد سرمائے کے شکنجے میں پھنستی اور نیچے گرتی جاتی ہے اور پس‌ماندہ ٹکنیک کے بوجھ تلے تباہ ہوجاتی ہے۔ زراعت میں چھوٹے پیمانے کی پیداوار کا زوال صنعت سے مختلف شکلیں اختیار کرتا ہے لیکن یہ زوال بہرحال ایسی حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔

چھوٹے پیمانے کی پیداوار کو تباہ کرکے سرمایہ اس راہ پر بڑھتا ہے کہ محنت کی کار گذاری کو بڑھائے اور بڑے سرمایہ‌داروں کی انجمنوں کےلئے اجارہ‌داری کی پوزیشن پیدا کرے۔ خود پیداوار زیادہ سے زیادہ سماجی ہوتی جاتی ہے۔ سیکڑوں، ہزاروں، لاکھوں مزدور ایک باقاعدہ معاشی ترکیب میں ایک دوسرے سے وابستہ ہو

جاتے ہیں ۔ لیکن اس اجتماعی محنت کی پیداوار مٹھی بھر سرمایہ‌داروں کے قبضہ قدرت میں ہوتی ہے ۔ پیداوار کا نراج بڑھتا ہے اور اسی کے ساتھ بحران بھی ، بازاروں کےلئے اندھادھند دوڑ ہوتی ہے اور عام آبادی کی زندگی احتیاج کی شکار ہوجاتی ہے ۔

سرمایہ‌دارانہ نظام ، سرمائے پر مزدوروں کا دارومدار بڑھاتے ہوئے مشترکہ محنت کی زبردست طاقت پیدا کردیتا ہے ۔

مارکس نے سرمایہ‌داری کے ارتقا کا پتہ لگایا کہ وہ بازار کےلئے مال تیار کرنے کی معیشت کے ابتدائی آثار سے ، شروع کے سیدھے سادے تبادلے سے لے کر سب سے اعلی شکل یعنی بڑے پیمانے کی پیداوار تک پھیلی ہوئی ہے ۔

اور تمام سرمایہ‌دار ملکوں کا تجربہ ، وہ نئے ہوں یا پرانے ، مزدوروں کی سال‌بسال بڑھتی ہوئی تعداد کو صاف طور سے اس مارکسی تحقیق کی سچائی دکھا رہا ہے ۔

سرمایہ‌داری تمام دنیا میں فتح حاصل کر چکی ہے لیکن یہ فتح صرف ایک پیش‌خیمہ ہے اس فتح کا جو محنت کو سرمائے پر حاصل ہونی ہے ۔

۳

جب جاگیرداری کا تختہ الٹاجا چکا اور خدا کی زمین پر ”آزاد“ سرمایہ‌دار سماج نمودار ہوا تو ساتھ ہی یہ بات بھی کھل کر سامنے آگئی کہ اس آزادی کا مطلب ہے محنت کشوں کو دبانے اور ان کی محنت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا نیا نظام ۔ بہت سے اشتراکی نظریے بھی فوراً اس ظلم‌وجبر کے عکس اور اس کے خلاف احتجاج کے طور پر ابھرنے لگے ۔ لیکن شروع شروع کا سوشلزم خیالی (یوٹوپیائی) سوشلزم تھا ۔ وہ سرمایہ‌دار سماج کی نکتہ‌چینی کرتا تھا ، اس پر لعنت‌ملامت کرتا تھا ، اس کی بربادی کے خواب دیکھتا تھا ، ایک بہتر نظام کے تصور میں کھو جاتا تھا اور دولت‌مندوں کو قائل کرنے کی سخت کوشش کرتا تھا کہ دوسروں کی محنت سے ناجائز فائدہ اٹھانا غیراخلاقی حرکت ہے ۔

لیکن خیالی سوشلزم کے بس کی بات یہ نہ تھی کہ وہ اصلی راستہ دکھا سکے۔ سرمایہ‌داری میں اجرتی غلامی کا لب‌لباب وضاحت کے ساتھ بیان کرنا، یا سرمایہ‌داری کی نشوونما کے قاعدے قانونوں کو دریافت کرنا یا اس سماجی طاقت کی جانب اشارہ کرنا، جو نئے سماج کی جنم‌داتا بننے کی صلاحیت رکھتی ہے، اس خیالی سوشلزم کے بس سے باہر تھا۔

اسی اثنا میں طوفانی انقلابوں نے، جو یورپ کے اندر ہر جگہ اور خاص‌کر فرانس میں جاگیرداری، کسان غلامی (serfdom) کے ڈھے جانے کے ساتھ برپا ہوئے، زیادہ سے زیادہ وضاحت کے ساتھ جتا دیا کہ طبقوں کی جدوجہد تمام ارتقا کی بنیاد کا اور اسے آگے بڑھانےوالی قوت کا کام کرتی ہے۔

جاگیردار طبقے پر سیاسی آزادی کی ایک بھی فتح ایسی نہ تھی جو سخت مقابلے کے بغیر حاصل ہوئی ہو۔ ایک بھی سرمایہ‌دار ملک ایسا نہ تھا جو کم‌وبیش آزاد اور جمہوری بنیاد پر قائم ہو اور جس کی نشوونما سرمایہ‌دار سماج کے مختلف طبقوں میں موت وحیات کی جنگ کے بغیر ہو گئی ہو۔

مارکس کی گہری بصیرت اس حقیقت میں پوشیدہ ہے کہ سب سے پہلے وہی اس سے نتائج اخذ کر سکے اور ان نتائج کو جو دنیا کی تاریخ سے نکلتے ہیں استقلال اور تسلسل کے ساتھ منطبق کر سکے۔ یہ کلیہ طبقاتی جدوجہد کا نظریہ ہے۔

لوگ ہمیشہ سیاست میں دھوکا دےکر بےوقوف بنائے گئے ہیں اور خود بےوقوفی کا شکار ہوتے رہے ہیں اور اس وقت تک یہی ہوتا رہے گا جب تک کہ وہ یہ پتہ چلانا نہ سیکھ لیں کہ تمام اخلاقی، مذہبی، سیاسی اور سماجی لفاظیوں، اعلانوں اور وعدوں کے پس پردہ کسی نہ کسی طبقے کے مفاد پوشیدہ ہوتے ہیں۔ اصلاحوں اور ترقیوں کے مبلغوں کو پرانے نظام کے حامیوں کی طرف سے ہمیشہ بےوقوف بنایا جائےگا جب تک وہ یہ محسوس نہ کر لیں کہ ہر پرانا ادارہ، چاہے وہ کتنا ہی وحشیانہ اور فرسودہ نظر آتا ہو، لیکن اسے کچھ حکمراں طبقوں کی قوتیں ہی چلاتی رہتی ہیں۔ اور ان طبقوں کی

رکاوٹ کو توڑنے کا صرف ایک هی طریقه هے که همارے گرد جو سماج هے، اسی سماج میں ان قوتوں کا پته لگایا جائے اور انهیں تربیت دیجائے، ان قوتوں کو جدوجهد کےلئے تیار کیا جائے که وه ایک ایسی طاقت بن جائیں جو پرانے کو صاف کر کے نئے کو جنم دینے کے قابل هو ـــ اور اپنی سماجی حیثیت کی بنا پر ان قوتوں کو ایک ایسی طاقت بننا هی پڑیگا۔

مارکس کی فلسفیانه مادیت هی نے پرولتاریه کو اس روحانی غلامی سے نکلنے کا راسته دکھایا جس میں تمام دبے هوئے طبقے اس وقت تک پستے چلے آئے تھے۔ مارکس کا هی معاشی نظریه هے جس نے سرمایهداری کے عام نظام میں پرولتاریه کی صحیح پوزیشن جتائی۔

پرولتاریه کی آزاد سبھائیں ساری دنیا میں امریکه سے جاپان تک، سویڈن سے جنوبی افریقه تک بڑھتی پھیلتی جا رهی هیں۔ پرولتاریه اپنی طبقاتی جدوجهد چلا کر زیاده تعلیم و تربیتیافته اور باخبر هوتا جارها هے، وه بورژوا سماج کے تعصبات کے جالوں سے نکلتا جا رها هے، زیاده سے زیاده متحد هوتا جا رها هے اور سیکھ رها هے که اپنی کامیابیوں کو کیسے ناپے۔ پرولتاریه اپنی قوتوں کو فولادی بنا رها هے اور اس طرح بڑھ رها هے که اسے روکنا ممکن نه هوگا۔

"پروسویشچینیے"، شماره ۳،
مارچ ۱۹۱۳ء

لینن کا مجموعۂ تصانیف،
پانچواں روسی ایڈیشن،
جلد ۲۳، صفحات ۳۸ ـــ ۴۰

کارل مارکس

فائرباخ پر تھی‌سیس[1]

(۱)

آج تک کے تمام مادیت کے فلسفے کی سب سے بڑی کمی (فائرباخ کا فلسفہ بھی اسی میں شامل ھے) یہ رھی ھے کہ کسی شے کو، حقیقت کو، نفسانی خواھش کو محض "آبجکٹ" کی (معروضی) صورت میں یا پھر قیاس کی شکل میں لیا گیا، اسے انسان کی نفسانی سرگرمی، عملی یا داخلی حیثیت سے نہیں دیکھا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مادیت کے فلسفے کے برخلاف، عملی پہلو کو آئڈیل‌ازم (عینیت‌پرستی) نے ابھارا اور پھیلایا، اگرچہ یہ صرف تجریدی (ایبسٹرکٹ) طریقے سے کیا گیا، کیوں‌کہ آئڈیل‌ازم، لازمی بات ھے کہ صحیح معنوں میں نفسانی سرگرمی کو جیسی‌کہ ھوتی ھے، نہیں سمجھتا۔ فلسفی فائرباخ چاھتا ھے کہ نفسانی اشیا (sensuous objects) کو خیالی اشیا سے الگ کر کے دکھائے، لیکن بذات خود انسانی سرگرمی کو وہ عملی شے شمار نہیں کرتا۔ لہاذا "مسیحیت کی اصلیت"، کتاب میں اس نے صرف نظریاتی عمل کو ھی اصلی انسانی عمل شمار کر لیا ھے، حالاں کہ عمل سامنے آتا ھے محض اپنی کثیف تجارتی شکل میں۔ اسی لئے فائرباخ کی سمجھ میں نہیں آتا کہ "انقلابی"، "عملی تنقیدی"، سرگرمی کی اھمیت کیا ھے۔

(۲)

یہ سوال کہ آیا انسانی غور و فکر بجائے خود حقیقی وجود رکھتا ھے یا نہیں، — کسی طرح بھی نظریاتی سوال نہیں ھے، یہ عملی سوال ھے۔ انسان پر لازم ھے کہ عمل میں اپنے غوروفکر کی صداقت

ثابت کر کے دکھائے ، یعنی اسکی اصلیت اور اس کی طاقت کو ، اور ادھر والے رخ کو ثابت کرے۔ غوروفکر کے حقیقی وجود ہونے نہ ہونے کی بحث ، جب اسے عمل سے بیگانہ کرکے زیرغور لایا جائے ، خالص علمی خیالی بحث رہ جاتی ہے۔

(۳)

مادی فلسفے کی یہ تعلیم کہ لوگ محض ماحول اور اپنی تربیت یا اٹھان کی ہی پیداوار ہوتے ہیں ، چناں‌چہ بدلے ہوئے لوگ دراصل مختلف ماحول اور مختلف تربیت کا نتیجہ ہوتے ہیں ، یہ تعلیم اس بات کو بھول جاتی ہے کہ حالات یا ماحول کا بدلا جانا بھی تو لوگوں کے ہی دم سے ہوتا ہے ، اور یہ کہ جو تربیت دیتے ہیں انہیں خود بھی تو تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ مادی فلسفے کی یہ تعلیم چاروناچار اس نوبت کو پہنچ جاتی ہے کہ سوسائٹی کو دو حصوں میں بانٹ دے ، جس کا ایک حصہ پورے سماج سے بلندوبرتر ہو (مثال کے طور پر ملاحظہ ہوں رابرٹ اووین کی تحریریں)۔

ماحول کا اور انسانی سرگرمی کا بہ‌یک‌وقت بدلتے رہنا تبھی سوچا اور معقولیت کے ساتھ سمجھا جاسکتا ہے ، جب ہم اسے ایسے عمل کی صورت میں دیکھیں جو انقلاب لاتا رہتا ہے۔

(۴)

فائرباخ مذہبی سنیاس (ترک علائق) کی حقیقت سے شروع کرتا ہے۔ وہ دنیا کو دو حصوں میں بانٹ دیتا ہے ، ایک مذہبی یا خیالی دنیا ، دوسری اصلی دنیا۔ وہ اس کام میں لگا ہے کہ مذہبی دنیا کو اس کی زمینی (ارضی) بنیاد کی طرف لائے۔ اسے یہ نہیں سوجھتا کہ جب وہ یہ کام پورا کر چکےگا تو جو اصلی کام کرنا تھا وہ جوں کا توں دھرا رہ جائےگا۔ مطلب یہ کہ ایسی صورت‌حال ، جہاں زمینی بنیاد خود کو خود سے ہی بےنیاز کرلے اور ہوا میں بذات خود بادشاہت کی طرح کھڑی رہ جائے ، وہ صرف اس زمینی بنیاد کی خود انکاری اور باہمی تردید کو ہی ظاہر کرتی ہے۔ چناں‌چہ

اس زمینی بنیاد کو اول تو اس کے اپنے تضاد میں سمجھنا چاھئے اور پھر یہ کہ اس تضاد کو دور کرنے (اس ٹیڑھ کو نکالنے) میں اسے خود انقلابی عمل سے گزرنا ھوگا۔ اس صورت میں، جب، یوں کہیے کہ، ارضی یا زمینی خاندان میں مقدس خاندان کی گتھی سلجھ جائے تب وہ مرحلہ آئےگا کہ زمینی خاندان پر نظریے سے تنقید اور عمل سے انقلابی کایاپلٹ کی جائے۔

(۵)

فائرباخ مطلق غوروفکر سے کچھ مطمئن نہیں، اس‌لئے حسیاتی خیال‌آرائی کی اپیل کرتا ھے۔ مگر وہ تو خود حسیاتی کیفیت کو عملی، یا انسان کی حسیاتی سرگرمی نہیں سمجھتا۔

(۶)

مذھبی جوھر اصلی کو فائرباخ نے انسانی جوھر اصلی میں ڈھال دیا۔ لیکن انسانی جوھر کوئی ایسی مطلق شے نہیں ھے جو الگ الگ ھر ایک فرد کو نصیب ھو گئی ھو۔ اصل میں وہ ایک مجموعہ ھے تمام سماجی تعلقات کا۔

فائرباخ جو اس واقعی جوھر اصلی کی تنقید میں سر نہیں کھپاتا، بالآخر اس پر مجبور ھوتا ھے کہ:

(۱) تاریخ کی رفتار سے پاک صاف رہ کر، مذھبی احساس یا جذبے [Gemüt] کو ھی موجود بالذات سمجھ لیا جائے اور انسانی فرد کو الگ تھلگ ایک مطلق شے شمار کیا جائے۔

(۲) اس کے نزدیک انسانی جوھر محض ایک فطری جوھر («genus») رہ جاتا ھے، کوئی اندرونی کیفیت، ایک بےزبان عمومیت جو فطرت کی گرھوں کے ذریعے الگ الگ بہت سے افراد کو ایک دوسرے سے جوڑ دیتی ھے۔

(۷)

اسی لئے فائرباخ کو نظر نہیں آتا کہ خود ”مذھبی جذبہ“ ایک سماجی پیداوار ھے اور وہ فرد مطلق (ذات انسانی) جس کا وہ

تجزیہ کر رہا ہے ، وہ دراصل سماج کی ایک خاص شکل سے تعلق رکھتا ہے ۔

(۸)

سماجی زندگی اصل میں عملی زندگی ہوتی ہے ۔ وہ سارے اسرارورموز جو نظریے کو لےجاکر مسیحی تصوف (کے دھندلکے) میں گم کر دیتے ہیں ، ان کا معقول حل تلاش کیا جائے تو وہ انسان کے عمل میں اور اس عمل کی سمجھبوجھ میں ہی ملتا ہے ۔

(۹)

خیال‌آرائی کی مادیت ، یعنی وہ مادیت جو حسیاتی کیفیت کو عملی سرگرمی شمار نہیں کرتی ، زیادہ سے زیادہ اس بلندی کو چھو لیتی ہے کہ فرد واحد کو '' متمدن سوسائٹی ،، کا الگ تھلگ فرد تصور کرلے ۔

(۱۰)

مادیت کے پرانے فلسفے کا نقطۂ نظر ہے ایک '' متمدن ،، سوسائٹی ۔ مادیت کے نئے فلسفے کا نقطۂ نظر ہے انسانی سوسائٹی — یا بالعموم عالم انسانیت ۔

(۱۱)

فلسفیوں نے اپنے اپنے طریقے سے دنیا کی تعبیریں پیش کی ہیں ۔ لیکن جو کام کرنا ہے — وہ ہے دنیا کو بدل دینے کا ۔

کارل مارکس نے ۱۸۴۵ ء کے موسم بہار میں لکھا ۔

اول ، اینگلس نے ۱۸۸۸ ء میں
'' لوڈوگ فائرباخ اور جرمن
کلاسیکی فلسفے کا خاتمہ ،، کے
اپنے علاحدہ ایڈیشن میں ،
ضمیمے کے طور پر شائع کیا ۔

کارل مارکس، فریڈرک اینگلس

کمیونسٹ پارٹی کا مینی فسٹو

۱۸۷۲ ء کے جرمن ایڈیشن کا دیباچہ (۲)۔

کمیونسٹ لیگ (۳)* نے جو مزدوروں کی ایک بین اقوامی جماعت تھی اور جو اس وقت کے حالات میں خفیہ جماعت ہی ہو سکتی تھی، نومبر ۱۸۴۷ ء میں لندن میں اپنی کانگرس میں ہمیں اس بات پر مامور کیا کہ پارٹی کا ایک مفصل نظریاتی اور عملی پروگرام اشاعت کے لئے تیار کریں۔ اس طرح اس ''مینی‌فسٹو،، کا جنم ہوا۔ اس کا مسودہ انقلاب فروری (۴) سے چند ہفتے پہلے چھپنے کے لئے لندن بھیجا گیا۔ پہلے یہ جرمن زبان میں چھپا اور اس زبان میں تب سے اب تک جرمنی، انگلینڈ اور امریکہ میں اس کے کم از کم بارہ مختلف ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ انگریزی میں یہ سب سے پہلے ۱۸۵۰ ء میں «Red Republican» (۵) میں لندن میں چھپا۔ اس کا ترجمہ مس ہیلن میکفرلین نے کیا تھا، پھر ۱۸۷۱ ء میں امریکہ میں اس کے کم از کم تین مختلف انگریزی ترجمے چھپے۔ فرانسیسی ترجمہ پہلے پہل ۱۸۴۸ ء میں پیرس میں جون بغاوت (۶) سے کچھ پہلے چھپا اور حال میں نیویارک کے «Le Socialiste» (۷) میں بھی شائع ہوا ہے۔ ایک نیا ترجمہ بھی تیار ہو رہا ہے۔ جرمن زبان میں پہلی مرتبہ شائع

---

* خاص خاص لفظوں اور ناموں کی نمبروار تفصیل اس کتاب کے آخر میں دی گئی ہے۔ (ایڈیٹر)

ہونے کے کچھ ہی دنوں بعد پولش زبان میں بھی اس کا ترجمہ لندن میں شائع ہوا۔ ۱۸۶۰ء کے بعد کے برسوں میں جنیوا میں اس کا روسی ترجمہ شائع ہوا۔ اس کی پہلی اشاعت کے کچھ عرصے بعد ڈینش زبان میں بھی اس کا ترجمہ ہوا۔

گذشتہ پچیس برسوں میں حالات میں کتنی ہی تبدیلیاں ہوئی ہوں مگر جو عام اصول اس ''مینی‌فسٹو،، میں قائم کئے گئے تھے، وہ بحیثیت مجموعی آج بھی اسی قدر صحیح ھیں جتنے پہلے تھے۔ بعض تفصیلات میں کہیں کہیں اصلاح کی گنجائش ہو سکتی ھے۔ ان بنیادی اصولوں کو عملی جامہ پہنانا، جیسا کہ خود ''مینی‌فسٹو،، میں کہا گیا ھے، ہر جگہ اور ہمیشہ اس وقت کے تاریخی حالات پر منحصر ھے اور اسی وجہ سے دوسرے باب کے آخر میں جو انقلابی تدبیریں پیش کی گئی ھیں ان پر کوئی خاص زور نہیں دیا گیا ھے۔ وہ حصہ اگر آج لکھا جائے تو کئی لحاظ سے بہت مختلف ہوگا۔ چونکہ گذشتہ پچیس برسوں میں بڑے پیمانے کی صنعت نے زبردست قدم اٹھائے ھیں اور اسی کے ساتھ مزدور طبقے کی پارٹی تنظیم نے بھی ترقی کی ھے اور پھیلی ھے؛ چونکہ انقلاب فروری میں اور پھر اس سے بھی زیادہ پیرس کمیون (۸) میں عملی تجربات حاصل ہوئے ھیں، جبکہ پہلی دفعہ سیاسی اقتدار پورے دو مہینوں تک پرولتاریہ کے ہاتھوں میں رہا اس‌لئے یہ پروگرام اب بعض تفصیلات میں پرانا ہو گیا ھے۔ کمیون نے خصوصیت کے ساتھ یہ بات ثابت کی کہ ''مزدور طبقے کے لئے یہ ممکن نہیں ھے کہ بنی بنائی ریاستی مشینری کو اپنے ہاتھوں میں محض لے‌لے اور اسے اپنے مقاصد کے‌لئے استعمال کرے،، (دیکھئے: «Der Bürgerkrieg in Frankreich, Adresse des Generalrats der Internationalen Arbeiterassoziation»، جرمن ایڈیشن، صفحہ ۱۹۔ اس میں اس خیال پر پوری روشنی ڈالی گئی ھے *)۔ پھر یہ بجائے خود ظاہر ھے کہ موجودہ زمانے کے اعتبار سے

* دیکھئے جلد دوم: ک۔ مارکس ''فرانس میں خانہ جنگی۔ انٹرنیشنل ورکنگ مینز ایسوسی‌ایشن کی جنرل کونسل کا خط،،۔

سوشلسٹ ادب کی تنقید ناکافی ہے کیونکہ وہ ۱۸۴۷ ء تک ہی رک جاتی ہے ؛ اسی طرح یہ بھی ظاہر ہے کہ چوتھے باب میں مخالف پارٹیوں سے کمیونسٹوں کے تعلق کے بارے میں جو بات کہی گئی ہے ، وہ اصولاً اگرچہ اب بھی صحیح ہے ، تاہم عملاً جزوی طور پر پرانی ہو چکی ہے کیونکہ سیاسی حالت بالکل بدل گئی ہے اور مینی‌فسٹو میں جن سیاسی پارٹیوں کا نام لیا گیا ہے ، ان میں سے اکثروبیشتر کو تاریخ کے ارتقا نے صفحۂ زمین سے مٹا دیا ہے۔

لیکن یہ ''مینی‌فسٹو ،، تو ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ اس میں ردوبدل کرنے کا اب ہمیں کوئی حق نہیں۔ آئندہ ایڈیشن شاید ایک مقدمے کے ساتھ شائع ہو جو ۱۸۴۷ ء سے آج تک کے خلا کو پر کر سکے۔ موجودہ اشاعت اتنی غیرمتوقع تھی کہ ہمیں اس کی مہلت نہیں ملی۔

کارل مارکس ، فریڈرک اینگلس

لندن ، ۲۴ جون ۱۸۷۲ ء

۱۸۷۲ ء میں لائپزگ سے ایک پمفلٹ میں
شائع ہوا جس کا نام تھا :
«Das Kommunistische Manifest.
Neue Ausgabe mit einem Vorwort der Verfasser».

۱۸۹۰ ء کے جرمن ایڈیشن کے دیباچے سے اقتباس

''مینی‌فسٹو ،، کی اپنی ایک تاریخ ہے۔ شائع ہونے پر سائنسی سوشلزم کے ہراولوں نے جن کی تعداد اس وقت زیادہ نہیں تھی ، اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا (جیسا کہ پہلے دیباچے میں جن ترجموں کا ذکر ہے ، ان سے ظاہر ہوتا ہے)۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں میں جون

۱۸۴۸ ء میں پیرس کے مزدوروں کی شکست کے ساتھ رجعت کا دور شروع ہوا تو ''مینی‌فسٹو ،، گمنامی میں پڑ گیا ۔ اور آخرکار جب نومبر ۱۸۵۲ ء میں کولون کے کمیونسٹوں کو سزا ہوئی (۹) تو ''مینی‌فسٹو ،، کو '' قانون کے مطابق ،، راندۂ قانون قرار دیا گیا ۔ انقلاب فروری کے ساتھ جس مزدور تحریک کی ابتدا ہوئی تھی اس کے رخصت ہوتے ہی ''مینی‌فسٹو ،، بھی گمنامی میں پڑ گیا ۔

یورپ کے مزدور طبقے میں جب پھر اتنی طاقت آ گئی کہ حکمراں طبقوں پر نئے سرے سے حملہ کر سکے تو محنت کرنےوالوں کی انٹرنیشنل ایسوسی‌ایشن قائم ہوئی ۔ اس کا مقصد یورپ اور امریکہ کے مزدور طبقے کی تمام مستعد اور مجاہد طاقتوں کو ملا کر ایک زبردست فوج تیار کرنا تھا ۔ اس لئے اس کی ابتدا ان اصولوں سے نہیں ہو سکتی تھی جو ''مینی‌فسٹو ،، میں دئے گئے تھے ۔ لازم تھا کہ اس کا پروگرام ایسا ہو کہ انگلینڈ کی ٹریڈیونینوں ، فرانس ، بلجیم ، اٹلی اور اسپین کے پرودھوں کے نام لیوا اور جرمنی کے لاسال‌والوں * پر اس کے دروازے بند نہ ہو جائیں ۔ یہ پروگرام جوکہ انٹرنیشنل کے قواعدوضوابط کی تمہید کی صورت میں تھا خود مارکس نے مرتب کیا تھا اور ایسی استادی کے ساتھ کہ باکونن اور انارکسٹوں کو بھی اس کا اعتراف کرنا پڑا ۔ ''مینی‌فسٹو ،، میں جو اصول پیش کئے گئے تھے ان کی قطعی کامیابی کےلئے مارکس کو مزدور طبقے کی ذہنی نشوونما پر پورا بھروسہ تھا جو متحدہ عمل اور تبادلۂ خیال کا لازمی نتیجہ ہو سکتی تھی ۔ سرمائے کے خلاف جدوجہد کے واقعات ، اس کے

---

* لاسال‌نے ذاتی طور پر ہمارے سامنے ہمیشہ یہی دعوی کیا کہ وہ مارکس کا ''پیرو ،، ہے اور اس لحاظ سے وہ بےشک ''مینی‌فسٹو ،، کو مانتا تھا ۔ لیکن اس کے پیروؤں میں ان لوگوں کی حیثیت بالکل مختلف تھی جو لاسال کے اس مطالبے سے آگے بڑھنے کو تیار نہ تھے کہ سرکاری قرض کی مدد سے کوآپریٹیو ورکشاپ قائم کئے جائیں ۔ ان لوگوں نے سارے مزدور طبقے کو سرکاری امداد کے حامیوں اور اپنی مدد کے حامیوں میں بانٹ رکھا تھا ۔ (حاشیہ از اینگلس)

اتار چڑھاؤ اور کامیابیوں سے زیادہ اس کی شکستیں، لڑنےوالوں کو یہ بتائے بغیر نہ رہ سکیں کہ ان کے ہر مرض کے نسخے جن کو وہ اس وقت تک استعمال کرتے تھے، بےکار ہیں اور اس طرح ان کے ذہن اس بات پر آمادہ ہوئے کہ مزدور طبقے کی نجات کےلئے جو صحیح شرطیں ہیں، ان کی پوری سمجھداری حاصل کریں۔ مارکس کا خیال صحیح نکلا۔ ۱۸۷۴ء کا مزدور طبقہ، جب انٹرنیشنل کا خاتمہ ہوا، ۱۸۶۴ء کے مزدور طبقے سے بہت مختلف تھا جب انٹرنیشنل کی بنیاد پڑی تھی۔ لاطینی ملکوں میں پرودھوں کا مسلک اور جرمنی کی مخصوص لاسالیت دم‌توڑ رہی تھی اور انگلینڈ کی انتہائی قدامت‌پرست ٹریڈ یونینیں بھی رفتہ رفتہ اس نقطۂ‌نظر پر پہنچنے لگی تھیں جہاں ۱۸۸۷ء میں سوانسی میں ان کی کانگرس کے صدر * نے ان کی جانب سے یہاں تک کہہ دیا کہ ”براعظم‌یورپ کا سوشلزم اب ہمارے لئے کوئی ڈراؤنی چیز نہیں رہا“۔ حالانکہ ۱۸۸۷ء میں براعظم کا سوشلزم سے مراد قریب قریب وہی نظریہ تھا جسے ”مینی‌فسٹو“ میں پیش کیا گیا تھا۔ غرضیکہ ایک حد تک ”مینی‌فسٹو“ کی تاریخ ۱۸۴۸ء کے بعد سے جدید مزدور تحریک کی تاریخ ہے۔ اس وقت بلاشبہ سوشلسٹ ادب میں ”مینی‌فسٹو“ کی اشاعت سب سے زیادہ ہوتی ہے، یہی اس ادب کا سب سے زیادہ بین‌اقوامی کارنامہ ہے اور سائبیریا سے کیلی‌فورنیا تک تمام ملکوں کے کروڑوں مزدوروں کا مشترکہ پروگرام ہے۔

پھر بھی جب یہ شائع ہوا ہم اسے سوشلسٹ مینی‌فسٹو نہیں کہہ سکتے تھے۔ ۱۸۴۷ء میں دو طرح کے آدمیوں کو سوشلسٹ کہا جاتا تھا۔ ایک طرف مختلف یوٹوپیائی نظاموں کے ماننےوالے تھے جن میں انگلینڈ میں اووین کے مقلد اور فرانس میں فورئے کے ماننےوالے خاص طور پر قابل ذکر ہیں؛ ان دونوں کی تعداد اس وقت کم ہو کر چھوٹی چھوٹی ٹولیاں رہ گئی تھیں اور رفتہ رفتہ مٹتی جا رہی تھیں۔ دوسری طرف بھانت بھانت کے سماجی نیم‌حکیم تھے، جو اپنے مختلف ہر مرض کے نسخوں کے ذریعہ اور طرح طرح کے جوڑ پیوند لگا کر

* او۔ بیوین۔ (ایڈیٹر)

سرمایہ اور نفع کو ذرا بھی نقصان پہنچائے بغیر سماجی خرابیوں کو دور کرنا چاہتے تھے۔ ان دونوں قسموں کے لوگ مزدور تحریک سے باہر تھے اور مدد کے لئے ''پڑھے لکھے،، طبقوں کا منہ تکا کرتے تھے۔ برعکس اس کے مزدور طبقے کا وہ حصہ جو نئے سرے سے سماج کی بنیادی تعمیر کی مانگ کر رہاتھا اور جسے یقین تھا کہ محض سیاسی الٹ پلٹ کافی نہیں ہے، اس زمانے میں اپنے آپ کو کمیونسٹ کہتا تھا۔ اس وقت تک یہ ایک ان گڑھ محض جبلی اور زیادہ‌تر بھدا کمیونزم تھا۔ پھر بھی اس میں اتنی قوت تھی کہ اس نے یوٹوپیائی کمیونزم کے دو نظام قائم کئے: فرانس میں کابے کا ''ایکاری،، کمیونزم اور جرمنی میں وائیٹلنگ کا۔ ۱۸۴۷ء میں سوشلزم ایک بورژوا تحریک تھی اور کمیونزم مزدور طبقے کی تحریک۔ سوشلزم کم‌ازکم براعظم یورپ میں کافی نیک نام تھی، کمیونزم کا حال اس کے برعکس تھا۔ اور چونکہ ہم لوگوں کی اس وقت بھی یہ پختہ رائے تھی کہ ''مزدور طبقے کی نجات مزدورطبقے کا اپنا کام ہے،،، اس لئے ہمیں کوئی شک‌وشبہ نہیں رہا کہ ہم کون سا نام اختیار کریں، اور اس کے بعد ہمیں کبھی اس نام کو ترک کرنے کا خیال نہیں آیا۔

''دنیا کے مزدورو، ایک ہو!،، جب آج سے بیالیس برس قبل، پیرس انقلاب، ایسے پہلے انقلاب کے موقع پر، جبکہ پرولتاریہ اپنی‌مانگیں لے کر سامنے آیا تھا، ہم نے یہ آواز بلند کی تو کم لوگوں نے اس کا ساتھ دیا تھا (۱۰)۔ لیکن ۲۸ ستمبر ۱۸۶۴ء کو مغربی یورپ کے زیادہ‌تر ملکوں کے پرولتاری، محنت کرنےوالوں کی انٹرنیشنل ایسوسی‌ایشن میں متحد ہو گئے جس کی شاندار یاد آج بھی زندہ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ انٹرنیشنل خود صرف نو برس زندہ رہی مگر اس نے تمام ملکوں کے پرولتاریوں کے ابدی اتحاد کو جنم دیا جو آج بھی زندہ ہے اور پہلے سے زیادہ مضبوط ہے، اور آج سے بہتر شہادت اس کی نہیں مل سکتی۔ کیونکہ آج (۱۱) جب میں یہ سطریں لکھ

رھا ھوں، یورپ اور امریکہ کا پرولتاریہ اپنی مجاھد قوتوں کا جائزہ لے رھا ھے جو پہلی بار ایک فوج کی طرح، ایک جھنڈے کے نیچے، ایک فوری مقصد کی خاطر منظم ھوئی ھیں یعنی قانونی طور پر کام کا دن آٹھ گھنٹے کا مقرر کیا جائے جس کا اعلان ۱۸۶۶ء میں انٹرنیشنل کی جنیوا کانگرس نے اور پھر ۱۸۸۹ء میں مزدوروں کی پیرس کانگرس نے کیا۔ اور آج کا نظارہ تمام ملکوں کے سرمایہ‌داروں اور زمین‌داروں کو دکھا دیگا کہ تمام ملکوں کے مزدور واقعی متحد ھو چکے ھیں۔

کاش کہ مارکس بھی آج میرے ساتھ اپنی آنکھوں سے یہ دیکھتا!

ف۔ اینگلس

لندن، یکم مئی ۱۸۹۰ء

۱۸۹۰ء میں لندن سے ایک کتاب میں چھپا جس کا عنوان تھا:
«Das Kommunistische Manifest».

کمیونسٹ پارٹی کا مینی فسٹو

یورپ کے اوپر ایک بھوت منڈلا رہا ہے — کمیونزم کا بھوت۔ اس بھوت کو اتارنے کےلئے پرانے یورپ کی تمام طاقتوں، پوپ اور بادشاہ، میٹرنک اور گیزو، فرانسیسی ریڈیکل اور جرمن پولیس کے جاسوسوں نے ایک مقدس اتحاد کر لیا ہے۔

وہ کون سی مخالف پارٹی ہے جسے اس کے ذی اقتدار حریفوں نے کمیونسٹ کہہ کر رسوا نہیں کیا؟ وہ کون سے مخالف ہیں جنھوں نے اپنے سے زیادہ ترقی پسند مخالف پارٹیوں پر اور اپنے رجعت پسند حریفوں پر بھی، الٹا، کمیونزم کا الزام نہیں لگایا؟

اس حقیقت سے دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔

۱ - تمام یورپی طاقتوں نے کمیونزم کو بجائے خود اب ایک طاقت تسلیم کر لیا ہے۔

۲ - وقت آ گیا ہے کہ کمیونسٹ اب ساری دنیا کے سامنے برملا اپنے خیالات، مقاصد اور رجحانات کی اشاعت کریں اور کمیونزم کے بھوت کی اس طفلانہ کہانی کے جواب میں خود اپنی پارٹی کا مینی فسٹو پیش کردیں۔

اسی غرض سے مختلف قوموں کے کمیونسٹ لندن میں جمع ہوئے اور مندرجۂذیل ''مینی‌فسٹو'' تیار کیا جو انگریزی، فرانسیسی، جرمن، اطالوی، فلیمی اور ڈینش زبانوں میں شائع کیا جائے گا۔

۱- بورژوا اور پرولتاریہ *

آج تک تمام سماجوں کی تاریخ ** طبقاتی جدوجہد کی تاریخ ہے۔

---

* بورژوا سے جدید سرمایہ‌داروں کا طبقہ مراد ہے جو سماجی پیداوار کے ذرایع کے مالک ہیں اور مزدوروں سے اجرت پر کام لیتے ہیں۔ پرولتاریہ، موجودہ زمانے کا، اجرت پر کام کرنے والے مزدوروں کا طبقہ ہے، جس کے پاس اپنا کوئی ذریعہ‌پیداوار نہیں اور جسے زندہ رہنے کےلئے اپنی قوت‌محنت بیچنی پڑتی ہے۔ (۱۸۸۸ء کے انگریزی ایڈیشن میں اینگلس کا حاشیہ۔)

** یعنی وہ تمام تاریخ جو قلم بند ہو چکی ہے۔ ۱۸۴۷ء میں سماج کے ماقبل تاریخ کا زمانہ یعنی تاریخ کے قلم‌بند ہونے سے پہلے کی سماجی تنظیم گویا کسی کو معلوم نہ تھی۔ لیکن اس کے بعد ہیکس‌تھاسن نے روس میں زمین کی مشترکہ ملکیت کا پتہ لگایا۔ پھر ماورر نے ثابت کیا کہ تمام قدیم جرمانوی نسلوں نے جب تاریخ کی دھلیز پر قدم رکھا تو اس وقت ان کی ہیئت اجتماعی کی بنیاد اسی مشترکہ ملکیت پر تھی، اور رفتہ رفتہ پتہ چلا کہ ہندستان سے آئرلینڈ تک ہر جگہ سماج دیہی برادریوں کی شکل میں منظم تھا یا اس شکل میں رہا ہے۔ اور مارگن نے جب کنبے کی اصلی نوعیت اور قبیلے سے اس کے تعلق کا حال معلوم کر لیا تو اس قدیم کمیونسٹ سماج کی اندرونی تنظیم اس کی مخصوص شکل میں اندھیرے سے اجالے میں آ گئی۔ یہی دریافت مارگن کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ ان قدیم برادریوں کے تتربتر ہوئے پر سماج میں الگ الگ اور آخر کار مخالف طبقوں کا امتیاز پیدا ہو گیا۔ میں نے اپنی کتاب «Der Ursprung der

آزاد اور غلام ، پتریشین اور پلے بین ، جاگیردار اور زرعی غلام ، استاد* اور کاریگر غرضیکه ظالم اور مظلوم برابر ایک دوسرے کے خلاف صف‌آرا رہے ، کبھی کھلے بندوں اور کبھی پس‌پردہ ہمیشه ایک دوسرے سے لڑتے رہے - اور ہر بار اس لڑائی کا انجام یه ہوا که یا تو نئے سرے سے سماج کی انقلابی تعمیر ہوئی یا لڑنےوالے طبقے ایک ساتھ تباہ ہو گئے -

تاریخ کے ابتدائی زمانوں میں تقریباً ہر جگه ہم سماج کو مختلف پرتوں میں تہه به تہه مرتب پاتے ہیں - مختلف سماجی مراتب کا ایک پورا زینه ملتا ہے - قدیم روم میں پتریشین ، نائٹ ، پلے‌بین اور غلام ملتے ہیں اور عہدوسطی میں جاگیردار ، آسامی ، استاد ، کاریگر ، نوسکھئے شاگرد اور زرعی غلام — اور تقریباً ان تمام طبقوں میں مزید ذیلی تقسیمیں ہیں -

جدید بورژوا سماج نے جو که جاگیردار سماج کے کھنڈروں سے ابھرا ہے ، طبقاتی اختلافات کو دور نہیں کیا - اس نے تو محض پرانے کی جگه نئے طبقے ، ظلم کی نئی صورتیں اور جدوجہد کی نئی شکلیں پیدا کر دیں -

پھر بھی ہمارا عہد ، جو بورژوا طبقے کا عہد ہے ، ایک امتیازی صفت رکھتا ہے — اس نے طبقاتی اختلافات کی پیچیدگی کو کم کر دیا ہے : سماج بحیثیت مجموعی روز به روز دو بڑے مخالف مورچوں

Familie, des Privateigentums und des Staats», 2 Aufl., Stuttgart, 1886. (دیکھئے : فریڈرک اینگلس - "خاندان ، ذاتی ملکیت اور ریاست کا آغاز" ، دوسرا ایڈیشن ، اشٹوٹ‌گارٹ ، ۱۸۸۶ ء -) میں اس انتشار کا نقشه کھینچنے کی کوشش کی ہے - (۱۸۸۸ ء کے انگریزی ایڈیشن میں اینگلس کا حاشیه -)

* استاد یعنی گلڈماسٹر — اہل حرفه کی انجمنوں یعنی گلڈ کے پورے رکن ہوتے تھے - وہ پوری انجمن کے سردار نہیں بلکه اس کے اندر رکن کی حیثیت رکھتے تھے - (۱۸۸۸ ء کے انگریزی ایڈیشن میں اینگلس کا حاشیه -)

میں ، دو بڑے طبقوں بورژوا اور پرولتاریہ میں بٹتا جا رہا ہے جو ایک دوسرے کے خلاف صف‌آرا ہیں ۔

عہدوسطی کے زرعی غلاموں سے ابتدائی شہروں کے حقوق‌یافتہ شہری پیدا ہوئے تھے ۔ ان ہی شہریوں سے بورژوا طبقے کے ابتدائی عناصر کی نشوونما ہوئی ۔

امریکہ کی دریافت اور افریقہ کے گرد جہازرانی شروع ہونے کی وجہ سے ابھرتے ہوئے بورژوا طبقے کےلئے نئی راہیں کھل گئیں ۔ ایسٹ انڈیا اور چین کی منڈیوں ، امریکہ کی نوآبادکاری ، نوآبادیوں کے ساتھ تجارت ، ذرائع تبادلہ اور عام طور سے اجناس کی کثرت نے تجارت ، جہازرانی اور صنعت کو ایسی ترغیب دی جو کہ اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی ، اور اس کی وجہ سے گرتے ہوئے جاگیردار سماج میں انقلابی عناصر کو تیزی سے بڑھنے کا موقع ملا ۔

صنعت کا جاگیردارانہ یا مستری خانوں کا سابق‌نظام اب نئی منڈیوں کی بڑھتی ہوئی مانگوں کےلئے ناکافی ہو گیا ۔ کارخانہ‌دار نظام نے اس کی جگہ لی ۔ استاد کو درمیانی کارخانہ‌دار پرت نے نکال باہر کیا ۔ ہر کارخانے کی اندرونی تقسیم‌محنت کے مقابلے میں اہل حرفہ کی مختلف جماعتوں کی باہمی تقسیم‌محنت ختم ہو گئی ۔

اس اثنا میں منڈیاں برابر پھیلتی رہیں ، مانگ برابر بڑھتی رہی ۔ حتی کہ کارخانہ‌داری بھی اب کافی نہ ہو سکی ۔ تب بھاپ اور مشین نے صنعتی پیداوار میں انقلاب برپا کردیا ۔ کارخانہ‌داری کی جگہ دیوہیکل جدید صنعت نے اور درمیانی کارخانہ‌دار پرت کی جگہ صنعتی کروڑپتیوں نے بڑی بڑی صنعتی فوجوں کے لیڈر ، جدید بورژوا طبقے نے لےلی ۔

جدید صنعت نے عالمگیر منڈی قائم کی ، جس کےلئے امریکہ کی دریافت سے راہ کھل چکی تھی ۔ اس منڈی نے تجارت ، جہازرانی اور خشکی کے وسائل آمدورفت کو زبردست ترقی دی ۔ اس ترقی سے صنعت کے بڑھنے میں اور مدد ملی ، اور جیسے جیسے صنعت ، تجارت ، جہازرانی اور ریلوں کو توسیع ہوئی ، اسی مناسبت سے بورژوا طبقے کی نشوونما ہوئی ۔ اس نے اپنا سرمایہ بڑھایا اور ہر اس طبقے کو دھکیل کر پیچھے کردیا جو عہدوسطی سے چلا آ رہا تھا ۔

غرض ہم دیکھتے ہیں کہ خود جدید بورژوا طبقہ ارتقا کے ایک طویل سلسلے کا، پیداوار اور تبادلے کے طریقوں میں مسلسل کئی تغیرات کا نتیجہ ہے۔

بورژوا طبقے نے اپنی نشوونما کے دوران جو قدم بھی اٹھایا، اس کے ساتھ اسی مناسبت سے اس طبقے کی سیاسی ترقی بھی ہوئی۔ جاگیرداروں کے عہدحکومت میں وہ ایک مظلوم طبقہ تھا، زمانہ‌وسطی کے کمیون* (بلدیہ) میں ایک ہتھیاربند اور خودمختار جماعت، کہیں آزادشہری جمہوریہ (جیسے اٹلی اور جرمنی میں) اور کہیں بادشاہی حکومت میں محصول گذار ''تیسرا طبقہ''، (جیسے فرانس میں)۔ بعد میں اصل کارخانہ‌داری کے زمانے میں اس نے امرا کے خلاف نیم جاگیرداری یا خودمختار شاہی حکومت کا پلہ بھاری کیا اور حقیقت میں عام طور پر بڑی بادشاہتوں کا سنگ بنیاد بنا۔ اسی بورژوا طبقے نے بالآخر بڑی صنعت اور عالم گیر منڈی قائم ہو جانے پر جدید نمائندہ ریاست میں بلاشرکت غیرے اپنےلئے سیاسی اقتدار حاصل کر لیا۔ جدید ریاست کا صیغہ انتظامی تو محض ایک کمیٹی ہے، جو پورے بورژوا طبقے کے مشترکہ معاملات کی دیکھ بھال کرتی ہے۔

بورژوا طبقے نے تاریخی اعتبار سے نہایت انقلابی خدمت انجام دی ہے۔

---

* ''کمیون''— فرانس میں ابتدائی قصباتی شہروں کا یہ نام اسی وقت سے چلا آتا ہے جبکہ انہوں نے اپنے جاگیردار آقاؤں سے لڑکر مقامی خودانتظامی اور ''تیسرے طبقے'' کی حیثیت سے اپنے سیاسی حقوق بھی نہیں حاصل کئے تھے۔ اس کتاب میں عام طور سے بورژوا طبقے کی اقتصادی نشوونما کا ذکر کرتے ہوئے انگلینڈ کو اور سیاسی نشوونما کا ذکر کرتے ہوئے فرانس کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ (۱۸۸۸ء کے انگریزی ایڈیشن میں اینگلس کا حاشیہ۔)

اٹلی اور فرانس کے شہری باشندوں نے اپنی شہری برادریوں کو یہ نام اسی وقت دے دیا تھا جب انہوں نے اپنے جاگیردار مالکوں سے خود حکومتی کے ابتدائی حقوق خریدے یا زبردستی حاصل کئے۔ (۱۸۹۰ء کے جرمن ایڈیشن میں اینگلس کا حاشیہ۔)

بورژوا طبقے کا جہاں کہیں غلبہ ہوا، اس نے تمام جاگیردار، سر قبیلی اور دیہاتی رومانوی تعلقات کا خاتمہ کردیا۔ اس نے بے دردی سے ان گوناگوں جاگیردار بندھنوں کو توڑ دیا، جو انسان کو اس کے "پیدائشی آقاؤں" کا پابند کئے ہوئے تھے، اور خالص تن پروری اور بےدرد "نقد لین دین" کے سوا آدمی آدمی میں اور کوئی رشتہ باقی نہیں رهنے دیا۔ اس نے مقدس مذھبی ولولے، بہادرانہ الوالعزمیوں اور پیٹی بورژوا جذبات‌پرستی کے تمام کیف کو حرص اور خودغرضی کے سرد پانی میں ڈبو دیا۔ اس نے جوھر ذاتی کو آنے پائی میں بدل دیا، اور بےشمار ناقابل ضبط سندیافتہ آزادیوں کی جگہ ریا اور مکر سے بھری واحد آزادی قائم کی اور وہ ھے تجارت کی آزادی۔ مختصر یہ کہ اس نے مذھب اور سیاست کے پردوں سے ڈھکے ہوئے استحصال کی جگہ عریاں، حیاسوز، براہ‌راست وحشیانہ استحصال رائج کر دیا ھے۔

بورژوا طبقے نے ھر اس پیشے کی عظمت چھین لی جس کی اب تک عزت ھوتی آئی تھی، اور جس کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے طبیب، وکیل، مذھبی پیشوا، شاعر، اهل‌علم سب کو اپنا تنخواہ‌دار، اجرت پر کام کرنےوالا مزدور بنا دیا ھے۔

بورژوا طبقے نے خاندانی رشتوں کی دلگداز جذبات‌پرستی کا نقاب چاک کر دیا ھے اور ان کو محض روپیے پیسے کا رشتہ بنا کر رکھ دیا ھے۔

بورژوا طبقے نے یہ راز فاش کر دیا کہ عہدوسطی میں اپنے کس بل کی وحشیانہ نمائش کا، جس کے رجعت‌پرست اس قدر دل‌دادہ ھیں اور سخت کاھلی اور عیش‌پرستی کا چولی دامن کا ساتھ تھا۔ وہ پہلا طبقہ ھے جس نے دکھا دیا کہ انسان کی کارگذاری کیا کچھ کر سکتی ھے۔ اس نے وہ عجائبات پیش کئے جن کے مقابلے میں مصر کے اهرام، روم کی نہریں اور گوتھک نمونے کے شاندار گرجے ھیچ ھیں۔ اس نے وہ وہ مہمیں سر کی ھیں جن کے سامنے تمام اگلے زمانوں کی قوموں کی مہمیں اور صلیبی جنگیں مات ھیں۔ (۱۲)

بورژوا طبقہ آلات‌پیداوار میں اور ان کی وجہ سے تعلقات‌پیداوار میں اور ان کے ساتھ سماج کے سارے تعلقات میں لگاتار انقلابی الٹ‌پلٹ

کئے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس کے برعکس پیداوار کے پرانے طریقوں کو بلا کسی ردوبدل کے جوں کے توں قائم رکھنا، پہلے زمانے کے تمام صنعتی طبقوں کے بقا کی پہلی شرط تھی۔ پیداوار میں پیہم انقلابی الٹ پلٹ، جملہ سماجی تعلقات میں لگاتار خلل، دائمی عدم استحکام اور هلچل بورژوازی کے عہد کو پہلے کے تمام زمانوں سے ممتاز کرتی هیں۔ تمام دیرینہ تعلقات جو پتھر کی لکیر بن چکے تھے، اپنے قدیم اور لائق احترام تعصبات اور عقیدوں کے لاؤ لشکر سمیت نیست‌ونابود هو گئے۔ اور نئے قائم هونےوالے تعلقات جڑ پکڑنے بھی نہیں پاتے کہ فرسودہ هو جاتے هیں۔ کل تک جو ٹھوس تھا، آج هوا هو گیا، جو پاک تھا وہ نجس ٹھیرا، اور انسان آخرکار مجبور هوا کہ اپنی زندگی کی حقیقتوں کا اور اپنے هم جنسوں کے ساتھ اپنے تعلقات کا پورے هوش‌وحواس کے ساتھ جائزہ لے۔

اپنے مال کے لئے منڈی کو برابر بڑھاتے رهنے کی ضرورت بورژوا طبقے سے سارے جہان کی خاک چھنواتی هے۔ اسے هر شاخ پر آشیانہ بنانا پڑتا هے، هر جگہ گھر بسانا پڑتا هے، هر جگہ تعلقات قائم کرنے هوتے هیں۔

بورژوا طبقے نے عالم گیر منڈی کے استحصال کے ذریعہ هر ملک میں پیداوار اور کھپت کو آفاقی رنگ دے دیا هے۔ رجعت‌پرست سخت خفا هیں کہ صنعت جس قومی بنیاد پر کھڑی تھی، وہ زمین اس کے پاؤں تلے سے نکل گئی۔ پہلے سے چلی آنےوالی تمام قومی صنعتیں تباہ کردی گئیں یا دن بدن تباہ هوتی جا رهی هیں۔ نئی صنعتیں ان کی جگہ لے رهی هیں جن کو رائج کرنا تمام مہذب قوموں کےلئے زندگی اور موت کا سوال بنتا جا رہا هے۔ یہ وہ صنعتیں هیں جن میں اپنے دیس کا هی کچا مال استعمال نہیں هوتا بلکہ دور دور کے علاقوں سے کچا مال آتا هے۔ ان صنعتوں کی پیداوار کی کھپت صرف اپنے ملک میں نہیں بلکہ دنیا کے هر گوشے میں هوتی هے۔ پرانی ضرورتوں کی جگہ جو اپنے ملک کی پیداوار سے پوری هو جایا کرتی تھیں، اب نئی ضرورتیں پیدا هو گئی هیں، جن کو پورا کرنے کے لئے دور دراز کے ملکوں اور علاقوں کا مال چاهئے۔ پرانی مقامی اور قومی علیحدگی اور خود کفالتی کے بدلے اب هر طرف باهمی اشتراک کا دور دورہ هے اور قوموں کی

ایک دوسرے سے عالم گیر وابستگی دیکھنے میں آتی ہے۔ اور مادی پیداوار کا جو حال ہے وہی ذہنی پیداوار کا بھی ہے۔ ہر قوم کے ذہنی کارنامے ساری دنیا کی میراث بنتے جا رہے ہیں۔ قومی یک طرفہ پن اور تنگ نظری دن‌بدن ناممکن ہوتی جارہی ہے اور متعدد قومی اور مقامی ادبوں سے مل کر ایک عالم گیر ادب جنم لے رہا ہے۔

بورژوا طبقہ تمام آلات‌پیداوار کو تیزی سے ترقی دیتا اور آمدورفت کے وسیلوں کو بے حد آسان بناتا رہتا ہے، اور ان کے بل پر وہ تمام قوموں کو حتی کہ انتہائی وحشی قوموں کو بھی تہذیب کے دائرے میں کھینچ لاتا ہے۔ اس کے تجارتی مال کی ارزانی گولے‌بارود کا کام کرتی ہے جن سے مارسارکر وہ ہر دیوارچین کو گرا دیتا ہے، اور ضدی سے ضدی وحشیوں کو، جن کے دل سے غیروں کی نفرت کا جذبہ مارے نہیں مرتا، ہار ماننے پر مجبور کر دیتا ہے۔ وہ تمام قوموں کو مجبور کرتا ہے کہ بورژوا طریقۂ پیداوار اختیار کریں یا فنا ہو جائیں۔ وہ انہیں مجبور کرتا ہے کہ وہ بھی اس کی منہ بولی تہذیب کو اپنے یہاں رائج کریں یعنی وہ خود بھی بورژوا بنیں۔ مختصر یہ کہ وہ اپنے سانچے میں ایک دنیا کو ڈھال لیتا ہے۔

بورژوا طبقے نے دیہات کو شہروں کے تابع کر دیا ہے۔ اس نے بڑے بڑے شہر بسائے ہیں۔ دیہات کے مقابلے میں شہری آبادی کو بہت بڑھا دیا ہے اور اس طرح آبادی کے ایک بڑے حصے کو دیہاتی زندگی کے گنوارپن سے چھٹکارا دلایا ہے۔ اور جس طرح اس نے دیہات کو شہروں کا دست‌نگر بنایا، اسی طرح غیرمہذب اور نیم مہذب ملکوں کو مہذب ملکوں کا، کسانی قوموں کو بورژوا قوموں کا، مشرق کو مغرب کا محتاج بنایا۔

بورژوا طبقہ ذرائع پیداوار، ملکیت اور آبادی کی تتربتر حالت کو دن‌بدن ختم کرتا جا رہا ہے۔ اس نے کثیر آبادیوں کو اکٹھا کیا ہے، ذرائع پیداوار کو مرکزیت بخشی ہے اور ملکیت کو چند ہاتھوں میں بٹور لیا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ سیاسی مرکزیت تھا۔ صوبے جو آزاد تھے یا جن میں کوئی واضح تعلق نہیں تھا، جن کے مفاد، قانون، حکومتیں اور محصول کے طریقے الگ الگ تھے، اب مل کر

ایک قوم بن گئے ہیں، جس کی ایک حکومت ہے، قانون کا ایک ہی ضابطہ ہے، ایک قومی طبقاتی مفاد ہے، ایک سرحد اور ایک کسٹم ڈیوٹی ہے۔

بورژوا طبقے نے اپنے بہ مشکل ایک سو برس کے دورحکومت میں اتنی بڑی اور دیوپیکر پیداواری قوتیں تخلیق کر لی ہیں کہ پچھلی تمام نسلیں مل کر بھی نہ کر سکی تھیں۔ قدرت کی طاقتوں پر انسان کی کارفرمائی، مشینیں، صنعت اور زراعت میں کیمیا کا استعمال، دخانی جہاز رانی، ریلیں، تار برقی، کھیتی کےلئے پورے کے پورے براعظموں کی صفائی، نہریں بنا کر دریاؤں کو ملانا اور گویا جادو کے زور سے زمین کا سینہ چیر کر چشم‌زدن میں بڑی بڑی آبادیوں کا ظہور میں آجانا — آج سے پہلے کس زمانے کے لوگوں کے وھم‌وگمان میں بھی یہ بات آسکتی تھی کہ اجتماعی محنت کی گود میں ایسی ایسی پیداواری طاقتیں پڑی سو رہی ہیں!

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ پیداوار اور تبادلہ کے وسیلے، جن کی بنیاد پر بورژوا طبقے نے اپنے آپ کو بنایا، جاگیردار سماج میں پیدا ہوئے تھے۔ پیداوار اور تبادلہ کے ان وسیلوں کی نشوونما میں ایک منزل ایسی آئی کہ جاگیردار سماج کے حالات میں، جن میں مال کی پیداوار اور اس کا تبادلہ ہوتا تھا، زراعت اور کارخانہ‌داری صنعت کی جاگیردار تنظیم کے اندر، مختصر یہ کہ ملکیت کے جاگیردار رشتوں سے اب بڑھی ہوئی پیداواری قوتوں کا نباہ ناممکن ہو گیا۔ یہ رشتے ان قوتوں کے پیروں کی زنجیر بن گئے۔ ان زنجیروں کو توڑنا تھا۔ ان کو توڑ دیا گیا۔

اب آزاد مقابلے نے ان کی جگہ لےلی، اور اپنے حسب حال ایک سماجی اور سیاسی نظام اور بورژوا طبقے کا اقتصادی اور سیاسی اقتدار بھی ساتھ لیتا آیا۔

اسی قسم کی ایک تبدیلی خود ہماری آنکھوں کے سامنے ہو رہی ہے۔ جدید بورژوا سماج نے گویا جادو کے زور سے پیداوار اور تبادلے کے عظیم‌الشان وسیلے کھڑے کر لئے ہیں۔ مگر پیداوار، تبادلہ اور ملکیت کے اپنے رشتوں سمیت اس سماج کی حالت اس شعبدہ گر کی سی ہے

جس نے اپنے جادو سے جناتی طاقتوں کو جگا تو لیا ہے مگر اب قابو میں نہیں رکھ سکتا۔ پچھلے بیسیوں برس سے صنعت اور تجارت کی تاریخ، جدید پیداواری قوتوں کی بغاوت کی تاریخ ہے، بغاوت جدید تعلقات پیداوار کے خلاف اور ملکیت کے ان رشتوں کے خلاف جو بورژوا طبقے اور اس کے اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے ضروری ہیں۔ اس سلسلے میں ان تجارتی بحرانوں کا ہی نام لینا کافی ہے جو برابر کچھ وقفے کے بعد لوٹ لوٹ کرآتے رہتے ہیں اور پورے بورژوا سماج کی زندگی کو ہر بار پہلے سے بھی بڑے خطرے میں ڈال دیتے ہیں۔ ان بحرانوں میں ہر بار صرف تیار مال کا ہی نہیں بلکہ پہلے کی بنی ہوئی پیداواری قوتوں کا بھی ایک بڑا حصہ برباد کردیا جاتا ہے۔ ان بحرانوں میں گویا ایک وبا سی پھیل جاتی ہے، فاضل پیداوار کی وبا، جو پہلے کے تمام زمانوں میں ایک ان‌ہونی سی بات معلوم ہوتی۔ سماج دفعتاً اپنے آپ کو کچھ دنوں کے لئے بربریت کے عالم میں پاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے قحط یا عالم گیر جنگ کی تباہ‌کاریوں نے تمام وسائل حیات کے دروازے بند کر دئے ہوں۔ صنعت‌وتجارت برباد ہوتی نظر آتی ہے۔ اور یہ کیوں؟ اس لئے کہ تمدن کی برکتوں کی افراط ہے، زندگی کے وسائل کی افراط ہے، صنعت کی افراط ہے، تجارت کی افراط ہے۔ سماج کے ہاتھ میں جو پیداواری قوتیں ہیں، ان سے اب بورژوا ملکیت کے نظام کی مزید ترقی میں کوئی مدد نہیں ملتی بلکہ اس کے برعکس وہ اتنی طاقتور ہو گئی ہیں کہ اس نظام کے سنبھالے نہیں سنبھلتیں۔ یہ نظام ان کے پیروں کی زنجیر بن جاتا ہے اور جوں ہی وہ ان زنجیروں پر قابو پاتی ہیں، پورے بورژوا سماج میں خلل پڑ جاتا ہے، بورژوا ملکیت کا وجود خطرے میں پڑجاتا ہے۔ بورژوا تعلقات کا دامن اتنا تنگ ہے کہ وہ خود اپنی پیدا کی ہوئی دولت بھی نہیں سنبھال سکتا۔ پھر بورژوا طبقہ ان بحرانوں پر قابو کیسے پاتا ہے؟ اس کے لئے ایک طرف پیداواری قوتوں کا بڑا حصہ زبردستی برباد کر دیا جاتا ہے، دوسری طرف، نئی منڈیوں پر قبضہ کیا جاتا ہے اور پرانی منڈیوں کا استحصال اور بھی زیادہ شدت سے کیا جاتا ہے۔

یعنی اور بھی زیادہ وسیع اور تباہ کن بحرانوں کے لئے راستہ صاف کیا جاتا ہے ، اور ان بحرانوں کو روکنے کے وسیلے اور کم کر دئیے جاتے ہیں۔

وہ ھتھیار جن سے بورژوا طبقے نے جاگیردار نظام کو زیر کیا تھا ، اب خود بورژوا طبقے کے خلاف اٹھائے جا رہے ہیں۔

لیکن بورژوا طبقے نے صرف وہ ھتھیار ھی نہیں ڈھالے جو اس کی موت کا پیغام لا رہے ہیں۔ وہ ان آدمیوں کو بھی وجود میں لے آیا ہے جو یہ ھتھیار اٹھائیں گے یعنی پرولتاریہ ، جدید مزدور طبقہ۔

جس نسبت سے بورژوا طبقے یعنی سرمائے کی ترقی ہوتی ہے ، اسی نسبت سے پرولتاریہ یعنی جدید مزدور طبقہ ترقی کرتا ہے جو زندہ اسی وقت تک رہ سکتا ہے جب تک اسے کام ملتا رہے اور کام اسی وقت تک ملتا ہے جب تک اس کی محنت سرمایہ کو بڑھاتی رہے۔ یہ مزدور ، جنہیں اپنے آپ کو فرداً فرداً بیچنا پڑتا ہے ، تجارت کی اور سب چیزوں کی طرح ایک جنس تبادلہ ہیں۔ لہٰذا یہ بھی مقابلے کے تمام ہیرپھیر اور منڈی کے تمام اتار چڑھاؤ کے رحم‌وکرم پر ہیں۔

مشینوں کے وسیع استعمال اور محنت کی تقسیم کی وجہ سے مزدوروں کا کام اپنی تمام انفرادی خصوصیت کھو چکا ہے اور اسی وجہ سے مزدور کے لئے اس میں کوئی دل کشی باقی نہیں رہی۔ وہ مشین کا دم‌چھلا بن کر رہ گیا ہے۔ اس کو اب صرف ایک ڈھب جاننا چاہئے جو نہایت سیدھی سادی ، نہایت اکتا دینے‌والی اور نہایت آسانی سے آنے والی چیز ہے۔ چنانچہ مزدور پر لاگت تقریباً تمام تر ان وسائل زندگی تک محدود ہے جو اس کے اپنے گذارے اور افزائش نسل کے لئے ضروری ہیں۔ لیکن کسی جنس کی قیمت اور اس لئے محنت کی قیمت (۱۳) بھی اس کی پیداوار کی لاگت کے برابر ہے۔ اس لئے کام جتنا زیادہ ناپسندیدہ ہوتا جاتا ہے ، اسی نسبت سے اجرت میں کمی ہوتی جاتی ہے۔ اور یہی نہیں بلکہ جس نسبت سے مشینوں کا استعمال اور محنت کی تقسیم بڑھتی ہے اسی نسبت سے مشقت کا بوجھ بڑھتا ہے ، چاہے وہ کام کے گھنٹے بڑھنے سے ہو ، مقررہ وقت میں زیادہ کام لینے کی وجہ سے ہو یا مشین کی رفتار تیز ہو جانے سے۔

جدید صنعت نے اہل حرفہ کے چھوٹے کارخانے کو صنعتی سرمایہ دار کی بڑی فیکٹری میں بدل دیا ہے، مزدوروں کے کثیر انبوہ کو فیکٹری میں جمع کر کے فوجی سپاہیوں کی طرح ان کی تنظیم کی ہے، افسروں اور حولداروں کا ایک پورا سلسلہ ہے جن کی کمان میں انہیں صنعتی فوج کے عام سپاہیوں کی طرح رکھا گیا ہے۔ وہ صرف بورژوا طبقے اور بورژوا ریاست کے غلام نہیں ہیں، وہ ہر دن اور ہر گھڑی مشین کی، نگران‌کار کی، اور سب سے بڑھ کر انفرادی طور پر کارخانے کے مالک بورژوا کی غلامی کرتے ہیں۔ یہ ظالمانہ نظام جس قدر کھلے‌بندوں نفع‌خوری کو اپنی غرض‌وغایت بناتا ہے، اسی قدر ذلیل، قابل‌نفرت اور تلخ تر ہوتا جاتا ہے۔

جسمانی محنت میں مہارت اور طاقت صرف کرنے کی ضرورت جس قدر کم ہوتی جاتی ہے یعنی دوسرے لفظوں میں جدید صنعت جتنی زیادہ ترقی کرتی ہے، اسی قدر عورتوں اور بچوں کا کام مردوں کی جگہ لیتا ہے۔ مزدور طبقے کے لئے عمر اور جنس کی بنا پر امتیاز قائم کرنے کا اب کوئی سماجی جواز باقی نہیں رہا۔ سب محنت کے آلۂ کار ہیں جن کی قیمت ان کی عمر اور جنس کے لحاظ سے بڑھتی گھٹتی رہتی ہے۔

جوں ہی کارخانہ‌دار کے ہاتھوں مزدور کا استحصال کچھ دیر کے لئے رکتا ہے اور اسے اپنی اجرت کے نقد پیسے ملتے ہیں، ویسے ہی بورژوا طبقے کے دوسرے حصے — مالک‌مکان، دکاندار، ساہوکار وغیرہ اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔

درمیانی طبقے کے نچلے حصے — چھوٹے کارخانہ دار، چھوٹے تاجر اور عموماً کاروبار چھوڑ بیٹھنے‌والے تاجر، دست‌کار اور کسان یہ سب گرتے گرتے پرولتاریہ میں جا ملتے ہیں، کچھ تو اس وجہ سے کہ جس پیمانے پر جدید صنعت چلائی جاتی ہے، اس کے‌لئے ان کا حقیر سرمایہ کفایت نہیں کرتا اور بڑے سرمایہ‌داروں کے مقابلے میں ان کی لٹیا ڈوب جاتی ہے، اور کچھ اس وجہ سے کہ ان کا مخصوص ہنر اب پیداوار کے نئے طریقوں کی بدولت کسی کام کا باقی نہیں رہتا۔ اس طرح آبادی کے ہر طبقے سے لوگ بھرتی ہوکر پرولتاریہ میں آتے رہتے ہیں۔

مزدور طبقه نشوونما کی کئی منزلوں سے گذرتا ہے۔ پیدا ہوتے ہی بورژوا طبقے سے اس کی جدوجہد شروع ہو جاتی ہے، شروع شروع میں کسی ایک بورژوا کے خلاف جو براہ راست ان کا استحصال کرتا ہے، اکے دکے مزدور مقابلے پر اترتے ہیں، پھر ایک فیکٹری میں کام کرنے والے اور اس کے بعد ایک علاقے میں ایک پوری صنعت کے مزدور۔ ان کے حملے کا رخ صرف بورژوا تعلقاتِ پیداوار کے خلاف نہیں بلکه خود آلات پیداوار کے خلاف ہوتا ہے۔ وہ باہر سے آئی ہوئی مصنوعات کو جو ان کی محنت سے مقابلہ کرتی ہیں، برباد کرنے لگتے ہیں۔ وہ مشینوں کو پاش پاش کر دیتے ہیں، کارخانوں میں آگ لگا دیتے ہیں اور عہدوسطی کے کاریگروں کے کھوئے ہوئے مرتبے کو زبردستی پھیر لانا چاہتے ہیں۔

اس وقت مزدور تتر بتر بھیڑ کی حالت میں سارے ملک میں بکھرے ہوتے ہیں۔ آپس کے مقابلے سے ان کا شیرازہ منتشر رہتا ہے۔ اگر کہیں کہیں وہ مل کر زیادہ گٹھی ہوئی جماعت بناتے ہیں تو یہ ابھی تک ان کے اپنے عملی اتحاد کا نتیجہ نہیں بلکه بورژوا طبقے کے اتحاد کا نتیجہ ہے۔ یہ طبقه خود اپنا سیاسی مقصد پورا کرنے کے لئے مجبور ہوتا ہے که پورے مزدور طبقے کو حرکت میں لائے اور اس میں اس وقت تک ایسا کرنے کی قدرت بھی ہوتی ہے۔ اس لئے اس مرحلے پر مزدور طبقه اپنے دشمنوں سے نہیں بلکه اپنے دشمنوں کے دشمنوں سے — مطلق العنان بادشاہت کی بچی کھچی نشانیوں سے، زمین داروں سے، غیر صنعتی بورژوا اور پیٹی بورژوا طبقے سے لڑتا ہے۔ غرضیکه تاریخ کی ساری حرکت کی باگ ڈور بورژوا طبقے کے ہاتھوں میں ہوتی ہے اور ان حالات میں جو فتح حاصل ہوتی ہے وہ بورژوا طبقے کی فتح ہوتی ہے۔

لیکن صنعت کی ترقی کے ساتھ مزدور طبقه صرف تعداد میں ہی نہیں بڑھتا بلکه وہ بڑی سے بڑی تعداد میں مرکوز ہونے لگتا ہے، اس کی طاقت بڑھتی ہے اور اسے روز بروز اپنی طاقت کا احساس ہونے لگتا ہے۔ جیسے جیسے مشین محنت کے تمام امتیازوں کو مٹاتی جاتی ہے اور تقریباً ہر جگه اجرتوں کو ایک ہی ادنی سطح پر لے آتی ہے،

اسی نسبت سے مزدور طبقے کی صفوں کے اندر مختلف مفاد اور زندگی کی مختلف حالتوں میں یکسانی پیدا ہوتی ہے۔ بورژوا طبقے میں بڑھتا ہوا مقابلہ اور اس کی بدولت تجارتی بحران، مزدوروں کی اجرتوں میں آئے دن اتار چڑھاؤ پیدا کرتے رہتے ہیں۔ مشینوں میں نت نئے سدھار اور ان کی تیز سے تیزتر ترقی کی وجہ سے مزدوروں کی روزی دن بدن خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ اکے دکے مزدوروں اور بورژوا لوگوں کی جھڑپیں روز بروز دو طبقوں کی ٹکر کی صورت اختیار کرتی جاتی ہیں اور تب بورژوازی کے خلاف مزدور اپنی انجمنیں (ٹریڈ یونینیں) بنانے لگتے ہیں۔ اجرت کی شرح کو قائم رکھنے کےلئے وہ آپس میں مل جاتے ہیں۔ اپنی وقتی بغاوتوں کےلئے پہلے سے بندوبست کرنے کی غرض سے وہ مستقل انجمنیں قائم کرتے ہیں۔ کہیں کہیں یہ ٹکر کھلی بغاوت کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

کبھی کبھار مزدوروں کی جیت ہوتی ہے مگر چند روزہ۔ ان کی جدوجہد کا اصلی پھل فوری کامیابیوں میں نہیں بلکہ مزدوروں کے دن‌بدن بڑھتے ہوئے اتحاد میں ہے۔ اس اتحاد کو آمدورفت کے ان ترقی یافتہ وسیلوں سے بڑی مدد ملتی ہے، جنہیں جدید صنعت نے جنم دیا ہے اور جن کی مدد سے مختلف جگہوں کے مزدوروں میں ربط پیدا ہوتا ہے۔ اور یہی ربط ہے جس کی سب سے زیادہ ضرورت تھی تاکہ تمام مقامی جدوجہد جن کی نوعیت سب جگہ ایک سی ہے، ایک مرکز پر لائی جا سکے اور اسے قومی‌پیمانے پر طبقاتی جدوجہد کی صورت دی جا سکے۔ لیکن ہر طبقاتی جدوجہد ایک سیاسی جدوجہد ہے۔ اور وہ اتحاد جسے حاصل کرنے کےلئے عہدوسطی کے شہریوں کو اپنی خستہ حال شاہراہوں کی وجہ سے صدیاں درکار تھیں، جدید مزدور طبقے نے ریلوں کی برکت سے چند برسوں میں قائم کر لیا ہے۔

ایک طبقے کی صورت میں اور اس کے نتیجے کے طور پر ایک سیاسی پارٹی میں مزدور طبقے کی یہ تنظیم خود مزدوروں کے آپس کے مقابلے کی بدولت برابر الٹتی رہتی ہے۔ لیکن ہر بار وہ پہلے سے زیادہ مضبوط، زیادہ پائدار اور زیادہ طاقتور ہوکر اٹھ کھڑی ہوتی ہے

اور خود بورژوا طبقے کے اندر کی پھوٹ سے فائدہ اٹھا کر وہ مزدوروں کے انفرادی مفاد قانون کی نظر میں تسلیم کرا لیتی ہے۔ چنانچہ انگلینڈ میں دس گھنٹے کام کا قانون اسی طرح منظور ہوا تھا۔

فی الجملہ پرانے سماج کے طبقوں کی آپس کی ٹکریں مزدور طبقے کی نشوونما میں کئی طرح سے مددگار ہوتی ہیں۔ بورژوا طبقہ اپنے آپ کو مسلسل جدوجہد میں مبتلا پاتا ہے: شروع میں طبقہ امرا کے خلاف، پھر بورژوا طبقے کے ان حصوں کے خلاف جن کے مفاد صنعت کی ترقی سے ٹکرانے لگتے ہیں، اور ساری بدیسی بورژوازی کے خلاف تو ہر زمانے میں۔ ان سب لڑائیوں میں وہ مجبور ہوتا ہے کہ مزدور طبقے سے اپیل کرے، اس سے مدد مانگے اور اس طرح اسے سیاست کے میدان میں کھینچ لائے۔ غرضیکہ خود بورژوا طبقہ پرولتاریہ کو اپنی سیاسی اور عام تعلیم کی مبادیات سے لیس کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ خود ہی پرولتاریہ کے ہاتھوں میں بورژوا طبقے سے لڑنے کے ہتھیار دے دیتا ہے۔

پھر ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ صنعت کی ترقی سے حکمراں طبقوں کے بعض پورے کے پورے گروہ تباہ ہو کر مزدور طبقے میں آملتے ہیں یا کم از کم ان کے حالات زندگی کے تباہ ہونے کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ان سے بھی مزدور طبقے کو روشن خیالی اور ترقی کی نئی مبادیات ملتی ہیں۔

بالآخر جب طبقاتی جدوجہد کے فیصلہ کن لمحے قریب آتے ہیں تو حکمراں طبقے کے اندر اور دراصل پورے پرانے سماج کے اندر انتشار کا یہ سلسلہ اتنی شدید اور نمایاں صورت اختیار کر لیتا ہے کہ حکمراں طبقے کا ایک مختصر گروہ اس سے ٹوٹ کر الگ ہو جاتا ہے اور انقلابی طبقے میں آملتا ہے، اس طبقے میں جس کے ہاتھ میں مستقبل کی باگ ڈور ہے۔ جس طرح اس سے پہلے دور میں طبقہ امرا کا ایک حصہ بورژوا طبقے سے آملا تھا اسی طرح آج بورژوا طبقے کا ایک حصہ پرولتاری طبقے کا ساتھ اختیار کرتا ہے، اور خاص کر بورژوا اہل فکر کا وہ حصہ جو اس بلندی پر پہنچ گیا ہے کہ بحیثیت مجموعی پورے تاریخی ارتقا کو نظریاتی طور سے سمجھ سکے۔

بورژوا طبقے کے روبرو اس وقت جتنے طبقے کھڑے ہیں، ان سب میں ایک پرولتاریہ ہی حقیقت میں انقلابی ہے۔ دوسرے طبقے جدید صنعت کے مقابلے میں زوال پذیر اور بالآخر ناپید ہوتے جاتے ہیں۔ پرولتاریہ اس کی مخصوص اور لازمی پیداوار ہے۔

درمیانی پرت: چھوٹے کارخانہ دار، دکاندار، دست کار، کسان یہ سب ہی بورژوا طبقے سے لڑتے ہیں تا کہ درمیانی پرت کی حیثیت سے اپنی ہستی کو مٹنے سے بچائیں۔ اس لئے وہ انقلابی نہیں قدامت پرست ہیں۔ اتنا ہی نہیں، وہ رجعت پرست بھی ہیں کیونکہ وہ تاریخ کی گنگا کو الٹا بہانا چاہتے ہیں۔ اگر کبھی وہ انقلابی بنتے ہیں تو صرف یہی دیکھ کر کہ ان کے لئے پرولتاریہ کے ساتھ ملنے کی گھڑی قریب آپہنچی ہے، یوں وہ اپنے حال کے نہیں، مستقبل کے مفاد کی حفاظت کرتے ہیں کہ پرولتاریہ کے نقطۂ نظر پر پہنچنے کے لئے خود اپنے نقطۂ نظر سے دست بردار ہو جاتے ہیں۔

ہو سکتا ہے کہ وہ lumpen proletariat *، وہ پڑی پڑی سڑنے والی پیداوار جسے پرانے سماج کی سب سے نچلی تہیں چھوڑ گئی ہیں، کہیں کہیں پرولتاری انقلاب کی تحریک کے بہاؤ میں آجائے۔ لیکن اس کی زندگی کے حالات ایسے ہیں کہ اس میں رجعت پرستوں کی سانٹھ گانٹھ میں بھاڑے کا ٹٹو بننے کا رجحان زیادہ ہوتا ہے۔

پرولتاریہ کے حالات زندگی میں پرانے سماج کے حالات زندگی ختم ہو جاتے ہیں۔ پرولتاری کی کوئی ملکیت نہیں۔ اپنے بیوی بچوں سے اس کے تعلقات میں اور بورژوا خانگی زندگی میں اب کوئی چیز مشترک نہیں رہتی۔ جدید صنعتی محنت نے، سرمائے کی جدید غلامی نے جو انگلینڈ اور فرانس میں، امریکہ اور جرمنی میں سب جگہ ایک ہے، اس سے قومی کردار کی ہر نشانی چھین لی ہے۔ قانون، اخلاق، مذہب سب اس کے لئے بورژوا طبقے کے ڈھکو سلے سے زیادہ نہیں ہیں

---

* سرمایہ دارانہ سماج میں طبقات سے ٹوٹی ہوئی تہہ جو پیداواری عوامل سے نکالے ہوئے لوگوں (بھک منگوں، آوارہ گردوں، رنڈیوں اور مجرموں وغیرہ) پر مشتمل ہوتی تھی۔

جن میں ایک ایک کے پیچھے بورژوا مفاد گھات لگائے بیٹھے ہیں۔
پہلے کے تمام طبقوں نے جب کبھی غلبہ پایا تو اپنے حاصل کئے ہوئے مرتبے کو پائدار بنانے کےلئے پورے سماج کو اپنے نظام تصرف کے تابع کر دینا چاہا۔ پرولتاری جب تک خود اپنے سابقہ طریقۂ تصرف کو اور اس طرح تصرف کے ہر سابقہ طریقے کو منسوخ نہ کر ڈالیں، سماج کی پیداواری قوتوں کے مالک نہیں بن سکتے۔ ان کا اپنا کچھ نہیں جسے قائم رکھنا ہو اور جس کی حفاظت کرنی ہو۔ ان کا منصب ذاتی ملکیت کے جملہ سابقہ تحفظات اور ضمانتوں کو مٹانا ہے۔

پہلے کی تمام تاریخی تحریکیں اقلیتوں کی تحریکیں تھیں یا اقلیتوں کے حق میں تھیں۔ مزدور تحریک بہت بڑی اکثریت کے حق میں، بہت بڑی اکثریت کے مفادات کےلئے آزاد تحریک ہے۔ پرولتاریہ موجودہ سماج میں سب سے نیچے درجے پر ہے اور جب تک مروجہ سماج کے بالائی پرتوں کے تمام تاروپود نہ بکھیر دئے جائیں، وہ نہ تو جنبش کر سکتا ہے اور نہ سر اٹھا سکتا ہے۔
بورژوا طبقے کے خلاف پرولتاریہ کی جدوجہد معنوی اعتبار سے تو نہیں، مگر اپنی صورت میں شروع شروع میں ایک قومی جدوجہد ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر ملک کے پرولتاریہ کو سب سے پہلے اپنے ہی بورژوا طبقے سے نبٹنا پڑتا ہے۔
پرولتاریہ کی نشوونما کے بالکل عام مدارج بیان کرتے ہوئے ہم نے اس خانہ‌جنگی کا خاکہ کھینچا تھا جو موجودہ سماج میں کسی قدر پوشیدہ طور پر زوروشور سے جاری ہے۔ حتی کہ ایک منزل ایسی آتی ہے جبکہ یہ جنگ کھلم کھلا انقلاب کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور بورژوا طبقے کا تختہ زبردستی' الٹ کر پرولتاریہ کے اقتدار کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔

ہم نے دیکھا کہ آج تک ہر سماج کی بنیاد ظالم اور مظلوم طبقوں کے تصادم پر رہی ہے۔ لیکن کسی طبقے پر ظلم کرنے کےلئے بھی ایسے حالات مہیا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے جن میں طبقہ کم از

کم اپنی غلامانہ زندگی کو برقرار رکھ سکے۔ زرعی غلامی کے زمانے میں زرعی غلام بڑھتے بڑھتے کمیون کا رکن بنا، ٹھیک اسی طرح جیسے پیٹی بورژوا آدمی جاگیردارانہ مطلق العنانی کے جوئے تلے ترقی کر کے بورژوا بن گیا۔ اس کے برعکس جدید مزدور صنعت کے فروغ کے ساتھ اوپر اٹھنے کے بجائے اپنے طبقے کے موجودہ معیارزندگی سے بھی نیچے گرتا جا رہا ہے۔ وہ نادار ہوتا جاتا ہے اور ناداری، آبادی اور دولت دونوں سے زیادہ تیزی سے بڑھتی ہے۔ اور اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ بورژوا طبقہ اب اس قابل نہیں رہا کہ سماج پر حکمرانی کر سکے اور اپنے طبقے کے حالات‌زندگی کو ہمہ گیر قانون کا درجہ دے کر پورے سماج پر چسپاں کر سکے۔ وہ حکومت کرنے کا اہل نہیں رہا کیونکہ وہ اپنے غلاموں کو اپنی غلامی میں بھی زندگی کی ضمانت نہیں دے سکتا، کیونکہ وہ انہیں اس قدر نیچے گرنے سے نہیں روک سکتا کہ ان سے روزی حاصل کرنے کے بجائے اسے خود انہیں روٹی دینی پڑتی ہے۔ سماج اب اس بورژوا طبقے کے تحت نہیں رہ سکتا۔ دوسرے لفظوں میں اب اس کے وجود کو سماج کے ساتھ کوئی مطابقت نہیں رہی۔

بورژوا طبقے کے وجود اور اقتدار کی لازمی شرط یہ ہے کہ سرمایہ برابر بنتا اور بڑھتا رہے۔ سرمائے کے وجود کےلئے اجرتی محنت شرط ہے۔ اجرتی محنت خصوصاً تمام تر مزدوروں کے آپس کے مقابلے پر منحصر ہے۔ صنعت کی ترقی سے جس کو بورژوا طبقے کے ہاتھوں بلا ارادہ فروغ ہوتا ہے مزدوروں کی ایک دوسرے سے علحدگی دور ہوتی ہے، جو باہمی مقابلے کا نتیجہ تھی اور اس کے بجائے ساتھ کام کرنے کی وجہ سے ان میں انقلابی ایکا پیدا ہونے لگتا ہے۔ غرضکہ جدید صنعت کی ترقی سے وہ بنیاد ہی غارت ہو جاتی ہے جس پر بورژوا طبقہ مال پیدا کرتا اور اس کو تصرف میں لاتا ہے۔ لہذا بورژوا طبقے نے سب سے بڑھ کر، جن کو پیدا کیا وہ اس کی اپنی قبر کھودنے والے ہیں۔ اس کا زوال اور پرولتاریہ کی فتح لازمی ہے۔

۲- پرولتاریہ اور کمیونسٹ

بحیثیت مجموعی پرولتاریوں سے کمیونسٹوں کا کیا تعلق ہے؟

کمیونسٹ، مزدور طبقے کی دوسری پارٹیوں کے خلاف کوئی الگ پارٹی نہیں بناتے۔

بحیثیت مجموعی پرولتاری طبقے کے مفاد کے سوا اور اس سے جدا ان کا کوئی مفاد نہیں۔

وہ اپنے جداگانہ فرقہ‌پرور اصول قائم نہیں کرتے، جس سے مزدور تحریک کو کوئی خاص شکل دی جائے اور کسی خاص سانچے میں ڈھالا جائے۔

کمیونسٹوں کا امتیاز مزدور طبقے کی دوسری پارٹیوں سے صرف یہ ہے کہ (۱) مختلف ملکوں کے مزدوروں کی قومی جدوجہد میں وہ بلا امتیاز قومیت پورے مزدور طبقے کے مشترک مفاد پر زور دیتے اور ان کو نمایاں کرتے ہیں۔ (۲) بورژوا طبقے کے خلاف مزدور طبقے کی جدوجہد اپنی نشو و نما کے جن مرحلوں سے گذرتی ہے ان میں وہ ہر جگہ اور ہمیشہ بحیثیت مجموعی پوری تحریک کے مفاد کی ترجمانی کرتے ہیں۔

چنانچہ ایک طرف جہاں تک عمل کا تعلق ہے، کمیونسٹ ہر ملک کی مزدور پارٹیوں میں سب سے اگوا اور ثابت‌قدم دستہ ہیں، وہ دستہ جو ہمیشہ اوروں کو آگے بڑھاتا چلتا ہے، اور دوسری طرف جہاں تک نظریے کا تعلق ہے، عام مزدوروں پر ان کو فوقیت یہ ہے کہ وہ مزدور تحریک کا آگے بڑھنے کا راستہ پہچانتے ہیں، اس کے حالات اور آخری عام نتیجوں کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔

کمیونسٹوں کا فوری مقصد وہی ہے جو مزدوروں کی سبھی دوسری پارٹیوں کا، یعنی یہ کہ مزدوروں کا ایک طبقہ بنے، بورژوا طبقے کا غلبہ ختم کیا جائے اور پرولتاریہ سیاسی اقتدار پر قبضہ کرے۔

کمیونسٹوں کے نظریاتی نتیجے ہرگز کسی ایسے خیالات یا اصولوں پر مبنی نہیں ہیں جنہیں کسی عالم گیر اصلاح کا خواب

دیکھنے والے مصلح نے کھوج نکالا ہو یا جو اس کے دماغ کی اپج ہوں۔

وہ تو فقط ان حقیقی تعلقات کو عام الفاظ میں پیش کرتے ہیں جو موجودہ طبقاتی جدوجہد سے پیدا ہوتے ہیں، ایک ایسی تاریخی تحریک سے، جو ہماری آنکھوں کے سامنے جاری ہے۔ ملکیت کے مروجہ تعلقات کو مٹانا کمیونزم کی کوئی امتیازی صفت نہیں ہے۔

گذشتہ زمانے میں تاریخی حالات کے بدلنے پر ملکیت کے سارے تعلقات میں برابر تاریخی ردوبدل ہوتا رہا ہے۔

مثلاً انقلاب فرانس نے (۱۴) بورژوا ملکیت کے حق میں جاگیردار ملکیت کو مٹا دیا۔

کمیونزم کی امتیازی صفت عام طور پر ملکیت کو نہیں بلکہ بورژوا ملکیت کو مٹانا ہے۔

لیکن جدید بورژوا ذاتی ملکیت مال کو پیدا کرنے اور تصرف میں لانے کے اس نظام کا آخری اور سب سے مکمل اظہار ہے جو طبقاتی اختلافات اور چند لوگوں کے ہاتھوں اکثریت کے استحصال پر مبنی ہے۔

ان معنوں میں کہا جا سکتا ہے کہ کمیونسٹوں کا نظریہ، مختصر لفظوں میں، ذاتی ملکیت کو مٹانا ہے۔

ہم کمیونسٹوں پر الزام ہے کہ ہم انسان کی نجی محنت سے انفرادی ملکیت حاصل کرنے کا حق چھین لینا چاہتے ہیں، حالانکہ کہا جاتا ہے کہ یہی ملکیت تمام شخصی آزادی، سرگرمی اور خودمختاری کی بنیاد ہے۔

گاڑھے پسینے کی کمائی، اپنے دست وبازو سے پیدا کی ہوئی ملکیت! کیا آپ کی مراد چھوٹے دست کار اور چھوٹے کسان کی ملکیت سے ہے، جو بورژوا ملکیت سے پہلے ملکیت کی صورت تھی؟ اسے مٹانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ صنعت کی ترقی بڑی حد تک اسے مٹا چکی ہے اور آئے دن مٹاتی جاتی ہے۔

یا شاید آپ کی مراد جدید بورژوا ذاتی ملکیت سے ہے؟

لیکن کیا اجرتی محنت نے، مزدور کی محنت نے اس کے لئے کوئی ملکیت پیدا کی ہے؟ بالکل نہیں۔ اس سے صرف سرمایہ پیدا ہوتا ہے،

اور یہ وہ ملکیت ہے جو اجرتی محنت کا استحصال کرتی ہے اور جس کے بڑھنے کی واحد شرط یہ ہے کہ مزید استحصال کے لئے برابر اجرتی محنت مہیا ہوتی رہے۔ یہ ملکیت اپنی موجودہ صورت میں سرمایہ اور اجرتی محنت کے تصادم پر مبنی ہے۔ آئیے ہم اس تصادم کے دونوں پہلوؤں پر غور کریں۔

سرمایہ‌دار ہونے کا مطلب پیداوار میں محض ذاتی نہیں بلکہ سماجی حیثیت کا مالک ہونا ہے۔ سرمایہ اجتماعی پیداوار ہے اور بہت سے آدمیوں کی متحدہ کوششوں سے بلکہ آخر تک نگاہ دوڑائیے تو سماج کے تمام ممبروں کی متحدہ کوششوں سے ہی اسے حرکت میں لایا جا سکتا ہے۔

اس لئے سرمایہ کوئی شخصی نہیں بلکہ سماجی طاقت ہے۔

لہذا سرمایہ کو جب مشترکہ ملکیت یعنی سماج کے تمام ممبروں کی ملکیت بنایا جاتا ہے تو اس سے انفرادی ملکیت سماجی ملکیت میں نہیں بدلتی، صرف ملکیت کی سماجی حیثیت بدل جاتی ہے۔ اس کی طبقاتی حیثیت ختم ہو جاتی ہے۔

اب ہم اجرتی محنت پر نظر ڈالیں۔

اجرتی محنت کی اوسط قیمت کم سے کم اجرت ہی ہے اور اس میں نان‌نفقہ کی صرف اتنی ہی مقدار شامل ہے جو مزدور کو مزدور بنا کر کسی طرح زندہ رکھنے کے لئے قطعی ضروری ہے۔ چنانچہ‌اجرت پر کام کرنے والا مزدور اپنی محنت کے ذریعہ جو کچھ تصرف میں لاتا ہے وہ محض اسے زندہ رکھنے کےلئے کافی ہوتا ہے۔ ہمارا یہ منشا ہرگز نہیں ہے کہ محنت کی پیداوار کو ذاتی تصرف میں لانے کا یہ سلسلہ بند کردیں۔ اس تصرف کا مقصد زندگی کوقائم رکھنا ہے۔ اور اس میں فاضل کچھ بچتا ہی نہیں جس کے بل پر دوسروں کی محنت قابو میں لائی جا سکے۔ ہم مٹانا چاہتے ہیں محض اس تصرف کی نا گفتہ‌بہ حالت کو جس کے تحت مزدور زندہ رہتا ہے فقط سرمایہ کو بڑھانے کےلئے، اور اس کو زندہ رہنے دیا جاتا ہے جب تک حکمراں طبقے کے مفاد کو اس کی ضرورت ہوتی ہے۔

بورژوا سماج میں زندہ محنت محض ایک ذریعہ ہے جمع کی ہوئی

محنت کو بڑھانے کا۔ کمیونسٹ سماج میں جمع کی ہوئی محنت ایک ذریعہ ہوگی جس سے مزدور کی زندگی میں نئی وسعتیں پیدا کی جائیں‌گی، اسے زیادہ پرمسرت بنایا جائے گا اور ترقی دی جائے گی۔

مختصر یہ کہ بورژوا سماج میں حال پر ماضی حاوی ہے۔ کمیونسٹ سماج میں ماضی پر حال حاوی ہوگا۔ بورژوا سماج میں سرمایہ آزادہے اور اس کی اپنی انفرادی ہستی ہے۔ یہاں زندہ انسان محکوم ہے، اس کی کوئی ہستی نہیں۔

اور اس صورت‌حال کاسٹ جانا، بورژوا طبقے کی زبان میں، انفرادیت اور آزادی کا مٹ‌جانا ہے! اور بات‌ٹھیک ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارا مقصد بورژوا انفرادیت، بورژوا خودمختاری اور بورژوا آزادی کو مٹا دینا ہے۔

پیداوار کی موجودہ بورژوا حالتوں میں آزادی کا مطلب ہے تجارت کی آزادی، بیچنے اور خریدنے کی آزادی۔

لیکن اگر خریدوفروخت نہ رہے تو خریدوفروخت کی آزادی بھی نہیں رہےگی۔ خریدوفروخت کی آزادی کی یہ باتیں اور عموماً آزادی کے بارے میں ہمارے بورژوا طبقے کے یہ تمام ”بڑے بڑے بول“، اگر کوئی معنی رکھتے ہیں تو صرف پابند خریدوفروخت اور عہدوسطی کے مظلوم تاجروں کے مقابلے میں، مگر کمیونزم کے مقابلے میں، جبکہ خرید و فروخت اور تجارت مٹ جائے گی، پیداوار کے بورژوا تعلقات اور خود بورژوا طبقہ مٹ جائےگا، یہ باتیں کوئی معنی نہیں رکھتیں۔

آپ حواس‌باختہ ہیں کہ ہم ذاتی ملکیت کو مٹانے کے درپے ہیں۔ لیکن آپ کے موجودہ سماج میں دس میں نو آدمیوں کےلئے ذاتی ملکیت پہلے ہی مٹ چکی ہے۔ اور تھوڑے سے آدمیوں کےلئے جو رہ گئی ہے تو اسی وجہ سے کہ دس میں نو اس سے محروم ہیں۔ آپ کے الزام کا مطلب یہ ہے کہ ہم ملکیت کی وہ صورت مٹا دینا چاہتے ہیں جس کے قائم رکھنے کی ضروری شرط ہی یہ ہے کہ سماج کی بہت بڑی اکثریت کے پاس کوئی ملکیت نہ ہو۔

مختصر یہ کہ آپ کو شکایت ہے کہ ہم آپ کی ملکیت مٹا دینا چاہتے ہیں۔ بجا ہے۔ ہمارا بالکل یہی ارادہ ہے۔

جس دن سے محنت کو سرمایہ ، زر ، یا لگان میں نہیں بدلا جا سکے گا ، اسے ایسی سماجی قوت کی شکل نہیں دی جا سکے گی ، جسے کوئی اپنا اجارہ بنا سکے ، یعنی جس دن سے انفرادی ملکیت بورژوا ملکیت میں ، سرمایہ میں تبدیل نہیں ہو سکے گی ، اس دن سے آپ کا خیال ہے انفرادیت ناپید ہو جائے گی۔

پھر تو آپ کو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ''فرد'' سے آپ کا مطلب ہر شخص نہیں ، صرف بورژوا ہے ، درمیانی طبقے کا صاحب جائداد شخص ۔ اور بلاشبہ اس شخص کو ختم کر دینا چاہئے۔

سماج کی پیداوار کو اپنے تصرف میں لانے کے حق سے کمیونزم کسی انسان کو محروم نہیں کرتا ۔ وہ انسان کو صرف اس اختیار سے محروم کرنا چاہتا ہے جس کی بدولت وہ اس تصرف کے ذریعہ دوسروں کی محنت کو اپنا غلام بناتا ہے ۔ ....

اعتراض کیا جاتا ہے کہ ذاتی ملکیت کے مٹتے ہی سارے کام کاج بند ہو جائیں گے اور ہر آدمی پر کاہلی سوار ہو جائے گی۔

اس اعتبار سے تو بورژوا سماج کو محض کاہلی کے ہاتھوں آج سے بہت پہلے فنا کے گھاٹ اترجانا چاہئے تھا کیونکہ اس سماج میں جو لوگ کام کرتے ہیں ، انہیں کچھ نہیں ملتا اور جنہیں ملتا ہے وہ کام نہیں کرتے ۔ یہ اعتراض اسی بات کو دوسرے لفظوں میں دہراتا ہے کہ سرمایہ نہیں رہے گا تو اجرتی محنت بھی نہیں رہے گی۔

مادی پیداوار کے کمیونسٹ طریقۂ پیدائش اور تصرف کے خلاف یہ تمام اعتراضات اسی طرح سے ، ذہنی پیداوار کے کمیونسٹ طریقۂ پیدائش اور تصرف کے خلاف پیش کئے گئے ہیں ۔ بورژوا کی نظر میں جس طرح طبقاتی ملکیت کا مٹنا سرے سے پیداوار کا مٹ جانا ہے ، اسی طرح طبقاتی تہذیب کا مٹ جانا ، ان کے خیال میں ساری تہذیب کا مٹ جانا ہے۔

وہ تہذیب جس کے مٹنے پر وہ آنسو بہاتے ہیں، انسان کی بہت بڑی اکثریت کو محض مشین کی طرح حرکت کرنا سکھاتی ہے ۔

بورژوا ملکیت کو مٹانے کی ہماری تجویز کو اگر آپ آزادی ، تہذیب ، قانون وغیرہ کے بورژوا تصورات کی کسوٹی پر پرکھنا

چاہتے ہیں تو ہم سے بحث میں الجھنے کی ضرورت نہیں ۔ آپ کے خیالات بجائے خود بورژوا پیداوار اور بورژوا ملکیت کے تعلقات کا نتیجہ ہیں ، اسی طرح جیسے آپ کا فلسفہ قانون اس کے سوا کچھ نہیں کہ آپ کے طبقے کی مرضی کو سب کے لئے قانون بنادیا گیا اور وہ مرضی ایسی ہے جس کی اصل نوعیت اور میلان آپ کے طبقے کے اقتصادی حالات زندگی سے متعین ہوا ہے ۔

یہ خودغرض غلط خیالی جو آپ کو ترغیب دیتی ہے کہ آپ اپنے پیداواری تعلقات اور ملکیت کے رشتوں کو ، جو تاریخی ہیں اور پیداوار کی ترقی کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں قدرت اور عقل کے ابدی قوانین میں ڈھالیں ، یہ ایسی غلط خیالی ہے جس میں آپ بھی پہلے کے تمام حکمراں اور فنا ہو جانے والے طبقوں کی طرح مبتلا ہیں ۔ قدیم ملکیت کے سلسلے میں آپ جو کچھ صاف دیکھتے ہیں ، جاگیردار ملکیت کے بارے میں آپ جس بات کو مانتے ہیں ، وہی باتیں آپ ملکیت کی اپنی بورژوا صورت کے بارے میں ماننے سے معذور ہیں ۔

خاندان کا نام و نشان مٹا دیا جائے ! بڑے سے بڑے انتہاپسند بھی کمیونسٹوں کی اس شرمناک تجویز پر آگ بگولہ ہو جاتے ہیں ۔

موجودہ زمانے کا خاندان ، بورژوا خاندان آخر کس بنیاد پر قائم ہے ؟ سرمایہ پر ، ذاتی منافع پر ۔ اپنی مکمل ترین صورت میں یہ خاندان صرف بورژوا طبقے میں پایا جاتا ہے ۔ لیکن اس تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ ایک طرف مزدور بے خاندان رہنے پر مجبور ہیں اور سربازار عصمت فروشی ہوتی ہے ۔

بورژوا خاندان کا یہ پہلو جب نہیں رہے گا تو وہ خاندان آپ ہی آپ مٹ جائے گا اور سرمایہ کے مٹتے ہی دونوں مٹ جائیں گے ۔

کیا آپ کا الزام ہے کہ ہم ماں باپ کو اپنے بچوں کے استحصال سے روکنا چاہتے ہیں ؟ ہم اپنا یہ جرم مانتے ہیں ۔

لیکن آپ کہیں گے کہ ہم سب سے قابل احترام رشتوں کو برباد کرنے کے درپے ہیں ، کیونکہ ہم گھریلو تعلیم کی جگہ سماجی تعلیم جاری کرنا چاہتے ہیں ۔

اور آپ کی تعلیم ؟ کیا وہ بھی سماجی نہیں ؟ کیا وہ بھی ان سماجی

حالات سے متعین نہیں ہوتی جن میں آپ وہ تعلیم دیتے ہیں ؟ کیا اس میں بھی اسکول وغیرہ کے ذریعہ سماج کی براہ‌راست یا بالواسطہ دست‌اندازی نہیں ہوتی ؟ تعلیم میں سماج کی مداخلت کمیونسٹوں نے ایجاد نہیں کی ۔ وہ صرف اس مداخلت کی نوعیت کو بدلنا اور تعلیم کو حکمراں طبقے کے اثر سے آزاد کرانا چاہتے ہیں ۔

خاندان اور تعلیم کے بارے میں ، ماں باپ اور بچوں کے مقدس رشتے کے بارے میں بورژوا شوروغوغا اسی قدر نفرت‌انگیز ہوتا جاتا ہے جس قدر جدید صنعت کے اثر سے مزدوروں میں تمام خاندانی بندھن ٹوٹتے جاتے ہیں اور ان کے بچے تجارت کی جنس اور محنت کا اوزار بنتے جاتے ہیں ۔

لیکن پورا بورژوا طبقہ ایک آواز سے چیخ اٹھتا ہے کہ تم کمیونسٹ تو عورتوں کو بھی ساجھے کی ملکیت بنا دوگے ۔

بورژوا کی نظر میں اس کی بیوی کی حیثیت بھی پیداوار کے ایک آلے سے زیادہ نہیں ۔ پھر جب وہ سنتا ہے کہ آلات‌پیداوار کا استحصال ساجھے میں کیا جائےگا تو قدرتاً اس کے سوا کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا کہ عورتوں کا بھی یہی حشر ہوگا ۔

اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی کہ اصل مقصد عورتوں کی اس حیثیت کا خاتمہ کرنا ہے جس میں وہ صرف پیداوار کا آلہ بن کر رہ گئی ہیں ۔

پھر اس سے بڑھ کر مضحکہ‌خیز بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہمارے بورژوا پاک دامنی کے جوش میں عورتوں کی ساجھے داری پر ناک بھوں چڑھائیں اور ظاہر یہ کریں کہ کمیونسٹ کھلے بندوں اور قانوناً اس کو رائج کریں‌گے ۔ کمیونسٹوں کو کیا پڑی ہے کہ عورتوں کی ساجھے‌داری کو رائج کریں ، اس کا رواج تو بہت پرانے زمانے سے چلا آتا ہے ۔

زنان بازاری کا تو کہنا ہی کیا ، جب اپنے مزدوروں کی بہو بیٹیوں سے بھی جی نہیں بھرتا تو ہمارے بورژوا ایک دوسرے کی بیویوں سے ناجائز تعلق قائم کرکے انتہائی مسرت حاصل کرتے ہیں ۔

بورژوا شادی دراصل ساجھے میں بیویاں رکھنے کا دستور ہے اور اس لئے کمیونسٹوں پر بفرض محال بڑے سے بڑا الزام کوئی ہو سکتا ہے تو یہی کہ وہ اس منافقت بھری اور پوشیدہ ساجھے داری کے بدلے عورتوں کی علانیہ قانونی ساجھےداری قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اور اصل حقیقت ظاہر ہے کہ جب موجودہ تعلقات‌پیداوار مٹینگے تو اس کے ساتھ عورتوں کو ساجھے میں رکھنے کا دستور یعنی بازاری یا خانگی عصمت‌فروشی بھی، جو ان تعلقات کا نتیجہ ہے، مٹ جائے گی۔

پھر کمیونسٹوں پر ایک الزام یہ ہے کہ وہ وطن اور قومیت کو مٹا دینا چاہتے ہیں۔

مزدوروں کا کوئی وطن نہیں۔ اور جو ان کے پاس ہے نہیں اسے ان سے کون چھین سکتا ہے؟ مزدور طبقے کو چونکہ سب سے پہلے سیاسی اقتدار حاصل کرنا ہے، ترقی کرکے قوم کا ہراول طبقہ بننا ہے، بلکہ خود قوم بننا ہے اس‌لئے اس حد تک وہ خود قومی ہے۔ مگر اس لفظ کا وہ مفہوم نہیں جو بورژوا سمجھتے ہیں۔

بورژوا طبقے کی نشوونما، تجارت کی آزادی، عالم گیر منڈی، طریقۂ پیداوار اور اس سے متعلقہ حالات‌زندگی دونوں کی یکسانیت روزبروز قومی امتیاز اور اختلافات کو مٹاتی جاتی ہے۔

پرولتاریہ کا اقتدار قائم ہونے پر وہ اور تیزی سے مٹنے لگیں گے۔ پرولتاریہ کی آزادی کی پہلی شرط یہ ہے کہ کم از کم تمام ترقی‌یافتہ مہذب ملک ساتھ مل کر قدم اٹھائیں۔

ایک قوم کے ہاتھوں دوسری قوم کا استحصال اسی نسبت سے ختم ہوگا جس نسبت سے ایک فرد کے ہاتھوں دوسرے فرد کا استحصال۔

جتنی تیزی سے قوم کے اندر طبقوں کا اختلاف دور ہوگا اتنی ہی تیزی سے ایک قوم سے دوسری قوم کی دشمنی دور ہوگی۔

کمیونزم پر مذہبی، فلسفیانہ اور عموماً نظریاتی نقطۂ نظر سے جو اعتراض کئے جاتے ہیں، وہ اس قابل نہیں کہ ان پر سنجیدگی سے غور کیا جائے۔

کیا یہ سمجھنے کےلئے غیرمعمولی بصیرت کی ضرورت ہے کہ آدمی کی مادی زندگی کی حالتوں، اس کے سماجی رشتوں اور اس کی سماجی

زندگی میں جب کبھی تبدیلی ہوتی ہے تو اس کے ساتھ آدمی کے خیالات، تصورات اور نظریے، مختصر یہ کہ آدمی کا شعور بدل جاتا ہے؟

خیالات کی تاریخ نے اس کے سوا اور ثابت ہی کیا کیا ہے کہ جس نسبت سے مادی پیداوار میں تبدیلی ہوتی ہے اسی نسبت سے ذہنی پیداوار کی نوعیت بدلتی ہے؟ ہر عہد میں فرمان‌روائی انہیں خیالات کی رہی جو فرمان روا طبقے کے خیالات تھے۔

لوگ جب ایسے خیالات کا ذکر کرتے ہیں جن سے سماج میں انقلاب آتا ہے تو وہ صرف اس حقیقت کا اظہار کرتے ہیں کہ پرانے سماج کے اندر ایک نئے سماج کے عناصر پیدا کئے گئے ہیں اور پرانے حالات زندگی کے ساتھ ہر ہر قدم پر پرانے خیالات بھی مٹتے جاتے ہیں۔

قدیم دنیا جب آخری ہچکیاں لے رہی تھی اس وقت قدیم مذہبوں پر عیسائیت نے غلبہ پا لیا۔ اور اٹھارھویں صدی میں جب عقلی خیالات کے سامنے عیسائی خیالات نے ہتھیار رکھ دئے، اس وقت جاگیردار سماج اپنے زمانے کے انقلابی بورژوا طبقے سے زندگی کی بازی ہار چکا تھا۔ مذہبی آزادی اور ضمیر کی آزادی کے یہ خیالات صرف یہ ظاہر کر رہے تھے کہ علم کی دنیا میں آزاد مقابلے کا راج قائم ہو چکا ہے۔

کہا جائے گا کہ "بلاشبہ تاریخی نشوونما کے دوران میں مذہبی، اخلاقی، فلسفیانہ، سیاسی اور قانونی خیالات میں ترمیم ہوتی رہی ہے۔ لیکن مذہب، اخلاق، فلسفہ، علم‌سیاست اور قانون ان تبدیلیوں کے باوجود ہمیشہ قائم رہے۔

"پھر ان کے علاوہ کچھ ابدی صداقتیں بھی ہیں جیسے آزادی، انصاف وغیرہ اور یہ سماج کی تمام منزلوں میں مشترک ہیں۔ لیکن کمیونزم تمام ابدی صداقتوں کا منکر ہے۔ وہ سرے سے مذہب اور اخلاق کو مٹا دیتا ہے، یہ نہیں کہ انہیں کسی نئی بنیاد پر مرتب کرتا ہو۔ اور اس لئے کمیونزم تمام پچھلے تاریخی تجربے کے خلاف قدم اٹھا رہا ہے"۔

اس الزام کے معنی کیا ہیں؟ تمام پچھلے سماج کی تاریخ، طبقاتی اختلافات کی نشوونما کی تاریخ ہے۔ ان اختلافات نے مختلف زمانوں میں مختلف صورتیں اختیار کیں۔

لیکن ان کی صورت کچھ بھی رہی ہو ، ایک خصوصیت تمام پچھلی صدیوں میں مشترک رہی اور وہ ہے سماج کے ایک حصے کے ہاتھوں دوسرے کا استحصال ۔ چنانچہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ پچھلی صدیوں کا سماجی شعور اپنی رنگا رنگی اور گونا گونی کے باوجود بعض مشترک صورتوں ، شعور کی صورتوں میں ارتقا کرتا رہا ہے اور یہ اس وقت تک پوری طرح نہیں مٹ سکتیں جب تک کہ خود طبقاتی اختلافات بالکل دور نہ ہو جائیں ۔

کمیونسٹ انقلاب ملکیت کے روائتی تعلقات پر سب سے کاری ضرب ہے ۔ چنانچہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ اس کی نشوونما کی لپیٹ میں آ کر روائتی خیالات کی جڑیں بھی کٹ جاتی ہیں ۔

لیکن اب کمیونزم کے خلاف بورژوا اعتراضوں کا قصہ ختم کیا جائے ۔

ہم دیکھ آئے ہیں کہ انقلاب میں مزدور طبقے کا پہلا قدم پرولتاریہ کو حکمراں طبقے کی جگہ پر پہنچانا ہے ، جمہوریت کی لڑائی جیتنا ہے ۔

پرولتاریہ اپنے سیاسی اقتدار سے کام لے کر ، رفتہ رفتہ پورا سرمایہ بورژوا طبقے سے چھین لے گا ، پیداوار کے تمام آلات کو ریاست یعنی حکمراں طبقے کی صورت میں منظم پرولتاریہ کے ہاتھوں میں مرکوز کر دے گا اور پھر جتنی تیزی سے ہو سکے تمام پیداواری قوتوں کو ترقی دے گا ۔

اس میں شک نہیں کہ ابتدا میں اس کو عمل میں لانے کی اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں کہ ملکیت کے حقوق اور بورژوا پیداوار کے تعلقات پر جارحانہ حملہ کیا جائے ، لہذا ایسی تدبیریں اختیار کی جائیں جو اقتصادی اعتبار سے ناکافی اور ناکارہ معلوم ہوں گی ، لیکن جو تحریک کے دوران میں اپنی حدود سے آگے قدم بڑھائیں گی ، جن سے پرانے سماجی نظام پر مزید حملوں کی ضرورت پیدا ہوگی اور جو طریقۂ پیداوار کی بالکل کایاپلٹ دینے کےلئے بےحد ضروری ہیں ۔

اس میں شک نہیں کہ مختلف ملکوں میں یہ تدبیریں بھی مختلف ہوں گی ۔

بہر کیف، سب سے ترقی یافتہ ملکوں میں، مندرجہ‌ذیل تدبیریں بڑی حد تک قابل عمل ثابت ہوں گی:

۱) زمین کے حق‌ملکیت کو مٹانا اور پورے لگان کو رفاہ عام پر خرچ کرنا۔

۲) زیادہ آمدنی کے ساتھ ساتھ بڑھتا ہوا ٹیکس لگانا۔

۳) وراثت کے حقوق کو منسوخ کرنا۔

۴) وطن سے فرار ہونے والوں اور باغیوں کی جایداد ضبط کرنا۔

۵) لین‌دین کا سارا کاروبار ایک قومی بینک کے ذریعہ، جس میں ریاست کا سرمایہ اور صرف اسی کا اجارہ ہو، ریاست کے ہاتھوں میں مرکوز کرنا۔

۶) نقل و حرکت اور خبر رسانی کے تمام وسیلوں پر ریاست کا مرکزی قبضہ ہونا۔

۷) ریاست کے کارخانوں اور آلات‌پیداوار کو توسیع دینا۔ ایک مشترکہ منصوبے کے مطابق بنجر زمین کو کاشت میں لانا، اور بالعموم زمین کی زرخیزی میں اضافہ کرنا۔

۸) سب پر کام کرنے کی یکساں ذمہ‌داری ہونا۔ صنعتی فوجیں بنانا، خاص کر زراعت کے لئے۔

۹) زراعت اور صنعت کو ملانا اور ملک میں آبادی کی تقسیم ایسے مساوی انداز میں کرنا کہ رفتہ رفتہ شہر اور دیہات کا فرق جاتا رہے۔

۱۰) عام اسکولوں کے ذریعہ تمام بچوں کو مفت تعلیم دینا۔ کارخانوں میں بچوں سے موجودہ شکل میں کام لینے کا رواج بند کرنا۔ تعلیم کو صنعتی پیداوار کے ساتھ ملانا وغیرہ وغیرہ۔

نشو و نما کے دوران جب طبقاتی امتیازات مٹ جائیں‌گے اور تمام پیداوار پوری قوم کی ایک وسیع سماجی انجمن کے ہاتھوں میں جمع ہو جائےگی، اس وقت اقتدارعامہ کی سیاسی حیثیت جاتی رہےگی۔ سیاسی اقتدار اصل میں ایک طبقے کا منظم تشدد ہے دوسرے پر ظلم کرنے کے لئے۔ پرولتاریہ اگر بورژوا طبقے سے جدوجہد کے دوران حالات سے اس پر مجبور ہوتا ہے کہ ایک طبقے کی صورت میں اپنی

تنظیم کرے ، اگر انقلاب کی بدولت وہ حکمراں طبقہ بنتا ھے اور اس طرح پیداوار کے پرانے تعلقات کو زبردستی ختم کر دیتا ھے تو ان کے ساتھ وہ ان حالتوں کو بھی ختم کر دیتا ھے جن پر طبقاتی اختلافات اور خود طبقات کا وجود منحصر ھے ۔ اور اس طرح ایک طبقے کی حیثیت سے خود اپنے اقتدار کو بھی ختم کر دیتا ھے ۔

پرانے بورژوا سماج اور اس کے طبقوں اور طبقاتی اختلافوں کے بدلے ایک ایسی انجمن قائم ہوگی جس میں ہر شخص کی آزاد ترقی سبھوں کی آزاد ترقی کی شرط ہوگی ۔

۳۔ سوشلسٹ اور کمیونسٹ ادب

۱- رجعتی سوشلزم

(۱) جاگیرداری سوشلزم

فرانس اور انگلینڈ کے اشرافیہ کی تاریخی حیثیت کچھ ایسی تھی کہ جدید بورژوا سماج کے خلاف مختصر پمفلٹ لکھنا اس کا مشغلہ بن گیا ۔ جولائی ۱۸۳۰ ء کے انقلاب فرانس میں اور انگریزی تحریک اصلاح میں (۱۵) اس اشرافیہ کو ایک بار پھر اس ذلیل نودولتئے کے سامنے ھتھیار ڈال دینا پڑا ۔ اس دن سے کسی اھم سیاسی جدوجہد کا سوال ھی باقی نہیں رھا ۔ اب صرف قلم کی لڑائی ممکن تھی ۔ لیکن ادب کے میدان میں بھی شاھی کی بحالی* کے زمانے کے نعرے بلند کرنا اب

* انگلینڈ کی ۱۶۶۰ ء سے ۱۶۸۹ ء کی شاھی کی بحالی نہیں بلکہ ۱۸۱۴ ء سے ۱۸۳۰ ء تک کی فرانس کی شاھی کی بحالی (۱۶) ۔ (۱۸۸۸ ء کے انگریزی ایڈیشن میں اینگلس کا حاشیہ ۔)

محال ہو گیا تھا ۔ ہمدردی پیدا کرنے کی غرض سے اشرافیہ کو مجبور ہونا پڑا کہ بظاہر خود اپنے مفاد کو بھی نظرانداز کر دے اور بورژوا طبقے کے خلاف فرد جرم مرتب کرنے میں صرف استحصال کئے جانےوالے مزدور طبقے کے مفاد کو سامنے رکھے ۔ غرضکہ اشرافیہ نے اپنے نئے آقاؤں سے انتقام کی صورت یہ نکالی کہ ان کی شان میں ہجویہ نظمیں لکھیں اور آنےوالی تباہی کی نامبارک فال ان کے کان تک پہنچاتا رہا ۔

اس طرح جاگیردار سوشلزم کا ظہور ہوا : کچھ رونا دھونا، کچھ ہجوگوئی، کچھ ماضی کی گونج اور کچھ مستقبل کا ڈر ۔ کبھی کبھی اپنی تلخ ظریفانہ اور چبھتی ہوئی تنقید سے وہ بورژوا طبقے کے دل کی گہرائیوں تک اتر جاتی ہے، لیکن جدید تاریخ کے تقاضوں کو سمجھنے سے وہ بالکل معذور ہے اور اس لئے اس کا اثر ہمیشہ مضحکہخیز ہوتا ہے ۔

اشرافیہ نے لوگوں کو اپنے گرد اکٹھا کرنے کےلئے مزدوروں کے نام پر خیرات کی جھولی اٹھائی اور اسے اپنا پرچم بنا لیا ۔ مگر جب کبھی لوگ اس کے حلقے میں داخل ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ گھر کے اندر وہی پرانے جاگیردار منصب کا نشان ابھی تک محفوظ ہے چنانچہ زور کے حقارتآمیز قہقہے لگاتے ہوئے وہ اس سے الگ ہو گئے ۔

”ینگ انگلینڈ“ (۱۷) اور فرانسیسی ”جائز وارث والوں“ (۱۸) کے ایک حصے نے یہی نظارہ پیش کیا ۔

اگر جاگیریتپسند کہتے ہیں کہ ان کا استحصال کا طریقہ بورژوا طبقے سے مختلف تھا، تو وہ بھول جاتے ہیں کہ جس ماحول اور جن حالتوں میں وہ استحصال کرتے تھے وہ بالکل مختلف تھیں اور اب گئے گذرے زمانے کی باتیں ہو گئیں ۔ اگر وہ کہتے ہیں کہ ان کے زمانے میں جدید پرولتاریہ کا کہیں وجود نہیں تھا تو وہ بھول جاتے ہیں کہ جدید بورژوا طبقہ ان کے سماجی نظام کی ہی پیداوار ہے ۔

اور باقی تو وہ اپنی تنقید کی رجعتی نوعیت کو چھپانے کی بہت کم کوشش کرتے ہیں ۔ بورژوا طبقے کے خلاف ان کا سب سے بڑا الزام

یہ ھے کہ بورژوا نظام میں ایک ایسے طبقے کی پرورش ہورھی ھے جو سماج کے پرانے نظام کو بالکل جڑ بنیاد سے اکھاڑ پھینکنے والا ھے ۔

وہ بورژوا طبقے پر اس بات کی زیادہ ملامت کرتے ھیں کہ وہ انقلابی پرولتاریہ پیدا کرتا ھے بمقابلہ اس بات کے کہ وہ عام طور پر پرولتاریہ پیدا کرتا ھے ۔

اس لئے عملی سیاست میں وہ مزدور طبقے کے خلاف تشدد کی سبھی کارروائیوں میں پورا حصہ لیتے ھیں ، اور روزمرہ کی زندگی میں اپنی ساری ڈینگ کے باوجود ، صنعت کے درخت سے جو سنہرے پھل ٹپکتے ھیں ، ان کو اٹھانے کےلئے ٹوٹ پڑتے ھیں اور اون ، شکرقند کی شکر اور آلو کی شراب کی تجارت میں صداقت ، محبت اور غیرت سبھی کا سودا کر آتے ھیں * ۔

مسیحی سوشلزم اور جاگیرداری سوشلزم میں اسی طرح چولی دامن کا ساتھ ھے جس طرح پادری اور زمین‌دار میں ۔

عیسائیوں کی رھبانیت کو سوشلزم کا جامہ پہنانے سے زیادہ آسان اور کوئی کام نہیں ۔ کیا عیسائیت نے بھی ذاتی ملکیت ، ازدواج اور ریاست کے خلاف فتوے نہیں صادر کئے ؟ کیا اس نے بھی ان کی جگہ پر نیک کام اور فقر ، تجرد اور نفس کشی ، رھبانی زندگی اور کلیسائیت کی تلقین نہیں کی ؟ مسیحی سوشلزم وہ گنگا جل ھے جس کے چھینٹوں سے پادری اشرافیہ کے دل کی جلن کو سکون پہنچتا ھے ۔

---

* یہ بات خاص طور پر جرمنی پر پوری اترتی ھے ، جہاں کے زمین‌دار امرا اور یونکر (۱۹) اپنی زمینوں کے زیادہ حصے پر اپنےلئے گماشتوں کے ذریعہ کھیتی کراتے ھیں اور ساتھ ھی وہ شکر اور شراب کے بڑے بڑے کارخانوں کے مالک ھیں ۔ انگریز اشرافیہ جو ان سے زیادہ دولت‌مند ھے ، ابھی تک ان باتوں سے بالاتر ھے ۔ لیکن وہ بھی اپنے گھٹتے ھوئے لگان کو پورا کرنے کا طریقہ خوب جانتے ھیں اور مشکوک قسم کی جوائنٹ اسٹاک کمپنیاں کھولنےوالوں کو اپنا نام ادھار دیتے ھیں ۔ (۱۸۸۸ ء کے انگریزی ایڈیشن میں اینگلس کا حاشیہ ۔)

(ب) پیٹی بورژوا سوشلزم

جاگیردار اشرافیہ ھی ایک ایسا طبقہ نہیں جسے بورژوا طبقے نے ابتر بنایا ھو ، جس کا نظامِ‌زندگی جدید بورژوا سماج کی فضا میں جھلس کر برباد ھو چکا ھو ۔ عہد وسطی کے شہری بیوپاری اور چھوٹے آراضی دار کسان جدید بورژوا طبقے کے پیش‌رو تھے ۔ جن ملکوں میں صنعت اور تجارت نے زیادہ ترقی نہیں کی ، وھاں آج بھی یہ دونوں طبقے نوخیز بورژوا طبقے کے پہلو بہ‌پہلو برے بھلے زندگی کے دن کاٹ رھے ھیں ۔

جن ملکوں میں جدید تہذیب پورے شباب پر پہنچ گئی ھے ، وھاں پیٹی بورژوا کا ایک نیا طبقہ بن گیا ھے جو پرولتاریہ اور بورژوا کے بیچ میں ڈانواڈول رھتا ھے اور بورژوا سماج کے ایک ضمنی حصے کی حیثیت سے برابر اپنی تجدید کرتا رھتا ھے ۔ لیکن مقابلہ ، اس طبقے کے افراد کو ایک ایک کر کے مزدور طبقے کے اندر ڈھکیلتا رھتا ھے اور جوں جوں جدید صنعت ترقی کرتی ھے وہ خود اس لمحے کو قریب آتے دیکھتے ھیں جب جدید سماج میں ان کی آزاد حیثیت ختم ھو جائے گی اور صنعت ، زراعت اور تجارت میں نگران کار ، کارندے اور دکان کے ملازم ان کی جگہ لیں گے ۔

جن ملکوں میں فرانس کی طرح آبادی میں آدھے سے زیادہ کسان ھیں ، وھاں یہ قدرتی بات تھی کہ بورژوا طبقے کے خلاف پرولتاریہ کا ساتھ دینےوالے مصنف ، بورژوا نظام پر رائےزنی کرنے میں کسان یا پیٹی بورژوا طبقے کی کسوٹی سے کام لیتے اور ان ھی درمیانی طبقوں کے نقطۂ نظر سے مزدور طبقے کی پشت پناھی کرتے ۔ چنانچہ اس طرح پیٹی بورژوا سوشلزم پیدا ھوا ۔ سسماندی صرف فرانس میں ھی نہیں بلکہ انگلینڈ میں بھی اس مسلک کے لوگوں کا پیشوا تھا ۔

سوشلزم کے اس مکتب نے جدید پیداواری تعلقات میں تضاد کی چھان‌بین کرنے میں بڑی ذھانت کا ثبوت دیا ۔ اس نے ماھرین اقتصادیات کی منافقانہ بہانہ‌سازیوں کا پردہ فاش کیا ۔ اس نے ناقابل تردید شہادتوں

سے ثابت کیا کہ مشین‌سازی اور تقسیم‌محنت ، چند ھاتھوں میں سرمایہ اور زمین کا اجتماع ، فاضل پیداوار اور بحران کیسے کیسے تباہ کن اثرات‌پیدا کرتے ھیں۔ اس نے پیٹی بورژوا اور کسانوں کی ناگزیر تباھی ، مزدور طبقے کی غریبی ، پیداوار کی بدنظمی ، تقسیم‌دولت کی شدید نابرابری ، قوموں کی آپس میں ایک دوسرے کو مٹا دینے والی صنعتی جنگ ، پرانے اخلاقی بندھنوں ، پرانے خاندانی رشتوں اور پرانی قوموں کی بربادی کا نقشہ کھینچا ۔

لیکن اپنے اثباتی مقاصد میں اس قسم کا سوشلزم یا تو پیداوار اور تبادلے کے پرانے وسیلوں کو اور ان کے ساتھ ملکیت کے پرانے رشتوں اور پرانے سماج کو بحال کرنے کا خواھاں ھے یا پھر پیداوار اور تبادلے کے جدید وسیلوں کو ملکیت کے پرانے رشتوں کی حدبندی کے اندر بند رکھنا چاھتا ھے ، حالانکہ انھی وسیلوں کے دباؤ سے وہ رشتے دھماکے کے ساتھ ٹوٹے تھے ، اور یہ ناگزیر تھا ۔ دونوں صورتوں میں یہ سوشلزم رجعت پرست اور یوٹوپیائی ھے ۔

صنعت میں اھل حرفہ کی منظم انجمنیں اور زراعت میں سرقبیلی رشتے ، یہی اس سوشلزم کا حرف آخر ھے ۔

لیکن بالآخر جب تاریخ کی اٹل حقیقتوں نے خود فریبی کے تمام نشہ‌آور اثرات کو دور کر دیا تو اس قسم کی اشتراکیت نے انتہائی یاس کے عالم میں سرپیٹ لیا ، اور یہی اس کا انجام تھا ۔

(ج) جرمن یا ”سچا“ سوشلزم

فرانس کا سوشلسٹ اور کمیونسٹ ادب ، ایسا ادب تھا جو ذی اقتدار بورژوا طبقے کے جبر اور دباؤ کے تحت پیدا ھوا اور جو ان کے اقتدار کے خلاف جدوجہد کا آئینہ‌دار تھا ۔ یہ ادب جرمنی اس وقت پہنچا ، جب اس ملک کا بورژوا طبقہ جاگیردارانہ مطلق العنانی کے خلاف ابھی میدان میں اترا ھی تھا ۔

جرمنی کے فلسفی ، نیم‌فلسفی اور انشاپرداز بڑے اشتیاق سے اس ادب پر ٹوٹ پڑے ۔ انہیں اتنی سی بات یاد نہیں رھی کہ یہ

تحریریں جب فرانس سے جرمنی آئیں تو ان کے ساتھ فرانس کے سماجی حالات نہیں آئے تھے۔ جرمنی کے سماجی حالات میں آتے ہی یہ فرانسیسی ادب اپنی فوری عملی اہمیت کھو بیٹھا اور اس نے خالص ادبی صورت اختیار کرلی۔ چنانچہ اٹھارھویں صدی کے جرمن فلسفیوں کی نظر میں پہلے انقلاب فرانس کے مطالبے عام طور پر "عملی منطق" کے تقاضوں کے سوا اور کچھ نہ تھے اور ان کے خیال میں فرانس کی انقلابی بورژوازی کی مرضی کا اظہار دراصل خالص مرضی، یا مرضی کی اصلی صورت یعنی سچی انسانی مرضی کے قوانین کی اہمیت رکھتا تھا۔

جرمنی کے اہلِ‌قلم کا کام محض یہ تھا کہ نئے فرانسیسی خیالات اور اپنے پرانے فلسفیانہ ضمیر میں ہم‌آہنگی پیدا کریں، دوسرے لفظوں میں اپنے فلسفیانہ نقطۂ نظر سے فرانسیسی خیالات کو اپنا لیں۔

ان خیالات کو انہوں نے اسی طرح اپنایا جیسے کسی بدیسی زبان کے ادب کو اپنایا جاتا ہے یعنی ترجمے کے ذریعہ۔

یہ سب کو معلوم ہے کہ قدیم زمانے کے کلاسیکی قلمی نسخوں کے مسودوں کے اوپر راہبوں نے کیتھولک اولیاؤں کے لغوسوانح حیات لکھے تھے۔ جرمنی کے اہلِ‌قلم نے فرانس کے غیرمقدس ادب کے سلسلے میں اس طریقے کو الٹ‌دیا۔ فرانسیسی خیالات کو انہوں نے اپنے فلسفیانہ لغویات لکھنے کے‌لئے استعمال کیا۔ زر کے تعلقات کے بارے میں فرانسیسی تنقید کے نیچے انہوں نے "انسانیت کی برگشتگی" لکھا اور بورژوا ریاست کی فرانسیسی تنقید کے نیچے "مجرد کل کے تسلط کا خاتمہ" وغیرہ۔

غرضکہ انہوں نے فرانس‌والوں کی تاریخی تنقیدوں کے ساتھ اپنے فلسفیانہ فقروں کا دم چھلا لگا دیا اور اس کا نام رکھ دیا: "فلسفۂ‌عمل"، "سچا سوشلزم"، "سوشلزم کی جرمن سائنس"، "سوشلزم کی فلسفیانہ بنیاد" وغیرہ۔

مختصر یہ کہ فرانسیسی سوشلسٹ اور کمیونسٹ ادب بالکل بےجان بنا دیا گیا۔ اور چونکہ جرمنوں کے ہاتھ میں وہ ایک طبقے کے خلاف دوسرے کی جدوجہد کا آئینہ‌دار بھی نہیں رہا، اس لئے اس کو

یہ احساس ہو گیا کہ اس نے ” فرانسیسی یک طرفہ پن ،، دور کر دیا ھے اور وہ حقیقی تقاضوں کی نہیں بلکہ حق کے تقاضوں کی، مزدور طبقے کے مفاد کی نہیں بلکہ انسانی فطرت کے مفاد کی، یعنی عام انسان کی نمائندگی کرتا ھے ، جو کسی طبقے کا نہیں ھے ، جس کی کوئی حقیقت نہیں ھے ، جس کا وجود صرف فلسفیانہ اوھام کے دھندلکے میں ھے۔

اس اثنا میں یہ جرمن سوشلزم جس نے اپنے طفلانہ کاسوں کو اتنا اھم اور سنجیدہ سمجھ رکھاتھا اور بازاری دوا فروش کی طرح اپنے دو کوڑی کے مال کا ڈھنڈورا پیٹتا تھا ، رفتہ رفتہ اپنی کتابی معصومیت کھوبیٹھا۔

جاگیردار اشرافیہ اور مطلق العنان بادشاھت کے خلاف جرمنی اور خصوصاً پروشیا کے بورژوا طبقے کی لڑائی یا دوسرے لفظوں میں لبرل تحریک زیادہ سنگین ھو گئی۔

اس سے ” سچے سوشلزم ،، کی دیرینہ آرزو برآئی ، اسے موقع ملا کہ سیاسی تحریک کے سامنے سوشلسٹ مطالبے پیش کرے، اعتدال پسندی ، نمائندہ حکومت ، بورژوا مقابلہ ، پریس کی بورژوا آزادی ، بورژوا قانون سازی اور بورژوا آزادی اور برابری کے خلاف اپنی پرانی لعنتوں کی بوچھار شروع کرے ، اور عوام الناس کو بتائے کہ اس بورژوا تحریک میں ان کا کوئی فائدہ نہیں ، سراسر نقصان ھی نقصان ھے۔ جرمن سوشلزم عین وقت پر بھول گیا کہ وہ خود جس فرانسیسی تنقید کی ایک بے معنی نقل تھا ، اس کے پیش نظر جدید بورژوا سماج اسی سے مطابقت رکھنےوالے مادی حالاتِ زندگی اور سیاسی ڈھانچے سمیت تھا اور یہی وہ چیزیں تھیں جن کا حاصل کرنا جرمنی کی آنےوالی جدوجہد کا مقصد تھا۔

جرمن مطلق العنان حکومتوں کےلئے ، جن کے ساتھ پادریوں ، پروفیسروں، دیہاتی زمینداروں اور افسروں کا ایک لاؤلشکر موجود تھا ، یہ (سوشلزم) ایک پسندیدہ چیز تھی جس کی ھیبت سے خطرناک بڑھتی ھوئی بورژوازی کو ڈرایا جا سکتا تھا۔

یہ تھے وہ کڑوے تازیانے اور گولیوں پر چڑھی ہوئی شکر جن کے ذریعہ حکومت جرمن مزدوروں کی بغاوتوں کو دبا رہی تھی۔

ایک طرف تو یہ ''سچا،، سوشلزم جرمن بورژوا طبقے کے خلاف لڑنے کےلئے حکومتوں کے ھاتھوں میں ھتھیار کا کام دیتا تھا اور دوسری طرف براہ‌راست ایک رجعتی مفاد یعنی جرمنی کے پیٹی بورژوازی کے مفاد کا علم بردار تھا۔ جرمنی کا یہ پیٹی بورژوا طبقہ سولھویں صدی کی نشانی ھے اور اس وقت سے برابر مختلف صورتوں میں نمودار ھوتا رھا ھے اور یہی موجودہ صورت‌حال کی اصلی سماجی بنیاد ھے۔

اس طبقے کو قائم رکھنے کا مطلب جرمنی میں موجودہ صورت حال کو قائم رکھنا ھے۔ بورژوازی کی صنعتی اور سیاسی برتری سے ڈرتے ھوئے وہ اپنی قطعی تباھی کا انتظار کرتا ھے، ایک طرف، سرمائے کے مرکوز ھونے کی وجہ سے اور دوسری طرف، انقلابی پرولتاریہ کی نشوونما کی وجہ سے۔ پیٹی بورژوازی کو معلوم ھوتا تھا کہ ''سچا،، سوشلزم ایک تیر سے دونوں کا شکار کرتا ھے۔ اور اس لئے ''سچے،، سوشلزم کی تحریک ایک وبا کی طرح پھیل گئی۔

جرمن سوشلسٹوں نے اپنی بے‌مایہ ''ابدی صداقتوں،، کے لاغر ڈھانچے کو ایک روحانی لباس پہنا دیا، جسے منطقی استدلال کے تانے بانے سے بنایا گیا تھا، جس پر فصاحت کے بیل بوٹے کاڑھے ھوئے تھے اور جو میٹھے جذبات کے آنسوؤں میں بھیگا ھوا تھا۔ یہ لبادہ اس طبقے میں ان کے مال کی کھپت بڑھانے میں بہت کارآمد ثابت ھوا۔

اور اپنی جانب سے جرمن سوشلزم روز بروز یہ تسلیم کرتا گیا کہ لمبی چوڑی باتیں کر کے پیٹی بورژوا طبقے کی وکالت کرنا ھی اس کا اصلی کام ھے۔

اس نے دعوی کیا کہ جرمن قوم ھی ایک مثالی قوم ھے اور جرمنی کا پیٹی بورژوا انسانیت کا اعلی نمونہ۔ اس مثالی انسان کی ھر کمینہ حرکت اور سفلہ پن کی اس نے ایک مخفی، اعلی اور سوشلسٹ تعبیر پیش کی جو اس کی اصلی خصلت کے بالکل برعکس تھی۔ انتہا یہ کہ اس نے کمیونزم کی کھلم کھلا مخالفت شروع کر دی کہ اس میں

" وحشیانہ تباہ‌کاری "، کا رجحان پایا جاتا ہے ، اور اپنی غیرجانب‌داری کے نام سے تمام طبقاتی جدوجہد پر انتہائی حقارت کا اظہار کیا۔ آج کل جرمنی میں سوشلزم اور کمیونزم کے نام سے جن کتابوں کا چلن ہے ، ان میں چند ایک کو چھوڑ کر ، سب اسی گندے اور نکما بنا دینے‌والے ادب سے تعلق رکھتی ہیں *۔

۲۔ قداست‌پسند یا بورژوا سوشلزم

بورژوا طبقے کا ایک حصہ سماج کی خرابیوں کو دور کر دینا چاہتا ہے تاکہ بورژوا سماج کی زندگی کو قائم رکھا جا سکے۔

اس گروہ میں ماہرین معاشیات ، انسانیت دوست ، غریبوں کے ہمدرد ، مزدور طبقے کی حالت سدھارنے والے ، کارخیر کے ناظم ، جانوروں پر بےرحمی کی مخالفت کرنے والی انجمنوں کے اراکین ، شراب‌نوشی کے کٹر مخالف اور چھوٹے چھوٹے مصلح شامل ہیں۔ طرہ یہ کہ ایسے سوشلزم کے مکمل نظام بھی تیار کر لئے گئے ہیں۔

اس نوع کے سوشلزم کی ایک مثال ہمیں پرودھوں کی کتاب " افلاس کا فلسفہ "، میں ملتی ہے۔

بورژوا سوشلسٹ جدید سماجی حالات کے تمام فائدوں کو قائم رکھنا چاہتے ہیں ، مگر اس جدوجہد کو اور ان خطروں کو نہیں ، جو ان کا لازمی نتیجہ ہیں۔ وہ سماج کی موجودہ صورت‌حال کو پسند کرتے ہیں ، بشرطیکہ اس کے انقلابی اور انتشار پیدا کرنے‌والے عناصر کو نکال دیا جائے۔ وہ چاہتے ہیں کہ بورژوا طبقہ رہے مگر مزدور نہ ہوں۔ ظاہر ہے کہ بورژوازی کی نظر میں سب سے اچھی دنیا وہی ہوگی جس میں خود اس کا تسلط‌ہو۔ اور بورژوا سوشلزم اس خوش

---

* ۱۸۴۸ء کے انقلابی طوفان نے (۲۰) اس پورے بھونڈے رجحان کو مٹا دیا اور اس کے علم‌برداروں کے دل سے سوشلزم میں الجھنے کا شوق دور کر دیا۔ اس رجحان کا اصلی اور مخصوص نمائندہ ہیر کارل گرون ہے۔ (۱۸۹۰ء کے جرمن ایڈیشن میں اینگلس کا حاشیہ۔)

آئند تصور کو فروغ دے کر کم‌وبیش کئی مکمل نظام مرتب کر لیتا ہے۔ مزدوروں سے جب اس کی تجویز کی جاتی ہے کہ اس نظام پر عمل کریں اور بیٹھے بٹھائے نئے یروشلم (۲۱) میں پہنچ جائیں تو حقیقت میں کہنے کی غرض یہ ہوتی ہے کہ مزدور رہیں موجودہ سماج کے دائرے کے اندر مگر بورژوا طبقے کے بارے میں نفرت‌بھرے خیالات اپنے دماغ سے نکال دیں۔

اس سوشلزم کی ایک اور زیادہ عملی صورت ہے لیکن اس میں نظروترتیب کی کمی ہے۔ وہ مزدور طبقے کی نگاہ میں ہر انقلابی تحریک کی وقعت کم کرنے کےلئے یہ ثابت کرنا چاہتی ہے کہ انہیں محض کسی سیاسی اصلاح سے نہیں بلکہ زندگی کی مادی حالتوں کو اور معاشی رشتوں کو بدلنے سے ہی کچھ فائدہ ہو سکتا ہے۔ لیکن زندگی کی مادی حالتوں کو بدلنے سے اس سوشلزم کا منشا ہرگز یہ نہیں ہوتا کہ پیداوار کے بورژوا تعلقات مٹا دئے جائیں۔ یہ کام تو صرف انقلاب کے ذریعہ ہی پورا ہو سکتا ہے۔ اس کا مدعا موجودہ رشتوں کو برقرار رکھتے ہوئے اس کی بنیاد پر نظم‌ونسق میں اصلاح کرنا ہے۔ ان اصلاحوں سے سرمایہ اور محنت کے رشتے پر کوئی اثر نہیں پڑتا، بلکہ بہت ہوا تو بورژوا حکومت کے اخراجات میں کمی ہو سکتی ہے اور اس کے نظم‌ونسق میں زیادہ سہولت اور سادگی پیدا ہو سکتی ہے۔

بورژوا سوشلزم کا اصلی اظہار اس وقت اور صرف اسی وقت ہوتا ہے جب وہ محض ایک استعارے کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔

آزاد تجارت! مزدور طبقے کی بھلائی کے لئے۔ حفاظتی محصول! مزدور طبقے کی بھلائی کے لئے۔ قید تنہائی! مزدور طبقے کی بھلائی کےلئے۔ بورژوا سوشلزم کا حرف‌آخر یہی ہے۔ اور یہی ایک ایسا حرف ہے جسے سنجیدگی کے ساتھ کہا گیا ہے۔

بورژوازی کا سوشلزم اس صداقت پر مشتمل ہے کہ بورژوا، بورژوا ہے، مزدور طبقے کی بھلائی کےلئے!

۳- تنقیدی یوٹوپیائی سوشلزم اور کمیونزم

هم یہاں اس ادب کا ذکر نہیں کرنا چاہتے جس نے آج کل کے هر بڑے انقلاب میں پرولتاریہ کے مطالبوں کی آواز بلند کی هے جس کی مثال بابیوف وغیرہ کی تحریروں میں ملتی هے۔

پرولتاریہ نے اپنے مقاصد پورا کرنے کی براہ‌راست کوشش پہلے پہل اس وقت کی جب هر طرف هلچل مچی هوئی تھی اور جاگیردار سماج کا قلع قمع کیا جا رها تھا۔ ان کوششوں کا ناکام رهنا لازم تھا، کیونکہ اس وقت مزدور طبقہ زیادہ ترقی نہیں کرنے پایا تھا۔ اس کی نجات کےلئے جو معاشی حالتیں ضروری هیں وہ بھی موجود نہ تھیں۔ انہیں ابھی وجود میں لانا تھا اور آنےوالا بورژوا عہد هی انہیں وجود میں لا سکتا تھا۔ پرولتاریہ کی ان ابتدائی تحریکوں کے ساتھ جو انقلابی ادب پیدا هوا اس کی نوعیت لازماً رجعت پسند تھی۔ اس نے عام ترک دنیا اور نہایت بھونڈی قسم کی سماجی برابری کی تعلیم دی۔

اصل میں جو سوشلسٹ اور کمیونسٹ نظام کہلاتے هیں یعنی جو سین سائموں، فورئیے اور اووین وغیرہ کی طرف منسوب هیں، وہ اس زمانے میں پیدا هوئے تھے، جبکہ پرولتاریہ اور بورژوا طبقے کے درمیان جدوجہد نہایت ابتدائی اور کچی حالت میں تھی۔ اس کا ذکر اوپر آچکا هے۔ (ملاحظہ هو پہلا باب ”بورژوا اور پرولتاریہ“)۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ان نظاموں کے بانی طبقاتی اختلافوں سے بےخبر نہ تھے۔ انہوں نے ان عناصر کو بھی دیکھا تھا جن کے عمل سے مروجہ سماج میں انتشار پیدا هو رها هے۔ لیکن پرولتاریہ اس وقت تک اپنی طفولیت کے عالم میں تھا اور اس میں ان کو ایسے کوئی آثار نظر نہیں آئے جن سے معلوم هو کہ اس طبقے میں تاریخی پیش قدمی یا آزاد سیاسی تحریک کا مادہ موجود هے۔

چونکہ طبقاتی تصادم صنعت کی ترقی کے ساتھ ساتھ بڑھتا هے، اس‌لئے ان لوگوں کو اپنے وقت کی اقتصادی صورت‌حال میں وہ مادی حالتیں نہیں ملیں جو پرولتاریہ کی نجات کےلئے ضروری هیں۔ لہازا

وہ ایک نئی سماجی سائنس کی، نئے سماجی قانون کی کھوج کرنے لگے جس سے ان حالتوں کو پیدا کیا جا سکے۔

سماجی عمل کی جگہ ان کا اپنا ذاتی اختراعی عمل ہوگا، نجات کی تاریخی طور پر پیدا ہونے والی حالتوں کی جگہ خیالی حالتیں اور پرولتاریہ کی رفتہ رفتہ طبقے میں تنظیم کی جگہ سماج کی ایک ایسی تنظیم ہوگی جسے ان موجدوں نے خاص طور سے تیار کیا ہو۔ ان کے خیال میں مستقبل کی تاریخ یہ ہے کہ ان کے سماجی منصوبوں کی تبلیغ کی جائے اور انہیں عملی جامہ پہنایا جائے۔

اپنی تجویزوں کو مرتب کرنے میں وہ یہ احساس رکھتے ہیں کہ مزدور طبقے کے مفاد کا خاص دھیان رکھیں کہ وہ سب سے زیادہ مصیبت زدہ طبقہ ہے۔ ان کی نگاہ میں پرولتاریہ کی حیثیت صرف اسی قدر ہے کہ یہ غریب سب سے زیادہ مصیبت کا مارا ہوا ہے۔

طبقاتی جدوجہد کی غیرترقی یافتہ صورت اور پھر ان کے اپنے حالات زندگی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قسم کے سوشلسٹ اپنے آپ کو تمام طبقاتی اختلافوں سے بہت اونچا سمجھنے لگتے ہیں۔ وہ سماج کے ہر فرد کی حالت سدھارنا چاہتے ہیں، ان کی بھی جنہیں دنیا کی ہر نعمت حاصل ہے۔ اسی لئے عموماً وہ بلالحاظ طبقہ پورے سماج سے اپیل کرتے ہیں۔ یہی نہیں۔ بلکہ حکمراں طبقے سے اپیل کرنا زیادہ اچھا سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ ایک بار ان کے نظام کو سمجھ لینے کے بعد کیسے کوئی شخص انکار کر سکتا ہے کہ سماج کی بہتر سے بہتر حالت کا بہتر سے بہتر خاکہ یہ نہیں ہے؟

اس لئے وہ تمام سیاسی اور خصوصاً انقلابی عمل کو ٹھکراتے ہیں۔ وہ پرامن طریقے سے اپنا مقصد پورا کرنا چاہتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ چھوٹے چھوٹے تجربے کر کے جن کا انجام ناکامی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا، اور مثال قائم کر کے اپنے سماجی پیغام کا راستہ صاف کریں۔

آنے والے سماج کی یہ خیالی تصویریں ایسے وقت میں کھینچی گئی تھیں جبکہ پرولتاریہ ابھی بہت پچھڑی ہوئی حالت میں تھا اور خود اس کے ذہن میں اپنی حیثیت کے متعلق بےسروپا خیالات بھرے ہوئے

تھے ۔ ان کا تعلق پرولتاریہ کے اس ابتدائی احساس سے تھا جو اس کے دل میں پورے سماج کی نئے سرے سے تعمیر کرنے کے لئے پیدا ہو رہا تھا ۔

لیکن ان سوشلسٹ اور کمیونسٹ مطبوعات میں ایک تنقیدی پہلو بھی موجود ہے ۔ وہ موجودہ سماج کے ہر اصول پر وار کرتے ہیں ۔ لہازا مزدور طبقے کی تعلیم کے لئے ان میں نہایت بیش‌قیمت مواد بھرا پڑا ہے ۔ ان میں جو عملی تدبیریں پیش کی گئی ہیں مثلاً یہ کہ شہر اور دیہات کی تمیز اٹھا دی جائے ، خاندان ، افراد کے فائدے کے لئے صنعتی کاروبار کا طریقہ اور اجرتی نظام مٹا دئے جائیں ، سماجی ہم‌آہنگی پیدا کی جائے ، ریاست جو کام انجام دیتی ہے ان کے بدلے محض پیداوار کی دیکھ بھال کا کام رہنے دیا جائے ، یہ سب تجویزیں صرف یہ بتا رہی ہیں کہ طبقاتی اختلافات مٹ جائینگے ۔ مگر اس وقت تو انہوں نے ابھی ابھرنا ہی شروع کیا تھا اور ان مطبوعات میں ان کی بالکل ابتدائی ، غیرواضح اور نہایت مبہم صورت دکھائی دیتی ہے ۔ اس لئے یہ تجویزیں محض یوٹوپیائی حیثیت رکھتی ہیں ۔

تنقیدی یوٹوپیائی سوشلزم اور کمیونزم کی اہمیت میں اور تاریخی نشوونما میں الٹا تعلق ہے ۔ جدید طبقاتی جدوجہد جس حد تک ترقی کرتی اور واضح صورت‌اختیار کرتی ہے ، اسی حدتک جدوجہد سے ان کی بے‌بنیاد علحدگی اور اس کی بےسروپا مخالفت اپنی عملی قدر و قیمت اور نظریاتی جواز کھوتی جاتی ہے ۔ نتیجہ یہ ہے کہ اگرچہ ان نظاموں کے بانی کئی اعتبار سے انقلابی تھے مگر ان کے پیرو بلااستثنا محض رجعت‌پسند ہو کر رہ گئے ہیں ۔ وہ اپنے استاد کے خیالات پر جوں کے توں جمے رہتے ہیں اور مزدور طبقے کی بڑھتی ہوئی تاریخی نشوونما کو نظر انداز کرتے ہیں ۔ اس لئے وہ مسلسل طبقاتی کشمکش کو ختم کرنے اور طبقاتی اختلافات کا تصفیہ کرانے کی کوشش کرتے ہیں ۔ وہ ابھی تک اپنے تجربوں کے ذریعہ اپنے سماجی یوٹوپیائی منصوبوں کو پورا کرنے کا خواب دیکھتے ہیں ۔ وہ الگ الگ

'' فلانستر ،، قائم کرنا ، گھریلو نوآبادیاں («Home colonies») بسانا ، چھوٹے چھوٹے '' ایکاریا ،، * (نئے یروشلم کا مختصر نمونہ) بنانا چاہتے ہیں ۔ اور ان تمام ہوائی قلعوں کی تعمیر کے لئے مجبور ہوتے ہیں کہ بورژوازی کے جذبات سے اپیل کریں اور ان کے خزانہ داروں کے سامنے ہاتھ پھیلائیں ۔ اس طرح رفتہ رفتہ تنزل کر کے وہ بھی ان رجعت پسند یا قدامت پرست سوشلسٹوں کے زمرے میں جا ملتے ہیں جن کی تصویر اوپر کھینچی گئی ہے ۔ فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ اپنی باقاعدہ کتاب پرستی اور اپنی سماجی سائنس کے معجزانہ اثرات پر ایمان رکھتے ہیں جو جنون اور اوہام پرستی کی حد تک جا پہنچا ہے ۔

اس لئے وہ مزدور طبقے کے ہر سیاسی عمل کی شدت سے مخالفت کرتے ہیں ۔ ان کے خیال میں سیاسی عمل کا راستہ وہی لوگ اختیار کر سکتے ہیں جو تعصب سے اندھے ہو جائیں اور ان کی نئی بشارت کو ماننے سے انکار کریں ۔

اسی لئے انگلستان میں اووین اور فرانس میں فورئیے کے نام لیوا چارٹسٹوں (۲۲) اور اصلاح پسندوں (۲۳) کی مخالفت کرتے ہیں ۔

---

* فورئیے نے جن سوشلسٹ نوآبادیوں کا منصوبہ بنایا تھا انہیں '' فلانستر ،، کہا جاتا ہے ۔ کابے نے اپنے خیالی کمیونسٹ نظام کا نام '' ایکاریا ،، رکھا تھا ، اور جب امریکہ میں اس نے ایک کمیونسٹ نوآبادی بسائی تو اس کا یہی نام پڑا ۔ (۱۸۸۸ ء کے انگریزی ایڈیشن میں اینگلس کا حاشیہ ۔)

اووین اپنی مثالی کمیونسٹ سوسائٹیوں کو «Home colonies» یعنی گھریلو نوآبادیاں کہتا تھا ۔ فورئیے نے جن عوامی محلوں کا منصوبہ بنایا تھا ان کا نام '' فلانستر ،، تھا ۔ اور خواب وخیال کی وہ یوٹوپیائی دنیا جس کے کمیونسٹ اداروں کی تصویر کابے نے کھینچی تھی '' ایکاریا ،، کہلاتی تھی ۔ (۱۸۹۰ ء کے جرمن ایڈیشن میں اینگلس کا حاشیہ ۔)

۴۔ حکومت کی دوسری مخالف پارٹیوں سے کمیونسٹوں کا تعلق

دوسرے باب میں صراحت کی جا چکی ہے کہ مزدور طبقے کی موجودہ پارٹیوں سے جیسے انگلستان میں چارٹسٹوں اور شمالی امریکہ میں زرعی اصلاح پسندوں سے کمیونسٹوں کے تعلقات کیا ہیں۔

کمیونسٹ جدوجہد اس لئے کرتے ہیں کہ مزدور طبقے کے فوری مقصد حاصل ہوں، ان کے عارضی مفاد پورے کئے جا سکیں۔ لیکن حال کی تحریک میں وہ اس تحریک کے مستقبل کی بھی ترجمانی کرتے ہیں اور اس کا دھیان رکھتے ہیں۔ فرانس میں کمیونسٹ، قدامت پرست اور ریڈیکل بورژوازی کے خلاف سوشل ڈیموکریٹوں * سے ایکا کرتے ہیں۔ مگر انقلاب فرانس سے جو پرفریب الفاظ اور موہوم امیدیں منتقل ہوتی آئی ہیں، ان پر رائےزنی کرنے کا حق انہوں نے نہیں چھوڑا۔

سوئٹزرلینڈ میں وہ ریڈیکل پارٹی کی مدد کرتے ہیں، مگر اس حقیقت سے چشم‌پوشی نہیں کرتے کہ یہ پارٹی متضاد عنصروں سے

---

* اس پارٹی کی نمائندگی ان دنوں پارلیمنٹ میں لیدرو رولین، ادب میں لوئی بلان، روزانہ اخباروں میں «La Réforme» (۲۴) کرتے تھے۔ یہی لوگ سوشل ڈیموکریسی کے لفظ کے موجد تھے۔ ان کے نزدیک اس کا مطلب ڈیموکریٹک یا ریپبلکن پارٹی کا وہ حصہ تھا جس پر سوشلزم کا کم‌وبیش کچھ اثر ہو۔ (۱۸۸۸ء کے انگریزی ایڈیشن میں اینگلس کا حاشیہ۔)

فرانس میں ان دنوں جو پارٹی اپنے آپ کو سوشل ڈیموکریٹک کہتی تھی، اس کے نمائندے سیاسی زندگی میں لیدرو رولین اور ادب میں لوئی بلان تھے۔ چنانچہ یہ موجودہ زمانے کی جرمن سوشل ڈیموکریسی سے بہت مختلف تھی۔ (۱۸۹۰ء کے جرمن ایڈیشن میں اینگلس کا حاشیہ۔)

مل کر بنی ہے جس میں کچھ تو فرانسیسی قسم کے جمہوری سوشلسٹ ہیں اور کچھ ریڈیکل بورژوا ۔

پولینڈ میں وہ اس پارٹی کے مددگار ہیں جو زرعی انقلاب پر زور دیتی ہے کہ یہی قومی نجات کی شرطاول ہے ۔ ۱۸۴۶ء میں اسی پارٹی نے کراکف میں بغاوت کی آگ بھڑکائی تھی ۔ (۲۵)

جرمنی میں بورژوا طبقہ جب کبھی کسی انقلابی راستے پر قدم رکھتا ہے اور مطلق العنان بادشاہت، جاگیردار زمینداری اور رجعت‌پسند پیٹی بورژوازی کے خلاف انقلابی کارروائی کرتا ہے تو کمیونسٹ اس کے ساتھ مل کر لڑتے ہیں ۔

لیکن ایک لمحے کےلئے بھی وہ یہ نہیں بھولتے کہ بورژوا اور پرولتاریہ کی بنیادی دشمنی کا خیال نہایت مضبوطی کے ساتھ مزدور طبقے کے دل میں بٹھا دیں تاکہ جب وقت آئے تو جرمن مزدور ان سماجی اور سیاسی حالات کو جسے بورژوا طبقہ اپنے اقتدار کے ساتھ لازماً قائم کرےگا، خود بورژوا طبقے کے خلاف ہتھیار بنا کر استعمال کریں اور جرمنی میں رجعت‌پسند طبقوں کے زوال کے بعد خود بورژوا طبقے کے خلاف لڑائی فوراً شروع کر دی جائے ۔

کمیونسٹوں کی نظر سب سے زیادہ جرمنی پر لگی ہوئی ہے، کیونکہ اولاً اس ملک میں بورژوا انقلاب کی گھڑی آپہنچی ہے اور یہ انقلاب لازماً یورپی تہذیب کے بہت زیادہ ترقی‌یافتہ حالات میں اور ایک ایسے پرولتاریہ کے ساتھ ہوگا جو سترھویں صدی کے انگلستان اور اٹھارھویں صدی کے فرانس کے پرولتاریہ کی بہ نسبت بہت آگے بڑھ چکا ہے ۔ اور دوسرے اس لئے بھی کہ جرمنی میں بورژوا انقلاب اپنے فوراً بعد آنےوالے پرولتاری انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوگا ۔

مختصر یہ کہ کمیونسٹ ہر جگہ موجودہ سماجی اور سیاسی نظام کے خلاف ہر انقلابی تحریک کی مدد کرتے ہیں ۔

ان تمام تحریکوں میں وہ ملکیت کے سوال کو سامنے لاتے ہیں جو کہ ہر تحریک کا سب سے اہم سوال ہے، خواہ وہ اس وقت اپنی نشوونما کے کسی مرحلے میں کیوں نہ ہو ۔

اور سب سے آخر میں یہ کہ کمیونسٹ ہمیشہ تمام ملکوں کی جمہوری پارٹیوں میں اتحاد اور یک‌جہتی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اپنے خیالات اور مقاصد کو چھپانا کمیونسٹ اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ وہ برملا اعلان کرتے ہیں کہ ان کا اصلی مقصد اسی وقت پورا ہو سکتا ہے جبکہ موجودہ سماجی نظام کا تختہ بزور الٹ دیا جائے۔ حکمراں طبقے کمیونسٹ انقلاب کے خوف سے کانپ رہے ہوں تو کانپیں۔ مزدوروں کو اپنی زنجیروں کے سوا کھونا ہی کیا ہے اور جیتنے کو ساری دنیا پڑی ہے۔

دنیا کے مزدورو، ایک ہو!

مارکس اور اینگلس نے
دسمبر ۱۸۴۷ء — جنوری
۱۸۴۸ء میں لکھا۔
پہلی بار فروری ۱۸۴۸ء میں
جرمن زبان میں لندن سے شائع ہوا۔

۱۸۸۸ء کے انگریزی
ایڈیشن سے ترجمہ
کیا گیا۔

کارل مارکس

مزدوری اور سرمایہ

۱۸۹۱ ء کے ایڈیشن پر فریڈرک اینگلس کا دیباچہ

یہ تصنیف (۲۶) «Neue Rheinische Zeitung» (۲۷) اخبار میں اڈی‌ٹوریل کے سلسلۂ مضامین کے طور پر ۴ اپریل ۱۸۴۹ ء سے اگلی اشاعتوں تک نکلتی رہی۔ کارل مارکس نے ۱۸۴۷ ء میں بروسلز میں جرمن مزدوروں کی سوسائٹی (۲۸) کے سامنے جو لکچر دئیے تھے، وہی لکچر ان مضامین کی بنیاد ھیں۔ تب یہ سلسلہ ناتمام رہا۔ اخبار کے شمارے ۲۶۹ میں مضمون '' باقی آئندہ،، پر رک گیا اور آئندہ کی نوبت نہیں آئی کیوں کہ ایک کے بعد ایک واقعات کا تانتا بندھ گیا — ہنگری پر روسیوں نے چڑھائی کردی (۲۹)، ڈریسڈین میں، ایسرلون میں، ایلبرفیلڈ میں، پفالتس اور باڈین میں بغاوتیں (۳۰) ھو گئیں۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ خود اخبار پر ھی پابندی لگ گئی (۱۹ مئی ۱۸۴۹ ء)۔ مضمون کے باقی سلسلے کا مسودہ بھی کارل مارکس کے انتقال کے بعد ان کے کاغذوں میں نہیں مل سکا (۳۱)۔

'' مزدوری اور سرمایہ،، (Wage labour and capital) کئی ایڈیشنوں میں علاحدہ نکل چکا ھے۔ پمفلٹ کی صورت میں آخری ایڈیشن '' سوئس کوآپریٹیو پریس،، نے ھوٹنگن زورخ سے ۱۸۸۴ ء میں شائع کیا۔ آج تک جتنے ایڈیشن نکلے ان سب میں اصل کے الفاظ جوں کے توں موجود ھیں۔ زیرنظر ایڈیشن کم از کم دس ہزار

کی تعداد میں پرچار پمفلٹ کی حیثیت سے نکلنے والا ہے لہازا یہ سوال سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ کیا موجودہ حالات میں خود مارکس اس کو جوں کا توں شائع کرنے کی اجازت دے دیتا۔

۱۸۴۰ء کے دھلے میں مارکس نے سیاسی معاشیات پر اپنی تنقید مکمل نہیں کی تھی۔ یہ کام کہیں ۱۸۶۰ء سے کچھ پہلے ہوسکا۔ نتیجہ یہ کہ جو تحریریں ''سیاسی معاشیات کی تنقید پر،، کی اشاعت (۱۸۵۹ء) سے پہلے ہو چکی تھیں، وہ بعض مقامات پر ان تحریروں سے ہٹی ہوئی ہیں جو ۱۸۵۹ء کے بعد لکھی گئیں۔ ان میں بعض ایسی ترکیبیں، بلکہ پورے پورے جملے مل جاتے ہیں کہ اگر مارکس کی بعدوالی تحریروں کی روشنی میں دیکھا جائے تو انہیں بےجا تو کیا غلط قرار دینا پڑےگا۔ اب، ظاھر بات ہے کہ معمولی ایڈیشنوں میں، جو عام پبلک کے لئے تیار ہوتے ہیں شروع کے نقطۂنظر کی بھی گنجائش رہنی چاہئے تاکہ اس سے مصنف کی ذھنی اٹھان کا پتہ چلتا رہے۔ مصنف اور پبلک دونوں کو قطعی طور پر یہ حق حاصل ہے کہ ان پرانی تحریروں کو جوں کا توں شائع ہونے دیں۔ اس قسم کے ایڈیشنوں کے موقع پر مجھے خود اس کا گمان بھی نہ گزرتا کہ ان عبارتوں میں سے ایک لفظ بھی ادھر سے ادھر کرنا ہے۔

مگر جب نئے ایڈیشن کا یہ مقصد قرار پایا کہ اسے مزدوروں میں ہی عملی پروپیگنڈے کے لئے استعمال کیا جائے تو پھر یہ اور بات ہے۔ ایسی حالت میں خود مارکس ان پرانے بیانات کو جو ۱۸۴۹ء سے چلے آرہے ہیں اپنے تازہ نقطۂنظر کے سانچے میں ضرور ڈھال کر پیش کرتا۔ مجھے یقین ہے کہ میں وھی طریق اختیار کر رہا ہوں جو مارکس کرتا کہ خاص اس ایڈیشن کے لئے اسے بھی وھی کچھ ترمیمیں اور اضافے کرنے پڑتے جو اس مقصد کی ہر پہلو سے تکمیل کے لئے لازمی ہیں۔ لہازا میں پڑھنےوالے سے پیشگی ہی کہہ دینا چاہتا ہوں: یہ پمفلٹ ویسا نہیں ہے جیسا مارکس نے ۱۸۴۹ء میں لکھا تھا بلکہ تقریباً ویسا ہے جیسا وہ ۱۸۹۱ء میں لکھتا۔ پھر پمفلٹ کی اصل عبارت اتنی بڑی تعداد میں شائع ہو چکی ہے کہ فی‌الحال

اسی کی موجودگی کافی ہے ، جب تک کہ میں اسے پھر سے بغیر کسی کمی بیشی کے بعد میں مکمل ایڈیشن میں شائع نہ کر دوں۔

میں نے جو تبدیلیاں کی ہیں وہ گھوم پھر کر ایک نکتے پر آتی ہیں۔ اصل عبارت میں کہا گیا تھا کہ مزدور اپنی محنت سرمایہ‌دار کے ہاتھ اجرت کی خاطر بیچتا ہے ، یہاں کہا گیا ہے کہ مزدور اپنی قوت‌محنت بیچتا ہے۔ محنت کے بجائے قوت محنت کر دینے کی ایک وجہ ہے میرے پاس۔ یہ وضاحت مزدوروں کے سامنے کرنی ہے تاکہ وہ خود دیکھ لیں کہ یہاں ہم لفظی الٹ پھیر سے کام نہیں لے رہے بلکہ اس کے برخلاف یہ پوری سیاسی معاشیات کا ایک نہایت اہم نکتہ ہے۔ بورژوازی کے سامنے بھی وضاحت کرنی ہے تاکہ وہ قائل ہو جائے کہ بےپڑھے لکھے مزدور ، جن کی خاطر مشکل سے مشکل معاشی تجزیے کو اتنا عام‌فہم بنایا جاسکتا ہے ، وہ ہمارے (بورژوازی کے) اونچی ناک‌والے ان " تعلیم‌یافتہ " لوگوں سے کس قدر بلندوبرتر ہیں جن کے لئے اس قسم کے باریک اور پیچیدہ سوالات زندگی بھر ایک معمہ بنے رہتے ہیں۔

اوپرسے جو سیاسی معاشیات (۳۲) چلی آرہی‌تھی اس نے صنعتی معمول سے " سینوفکچرر " (کارخانہ‌دار) کا موجودہ تصور لے لیا ہے — یعنی وہ شخص جو اپنے مزدور کی محنت خریدتا ہے اور اس کی رقم ادا کرتا ہے۔ سینوفکچرر کی کاروباری ضرورتوں کے‌لئے ، حساب کتاب کے لئے اور قیمتوں کا حساب نکالنے کے لئے تو یہ تصور پورا پڑتا تھا ، مگر جب سادہ لوحی سے اسے سیاسی معاشیات میں لا کر جوڑ دیا گیا تو اس نے واقعی حیرت‌انگیز الجھاوے اور گمراہی پھیلا دی۔

معاشیات اس حقیقت کو مانتی ہے کہ ہر ایک مال کی قیمتیں برابر ادلتی بدلتی رہتی ہیں اور اسی میں وہ مال بھی شمار ہوتا ہے جسے معاشیات کا علم " لیبر " یا محنت کا نام دیتا ہے ؛ قیمتوں کا چڑھنا اترنا بہت ہی مختلف حالات کے کارن ہوا کرتا ہے ، جن حالات کا اکثر تو خود مال کی پیداوار سے بھی کسی قسم کا واسطہ نہیں ہوتا یہاں تک کہ قاعدے کی رو سے قیمتوں کا فیصلہ محض اتفاق وقت سے ہوتا رہتا ہے۔ پس جوں ہی سیاسی معاشیات ایک باضابطہ

علم کی صورت میں سامنے آئی (۳۳) تو اس کے اولین فریضوں میں سے یہ فرض ہونا چاہئے تھا کہ اس قانون کا پتہ لگائے جو مال کی (چڑھتی اترتی) قیمتوں کا ظاھرا فیصلہ کرنےوالے اس ' اتفاق وقت '، کے پیچھے چھپا ہوا ہے اور جو دراصل خود اس اتفاق یا چانس کو اپنے قبضے میں رکھتا ہے۔ مال کی قیمتوں کے دائرے میں جو لگاتار چڑھتی اترتی اور ڈانواڈول رہتی ھیں، سیاسی معاشیات نے اس پائدار مرکز کو تلاش کیا جس کے چاروں طرف قیمتوں کی یہ مندی اور تیزی گھومتی رہتی ہے۔ مختصر یہ کہ اس علم نے مال کی قیمتوں سے شروعات کی تاکہ مال کی قدر (value) کا پتہ نکالا جائے، جو قیمتوں کے چلانےوالے قانون کی حیثیت رکھتی ہے، جس کے ذریعے قیمتوں کے سارے الٹ پھیر کو سمجھا جاسکتا ہے اور آخرکار ساری قیمتیں اسی ویلیو سے متعلق ھو جاتی ھیں۔

چناںچہ کلاسیکی سیاسی معاشیات نے تلاش سے یہ معلوم کر لیا کہ کسی مال کی ویلیو (قدر) اس محنت سے قرار پاتی ہے جو اس میں لگی ھو اور جو اس مال کی پیداوار کے لئے ضروری ھو۔ یہ وضاحت دےکر اس علم کی تسکین ھوگئی۔ ھم بھی اسی نکتے پر زرا ٹھیر جائیں۔ میں غلطفہمی سے بچنے کےلئے پڑھنےوالوں کو یہاں اتنا جتائے دیتا ھوں کہ قیمت اور قدر کی یہ وضاحت آج کے زمانے میں بالکل ناکافی ھو چکی ہے۔ مارکس وہ پہلا شخص تھا جس نے گہرائی میں اتر کر تحقیقات کی کہ محنت کی وہ کونسی خصوصیت ہے جو ویلیو پیدا کرتی ہے اور اسی تحقیق میں سراغ نکالا کہ مال کی پیداوار میں جتنی بھی محنت ظاھرا یا درحقیقت لگنی ضروری ہے، وہ سب کی سب کسی حالت میں بھی اتنی ویلیو (قدر) پیدا نہیں کرتی جتنی محنت اس پر خرچ کی جاتی ہے۔ پس آج اگر یوں ھی ریکارڈو جیسے ماھرین معاشیات کے ساتھ ھم کہتے ھیں کہ کسی مال کی قدر اس محنت سے طے پاتی ہے جو محنت اس مال کی پیداوار میں لگی ھو تو یہ کہتے وقت ھماری نظر میں وہ شرائط بھی رھتی ھیں جو مارکس نے قائم کی ھیں۔ یہاں اسی قدر جتانا کافی تھا۔ باقی مارکس کی

تصنیف ” سیاسی معاشیات کی تنقید پر ،، (۱۸۵۹ ء کی اشاعت) میں دیکھا جائے اور ” سرمایه ،، کی پہلی جلد میں ۔

مگر جیسے هی ماهرین‌معاشیات نے ” ویلیو ،، کا فیصله لیبر سے کرنے کا اصول اس مال پر آزمایا جسے ” لیبر ،، کہتے هیں ، وہ ایک کے بعد ایک خلاف بیانی میں مبتلا هوتے گئے ۔ سوال یه هوا که ” لیبر ،، کی ویلیو کا فیصله کس چیز سے هوتا هے ۔ جواب ملا که اس محنت سے جو لازمی طور سے کھپی هو ۔ مگر مزدور جتنی محنت ایک دن میں ، ایک هفتے ، ایک مہینے ، ایک سال میں کرتا هے ، اس میں لیبر کی مقدار کیا هے ؟ جواب یه که اس میں ایک دن ، ایک هفتے ، ایک مہینے ، ایک سال کی محنت لگی هے ۔ اگر لیبر هی سے تمام قدریں (values) ناپی جاتی هیں تو پھر یقیناً هم ” لیبر کی ویلیو ،، کو خود محنت سے هی ناپ سکتے هیں ۔ لیکن اگر همیں صرف اتنا معلوم هو که محنت کی ایک گھنٹے کی ” ویلیو ،، ایک گھنٹے کی محنت کے برابر هے ، تب بھی همیں قطعی علم نہیں که گھنٹے بھر کی محنت کی ” ویلیو ،، کتنی هوتی هے ۔ اس سے تو هم اپنے مقصد کے ایک انچ بھی نزدیک نہیں پہنچتے ۔ صرف چکر کاٹتے رہ جاتے هیں ۔

تب کلاسیکی سیاسی معاشیات نے دوسری سمت میں بڑھنے کی کوشش کی ۔ اس نے کہا : کسی مال کی ” ویلیو ،، اس کی پیداوار کی لاگت کے برابر هوتی هے ۔ تو پھر سوال هے که محنت کی پیداوار میں کتنی لاگت آتی هے ؟ اس سوال کا جواب دینے کے لئے ماهرین‌معاشیات کو منطق کےساتھ کچھ زور زبردستی کرنی پڑی ۔ محنت کی پیداوار کی لاگت نکالنا بدقسمتی سے ممکن نه تھا ، لہازا انھوں نے یه حساب جمایا که (محنت کی پیداوار نه سہی) مزدور کی پیداوار کی لاگت کتنی آتی هے ۔ یه حساب ٹھیک ٹھیک بتایا جاسکتا هے ۔ اگرچه یہاں بھی وقت اور حالات کی مناسبت سے لاگت مختلف هو جاتی هے ، تاهم سماج کی ایک مقررہ کیفیت ، ایک مقررہ علاقے یا مقام ، اور پیداوار کی کسی مقررہ شاخ میں مقررہ لاگت آتی هے ، کم‌ازکم اس لاگت کی خاصی تنگ حدبندی کی جاسکتی هے ۔ فی الحال هم سرمایه‌داری

پیداوار کے سائے میں جی رہے ہیں جہاں آبادی کی ایک بڑھتی ہوئی تعداد کا طبقہ اسی صورت میں زندگی بسر کر سکتا ہے کہ وہ اجرت کے بدلے ان لوگوں کے لئے کام کرے جو پیداوار کے ذریعوں، یعنی اوزاروں، مشینوں، کچے مال اور ضروریات‌زندگی کے مالک ہوتے ہیں۔ یہ جو موجودہ طریق پیداوار ہے اس کے لحاظ سے مزدور کی پیداوار کی لاگت اتنی ہوئی جتنی ان ضروریات‌زندگی کی مقدار — یا ان کی خریداری کی رقم میں شامل ہو جو اوسط میں مزدور کو کام پر رکھنے کے لئے، کام کے قابل رکھنے کے لئے، اس کی بدلی میں دوسرے کو لانے کے لئے، بڑھاپے، بیماری یا موت کی وجہ سے اس کی جگہ نئے مزدور سے بھرنے کے لئے ضروری ہوں، یعنی یوں کہنا چاہئے کہ مزدور طبقے کی جتنی تعداد رکھنی یا بڑھانی ہے، صرف اتنی ہی تعداد برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہوں۔ چلئے فرض کریں کہ ان ضروریات‌زندگی کی رقم اوسط میں تین جرمن مارک روزانہ ہوتی ہے۔

اس حساب سے مزدور کو اس سرمایہ‌دار سے جو کام پر لگاتا ہے، تین مارک روزانہ ملتے ہیں۔ تین مارک کے بدلے سرمایہ‌دار بارہ گھنٹے روزانہ اس سے کام لیتا ہے اور اس طرح سے حساب جماتا ہے:

فرض کیجئے کہ جو مزدور ہمارے پیش‌نظر ہے وہ مستری ہے، اسے مشین کا ایک پرزہ بنانا ہے جو وہ ایک دن میں تیار کر لیتا ہے۔ پرزے کا کچامال — لوہا اور پیتل جو پہلے سے تیار کی ہوئی ایک مقررہ شکل میں لگتا ہے، اس کی قیمت تھی بیس مارک۔ بھاپ کے انجن میں کوئلہ خرچ ہوا، پھر انجن، لیتھ اور دوسرے اوزار جو اس کام میں استعمال ہوئے، ان کی ایک دن کی گھسائی اور ٹوٹ پھوٹ — یہ سب ملاکر ایک دن اور ایک آدمی کے کام میں آنے کی مقدار ناپی جائے تو سمجھئے کہ ایک مارک کی ویلیو ہو گئی۔ ہم نے شروع میں فرض کیا تھا کہ ایک دن کی اجرت تین مارک ہوتی ہے۔ تو اس ایک پرزے کی تیاری پر ۲۴ مارک خرچ ہوگئے۔ اب سرمایہ‌دار یوں حساب کرتا ہے کہ اوسط میں اسے گاھک سے ۲۷ مارک ملنا چاہئے — یعنی جتنی رقم اس نے لگائی ہے اس سے ۳ مارک زیادہ۔

یہ تین مارک کہاں سے آئے جو سرمایہ‌دار نے اپنی جیب میں ڈال لئے ؟ کلاسیکی معاشیات کا دعوا تھا کہ جتنے مال بازار میں آئے ہیں وہ اوسط میں اپنی ویلیو پر بکتے ہیں ، یعنی ان قیمتوں پر جو مال میں لگی ہوئی لازمی محنت کی مقدار سے میل کھاتی ہیں ۔ مشین کے اس پرزے کی اوسط قیمت جو ۲۷ مارک قرار پائی ہے ، وہ اس لحاظ سے ، پرزے کی ویلیو کے برابر ہونی چاہئے — یعنی اس لیبر کے برابر جو پرزہ تیار کرنے میں شامل ہے ۔ ان ۲۷ مارک میں سے ۲۱ مارک کی ویلیو تو تبھی موجود تھی جب مستری نے اسے ہاتھ لگایا ۔ ۲۰ مارک کچے مال کی ویلیو ، ایک مارک میں دن بھر کے کوئلے کا خرچ ، ان مشینوں اور اوزاروں کا خرچ جو مال کی تیاری میں استعمال ہوئے اور اس رقم میں ان کی گھسائی اور ٹوٹ پھوٹ کی لاگت برابر ہو گئی ۔ اب ۲۷ میں سے چھ مارک ایسے رہے جو کچے مال کی ویلیو میں بڑھائے گئے ہیں ۔ ان ماہرین معاشیات کے مفروضے کے مطابق تو نکلتا ہے کہ یہ چھ مارک صرف اس محنت کا پھل ہیں جو مستری نے کچے مال پر لگائی ہے ۔ اس نے جو بارہ گھنٹے محنت کی ، اسی کی بدولت چھ مارک کی ایک اور ”ویلیو“ (قدر) پیدا ہوئی ۔ اس طرح سے بالآخر ہم کو پتہ چل جاتا ہے کہ لیبر کی ویلیو (قدر محنت) کیا ہوتی ہے ۔

”کیا کہا چھ مارک ؟ “ وہ مستری پکارتا ہے ”ٹھیرو ، مجھے تو صرف تین ہی مارک ملے ہیں ۔ میرا سرمایہ‌دار تو قسمیں کھا کھا کر کہتا ہے کہ میں نے جو بارہ گھنٹے کام کیا اس کی ویلیو تین مارک ہوتی ہے ۔ اگر میں چھ مانگوں تو وہ مذاق اڑاتا ہے ۔ ان دونوں باتوں میں جوڑ کیا ہے ؟ “

اگر ہم پہلے لیبر کی ویلیو نکالتے وقت چکر میں پھنس گئے تھے تو اب ایسے تضاد میں گرفتار ہوئے ہیں جس سے نکلنے کی کوئی سبیل نہیں ۔ ہمیں لیبر کی ویلیو تلاش کرنی تھی اور مل گیا اتنا کچھ جو اٹھائے نہ اٹھے ۔ مزدور کے سامنے ۱۲ گھنٹے کی محنت کی قدر ہے تین مارک ، سرمایہ‌دار کے سامنے وہ ہے چھ مارک ، جس میں سے ۳ مارک وہ مزدور کو دیتا ہے ، تین اپنی جیب میں ڈالتا

ہے۔ اس لحاظ سے محنت کی ایک نہیں، دو دو قدریں نکلیں اور وہ بھی ایک دوسری سے بالکل جداگانہ۔

ان قدروں کو جو رقم کی صورت میں سامنے آئی ہیں، جب محنت کے وقت میں تبدیل کر کے دیکھتے ہیں تو یہ تضاد اور بھی واہیات نظرآتا ہے۔ بارہ گھنٹے کی محنت میں چھ مارک کی اور ویلیو پیدا کی گئی یعنی چھ گھنٹے میں تین مارک کی۔ اتنی رقم کی جو مزدور کو بارہ گھنٹے کام کرکے ملتی ہے۔ بارہ گھنٹے کے کام کے بدلے میں مزدور کو اتنی ''ویلیو'' ملی جو چھ گھنٹے کی محنت کی پیداوار کے برابر ہے۔ اب یا تو لیبر کی دو قدریں ہیں جس میں ایک قدر دوسری قدر کے دگنی ہوتی ہے، یا پھر بارہ کا عدد چھ کے برابر ہوتا ہے۔ دونوں حالتوں میں نتیجہ بکواس۔

چاہے کتناهی هاتھ پاؤں ماریے، اس تضاد سے باہر نکلنے کی سبیل اس وقت تک نہیں مل سکتی جب تک ہم محنت کی خریدوفروخت اور لیبر کی ویلیو پر اڑے رہیں گے۔ ماہرین معاشیات پر بھی یہی بپتا پڑی ہے۔ کلاسیکی سیاسی معاشیات کا جو آخری نمائندہ تھا ریکارڈو کا مکتب خیال، وہ اس گتھی کے بھنور میں پھنس کر رہ گیا۔ استادانہ معاشیات کو اس اندھی گلی سے باہر نکلنے کی راہ نہیں سوجھی۔ وہ شخص جس نے نکلنے کی راہ سجھائی، کارل مارکس تھا۔

وہ جسے ماہرین معاشیات لیبر کی پیداوار کی لاگت سجھے تھے، وہ لیبر کی نہیں بلکہ خود جیتے جاگتے مزدور کی پیداوار کی لاگت تھی۔ اور وہ چیز جو سرمایہ‌دار کے ہاتھ مزدور نے فروخت کی، وہ اس کی محنت نہیں تھی۔ مارکس کہتا ہے کہ ''جیسے ہی اس کی محنت شروع ہوتی ہے، وہ خود اس کی نہیں رہ جاتی، لہاذا بیچنے پر اس کا کوئی اختیار نہیں رہتا''۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہے کہ وہ اپنی آئندہ کی محنت فروخت کرے، یعنی کام کی ایک خاص مقدار ایک مقررہ وقت میں کرنے کی ذمہ‌داری لے۔ اس طرح کرنے میں وہ بہرحال اپنی محنت کا سودا نہیں کرتا (کیوں‌کہ ابھی تو اسے وہ کام کرکے دینا ہے) بلکہ ہوتا یہ ہے کہ مزدور اپنی قوت‌محنت کو مقررہ اجرت کے بدلے سرمایہ‌دار کے سپرد کر دیتا ہے: اگر وقت کے

حساب سے کام مقرر ہو تو مقررہ وقت میں ، اور اگر کام کے ناپ سے اجرت ملتی ہو تو ایک مقررہ کام کے لئے۔ وہ اپنی قوت‌محنت کو کرائے پر اٹھا دیتا ہے یا یوں کہئے کہ بیچ دیتا ہے۔ مگر یہ قوت محنت اس کے وجود سے کوئی الگ چیز نہیں ہوتی ، اس کے دم کے ساتھ پائی جاتی ہے۔ چنانچہ اس قوت محنت کی پیداوار کی لاگت وہی ہوگی جو خود مزدور کی پیداوار کی لاگت ہو۔ ماہرین معاشیات جس چیز کو محنت کی پیداوار کی لاگت کہنے چلے تھے ، وہ دراصل خود مزدور کی پیداوار کی لاگت نکلی اور اسی کے ساتھ ساتھ قوت‌محنت کی پیداوار کی لاگت قرار پائی۔ اب ہم قوت‌محنت کی پیداوار کی لاگت سے ہٹ کر آگے قوت‌محنت کی ویلیو پر آجائیں تاکہ اس بات کا فیصلہ کیا جائے کہ ایک خاص قسم کی قوت‌محنت کی پیداوار کے لئے سماجی لحاظ سے محنت کی کم‌ازکم کتنی مقدار ضروری ہوتی ہے۔ مارکس نے (''سرمایہ'' کی جلد ۱ ، باب ۴ ، فصل ۳ میں) قوت محنت کی خرید و فروخت پر بحث کرتے ہوئے یہی کیا ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ جب مزدور نے اپنی قوت محنت کو سرمایہ‌دار کے ہاتھ بیچ دیا ، یا دنوں ورنہ کام کے حساب سے پہلے سے طے کی ہوئی اجرت کے بدلے اسے سرمایہ‌دار کے سپرد کر دیا تو پھر کیا ہوتا ہے ؟ سرمایہ‌دار اس مزدور کو اپنے کارخانے یا فیکٹری میں لے جاتا ہے جہاں کام کی تمام ضروری چیزیں ، یعنی کچا مال ، کارخانے میں کھپنے والا دوسرا سامان (کوئلہ ، رنگ وغیرہ) ، اوزار ، مشینیں ، سب پہلے سے مہیا ہیں۔ یہاں پہنچ کر مزدور اپنے کام کو ہاتھ میں لیتا ہے۔ اس کی روزانہ اجرت ، جیسا کہ اوپر کہہ چکے ہیں ، فرض کیجئے ، تین مارک ہوگی ، اب چاہے یہ اسے روز کی مزدوری کے حساب سے ملے یا مقررہ کام کی اجرت کے طور پر ، کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہاں پہنچ کر ہم پھر فرض کئے لیتے ہیں کہ بارہ گھنٹے کے اندر مزدور اپنی محنت سے استعمال ہونے والے کچے مال کی ویلیو میں چھ مارک ویلیو بڑھا دیتا ہے۔ یہ چھ مارک کی رقم سرمایہ‌دار کو اس وقت وصول ہوگی جب وہ تیارشدہ چیز بیچ لے گا۔

اس میں سے مزدور کو وہ تین مارک کی اجرت ادا کر دے گا۔ باقی تین مارک اپنے پاس رکھ لے گا۔ اب دیکھئے کہ اگر مزدور بارہ گھنٹے میں چھ مارک کی ویلیو پیدا کرتا ہے تو وہ چھ گھنٹے میں تین مارک کی ویلیو پیدا کرے گا۔ لہازا جب ایک مزدور نے سرمایہ‌دار کے لئے چھ گھنٹے کام کر دیا تو گویا اپنی اجرت میں جو تین مارک کی ویلیو پانی ہے، اس کے بدلے کی ویلیو ہاتھ کے ہاتھ اداکر دی۔ چھ گھنٹے کے کام کے بعد دونوں ایک دوسرے سے سبک‌دوش ہو گئے۔ ایک کا دوسرے پر کوئی واجب بقایا نہیں رہا۔

اب کے سرمایہ‌دار پکارتا ہے ''ٹھیرجاؤ۔ میں نے تو، مزدور کو پورے دن کے بارہ گھنٹے کے لئے لگایا ہے۔ چھ گھنٹے میں تو صرف آدھا دن ہوا۔ باقی کے چھ گھنٹے بھی کام کر کے جاؤ، تب بقایا اداھوگا۔،، واقعہ بھی یہ ہے کہ مزدور کو ''اپنی خوشی سے،، وہ شرط پوری کرنی ہے جس کے مطابق دونوں میں طے ہوا تھا کہ پورے بارہ گھنٹے کام کرے اور اپنی محنت سے وہ چیز تیار کر دے جس کی لاگت ہے محنت کے چھ گھنٹے۔

مقررہ کام پورا کرنے کی جو اجرت دی جاتی ہے وہاں بھی یہی صورت ہے۔ فرض کیجئے ایک مزدور بارہ گھنٹے کے وقت میں کسی مال کے بارہ عددتیار کرتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک عدد پر کچامال اور مشینوں کی گھسائی اور ٹوٹ پھوٹ ملا کر دو مارک لاگت آتی ہے اور ڈھائی مارک فی عدد بکتا ہے۔ تو ہمارے اسی مفروضے کے مطابق سرمایہ‌دار فی عدد تیاری پر مزدور کو ۲۵ پفینگ (چوتھائی مارک) ادا کر دیتا ہے۔ اس طرح مزدور کو بارہ عدد بنانے کے تین مارک ملے، جنھیں کمانے کے لئے اسے بارہ گھنٹے کام کرنا پڑا۔ سرمایہ‌دار کو بارہ عدد پر تیس مارک وصول ہوں‌گے۔ کچے‌مال، ٹوٹ پھوٹ یا گھسائی کے چوبیس مارک اس میں سے نکال دئے، چھ بچے۔ ان چھ میں سے تین مارک اس نے مزدور کو اجرت کے دے دئے۔ تین پھر بچالئے۔ بالکل وھی پہلے کا نتیجہ نکلا۔ اس صورت میں بھی مزدور نے چھ گھنٹے اپنے لئے کام کیا، یعنی اپنی مزدوری کی ادائگی کے لئے (بارہ گھنٹوں میں سے

صرف آدھا وقت اپنے لئے) اور باقی چھ گھنٹے سرمایہ‌دار کے لئے۔

معاشیات کے بہترین ماہر حضرات کو جو مصیبت پیش آئی ہے وہ اس وقت تک چلتی رہےگی جب تک وہ اپنا حساب ''لیبر کی ویلیو،، سے شروع کرتے رہیں گے، اور جہاں ہم نے اس کے بجائے قوت‌محنت (لیبر پاور) کی ویلیو سے شروع کیا، وہ مصیبت بھی گئی۔ آج کے ہمارے سرمایہ‌دارانہ سماج میں قوت‌محنت ایک مال ہے، جیسے اور مال ہوتے ہیں (فروخت کے لئے) یہ بھی ایسا ہی مال ہے — مگر پھر بھی ہے انوکھا مال۔ اس مال کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ویلیو پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، ویلیو کا سرچشمہ ہے، اور اس میں بھی شک نہیں کہ اگر سلیقے سے کام لیا جائے تو جتنی ویلیو اس مال کے اندر موجود ہے اس سے زیادہ ہی دے ڈالتا ہے۔ پیداوار کی جو موجودہ صورت‌حال ہے اس میں انسانی قوت‌محنت ایک دن کے اندر اس سے زیادہ ویلیو تو خیر پیدا کر ہی دیتی ہے جتنی خود رکھتی ہے یا جتنی اس پر لاگت آتی ہے، اس کے سوا، ہر ایک نئے سائنسی انکشاف کے ساتھ، ہر ایک نئی ٹکنیکی ایجاد کے ساتھ یہ ہوتا ہے کہ قوت‌محنت پر جتنی لاگت ایک دن میں آتی ہے، اس لاگت کے تناسب سے زائد پیداوار بھی بڑھتی جاتی ہے، اسی نسبت سے، محنت کے دن کا وہ حصہ جو مزدور اپنی دن بھر کی اجرت کے بدلے میں پیش کرتا ہے، برابر کم ہوتا جاتا ہے — نتیجہ ظاہر ہے کہ محنت کے دن کا وہ حصہ جس میں مزدور کو اپنی محنت سرمایہ‌دار کو بے معاوضہ پیش کرنی ہوتی ہے، وہ برابر بڑھتا جاتا ہے۔

یہ ہے ہماری آج کی سوسائٹی کا پورا معاشی ڈھانچہ : مزدور طبقہ ہی ہے جو تمام قدریں (ویلیوز) پیدا کرتا ہے۔ کیوں‌کہ ویلیو محنت کا ہی دوسرا نام ہے۔ یہ وہ نام ہے جس سے آج کے سرمایہ‌دارانہ سماج میں لیبر کی وہ مقدار مراد لی جاتی ہے جو سماجی طور پر کسی مال کو تیار کرنے کے لئے لازمی ہو۔ جو ویلیو مزدور پیدا کرتے ہیں وہ بہرحال مزدوروں کی ملکیت نہیں ہوتی ہیں۔ وہ ان کی ملکیت ہوجاتی ہیں جو کچےمال، مشینوں، اوزاروں اور ایسے محفوظ

سرمائے کے مالک ہوں جس کی بدولت مالک لوگ مزدور طبقے کی قوتِ‌محنت خرید سکیں۔ چناں‌چہ مزدور طبقہ اپنے ہاتھوں جتنا بھی سامان تیار کر کے ڈھیر لگاتا ہے، بدلے میں خود اس کا ایک حصہ ہی پاتا ہے۔ جیسا کہ ابھی ہم دیکھ چکے ہیں، وہ دوسرا حصہ جو سرمایہ‌دار طبقہ اپنے پاس رکھ لیتا ہے ۔ یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ زمین کے مالک طبقے کے ساتھ اس کا بٹوارہ کر لیتا ہے، وہ حصہ ہر ایک نئے انکشاف یا نئی ایجاد کے ساتھ برابر بڑھتا جاتا ہے جب کہ مزدور طبقے کے ہاتھ پڑنے‌والا حصہ (فی کس کے اندازسے) یا تو بہت ہی آہستہ اور برائے نام بڑھتا ہے یا بالکل نہیں بڑھنے پاتا — بلکہ بعض حالتوں میں تو وہ اور گھٹ جاتا ہے۔

لیکن یہی انکشافات اور ایجادیں جو تیزی کے ساتھ روز بہ روز ایک دوسری سے آگے نکلتی جاتی ہیں، یہ انسانی محنت کی قوت پیداوار جو اس رفتار سے بڑھتی جا رہی ہے جس کا پہلے کبھی گمان نہ تھا، آگے چل کر بالآخر ایسے ٹکراؤ تک پہنچا دیتی ہے جس میں آج کی سرمایہ‌دارانہ معیشت کے ٹکڑے اڑنے ہیں۔ ایک طرف تو دولت کے بے‌شمار انبار لگے ہوتے ہیں اور تیارشدہ سامان کی اتنی افراط ہوتی ہے کہ خریدار انھیں خرید نہیں پاتے، اور دوسری طرف سماج کے ان‌گنت لوگ پرولتاری بن چکتے ہیں، مزدوری پر کام کرنے‌والے رہ جاتے ہیں، خاص اسی کارن ان میں سکت نہیں ہوتی کہ سامان کی اس افراط میں اپنا حصہ بٹا سکیں۔ سماج جب اس طرح تقسیم ہو جاتا ہے کہ ایک چھوٹاسا لیکن نہایت دولتمند طبقہ، اور ایک بڑا لیکن ملکیت سے محروم اور مزدوری پر بسر کرنے‌والا طبقہ تو اس کا نتیجہ ایسے سماج کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے جس میں ایک طرف تو دولت اور سامان کی کثرت سے دم گھٹنے لگے، دوسری طرف سماج کی اکثریت بمشکل، بلکہ نہ ہونے کے برابر، انتہائی محتاجی سے اپنا بچاؤ کر سکے۔ حالات کا یہ رخ روز بہ روز بے‌معنی اور فضول ہوتا جاتا ہے۔ اس کا خاتمہ ہونا چاہئے۔ اس کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔ ایک ایسا سماجی نظام ممکن ہے جس میں موجودہ طبقاتی فرق ناپید ہو چکے ہوں — ایسا سماجی نظام جس میں غالباً مختصر سا دور

محرومی یا مفلسی کا گزر جانے کے بعد، اگرچہ یہ دور بھی اخلاقی لحاظ سے بیش‌قیمت ہی ہوگا، جو بے‌پناہ پیداواری طاقتیں موجود ہیں ان کو باضابطہ طریقے سے کام میں لا کر، ترقی دے کر سب کو ایکسار کام سے لگاکر، گزربسر کے اسباب، زندگی سے لطف اٹھانے کے اسباب، تمام جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں کو بڑھانے اور ان سے کام لینے کے اسباب، سماج کے تمام لوگوں کو برابر میسر آئیں‌گے اور وقت کے ساتھ ساتھ وہ بھی بھر پور ہوتے جائیں گے۔ یہ بات کہ مزدور ایسے سماجی نظام کو زبردستی حاصل کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ عزم کرتے جا رہے ہیں، سمندر کے دونوں ساحلوں پر اپنا منظر دکھائے گی کل پہلی مئی کو اور اتوار کے دن تیسری مئی کو (۳۴)۔

۳۰ اپریل ۱۸۹۱ ء۔ لندن

فریڈرک اینگلس

«Vorwärts» نمبر ۱۰۹،
۱۳ مئی ۱۸۹۱ ء کے ضمیمے
کے طور پر شائع ہوا۔ اور
Karl Marx. «Lohnarbeit und Kapital»
(برلن، ۱۸۹۱ ء) پمفلٹ میں
ضمیمے کے طور پر نکلا۔

کارل مارکس

مزدوری اور سرمایہ

مختلف سمتوں سے انگلی اٹھائی جاتی ہے کہ ہم نے ان معاشی تعلقات کا خاکہ پیش نہیں کیا جن میں آجکل کی طبقاتی اور قومی جدوجہد کی مادی بنیاد موجود ہے۔ ہم نے جان‌بوجھ کر ان تعلقات پر صرف وہاں سرسری گفتگو کی ہے جہاں سیاسی ٹکراؤ میں وہ اول حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔

سب سے مقدم یہ تھا کہ موجودہ تاریخ کی رفتار میں طبقاتی جدوجہد کا سراغ لگایا جائے اور تجربوں کی روشنی میں اس تاریخی مسالے سے جو ہمارے پاس فی‌الحال موجود ہے اور جو روزانہ سامنے آتا جارہا ہے، یہ ثابت کیا جائے کہ فروری اور مارچ میں جو مزدور طبقے نے انقلاب (۳۰) برپا کئے تھے، اس طبقے کی شکست کے ساتھ ساتھ مخالفوں یا حریفوں کو بھی شکست کا سامنا کرنا پڑا ہے، وہ ہیں فرانس کے بورژوا ریپبلکن، اور فرانس کے کیا، پورے برعظم یورپ کے بورژوازی اور کسانوں کے طبقے جو جاگیرداری کی من‌مانی فرماں‌روائی کے مقابلے پر کھڑے ہوئے تھے۔ اور یہ دکھایا جائے کہ فرانس میں ”ایمان‌دارانہ ریپبلک“ کو جو فتح ہوئی وہ ان تمام قوموں کی شکست ہے جو فروری کے انقلاب کو لبیک کہتے ہوئے آزادی کی خاطر جان‌بازی کے ساتھ میدان میں اتری تھیں۔ ثابت کیا جائے کہ انجام‌کار انقلابی مزدوروں کی شکست کے ساتھ یورپ پھر پہلے کی سی دوہری

غلامی میں مبتلا ہو گیا ، وہی انگلستان اور روس کی دوھری غلامی۔ پیرس میں جون مہینے کا مقابلہ (۳۶) ، ویانا کا ھاتھ سے نکل جانا ، برلن میں نومبر ۱۸۴۸ء کا واقعہ ، جو المیہ بھی تھا طربیہ بھی ، پولینڈ ، اٹلی اور هنگری کی جان توڑ کوشش (۳۷) اور آئرلینڈ کا بھوکوں مر کر گھٹنے ٹیک دینا ، یہ ھیں بڑے بڑے واقعات جن میں یورپ کی وہ طبقاتی جدوجہد سمٹ آئی ھے جو بورژوازی اور مزدور طبقے کے درمیان چھڑی ہوئی تھی اور جن کی مثالوں سے ثابت کیا جاسکتا ھے کہ ھر ایک انقلابی اتھل پتھل ، چاھے اس کا مقصد طبقاتی کش مکش سے بظاھر کتنا ھی دور نظر آتا ہو ، بہرحال ناکام ہو کر رھتی ھے جب تک کہ انقلابی مزدور طبقہ فتح یاب نہ ہو جائے ، اور ھر ایک سماج سدھار محض ھوا میں رہ جاتا ھے جب تک کہ پرولتاری انقلاب اور جاگیردارانہ مخالف انقلاب کی صفیں عالمی جنگ میں تلوار سونت کر ایک دوسرے کے سامنے نہ آجائیں۔ ھمارے سامنے یہ تصویر یوں ابھرتی ھے ، جیسی کہ حقیقت میں وہ ھے بھی ، کہ بلجیم اور سوئٹزرلینڈ دونوں اس وسیع تاریخی منظر میں آنسو اور ھنسی کا ملا جلا ایک کارٹونی خاکہ پیش کر دیتے ھیں : بلجیم تو بورژوا شاھی حکومت کے نمونے کی اسٹیٹ اور سوئٹزرلینڈ بورژوا ریپبلک کے نمونے کی ریاست ، دونوں اپنے حساب سے اس خیال میں مگن کہ طبقاتی جدوجہد سے بھی وہ ایسے ھی بے نیاز ھیں جیسے یورپی انقلاب سے۔

اب جبکہ ھمارے پڑھنے والوں نے دیکھ لیا کہ طبقاتی جدوجہد ۱۸۴۸ء میں زبردست سیاسی صورت اختیار کر کے پھیل گئی ، وقت آ گیا ھے کہ ھم ان معاشی تعلقات پر قریب سے بحث کریں جن پر بورژوازی کا وجود اور اس کی طبقاتی حکمرانی ٹکی ہوئی ھے اور جن پر مزدوروں کی غلامی کی بنیاد ھے۔

ھم تین بڑے بڑے حصوں میں اس بیان کو پھیلاتے ھیں : (۱) مزدوری کا سرمائے سے تعلق ، مزدوروں کی غلامی ، اور سرمایہ داروں کی حکمرانی ؛ (۲) موجودہ نظام میں درمیانی درجے کے بورژوا طبقوں کا اور وہ جو بڑے فارموں والا گروہ ھے ، اس کی جاگیروں

کا بہرحال تباہ وبرباد ہونا ؛ (۳) یورپ کی مختلف قوموں کے بورژوا طبقوں کا انگلینڈ کے سامنے، جو ساری دنیا کے مارکٹ پر بے تحاشا حکومت چلاتا ہے، تجارت میں گھٹنے ٹیک دینا اور استحصال کا شکار ہو جانا۔

ہم کوشش کرتے ہیں کہ یہ تمام باتیں نہایت سلیس اور عام‌فہم انداز میں کہی جائیں یہاں تک کہ سیاسی معاشیات کی جو بنیادی اور ابتدائی معلومات ہیں ان سے بھی یہ سوچ کر نہ گزر جائیں کہ پڑھنےوالے کو وہ پہلے سے معلوم ہوں گی۔ ہم چاہتے ہیں کہ مزدور ہماری بات سمجھ لیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ موجودہ نظام کے مستند حمایتیوں سے لے کر، اشتراکی شعبدہ‌بازوں اور علم سیاست کے بےسند اہل کمال تک، جن کے وجود سے یہ ٹکڑوں میں بٹا ہوا جرمنی اپنے ''اسلاف اور مورث اعلا رجواڑوں،، سے زیادہ مالامال ہے، نہایت معمولی اور سادہ معاشی تعلقات کے بارے میں ایک حیرت‌انگیز ناواقفیت عام طور سے پائی جاتی ہے۔

تو اول ہم پہلا سوال لیتے ہیں :

کام کی اجرت کیا ہے ؟
اجرت کیسے طے ہوتی ہے ؟

اگر مزدوروں سے سوال کیا جائے ''تمھاری اجرت کتنی ہے ؟،، تو ایک جواب دےگا ''مجھے مالک سے دن کا ایک مارک ملتا ہے،،، دوسرا کہےگا ''مجھے دو مارک روز کے ملتے ہیں،، وغیرہ۔ محنت کی جس شاخ میں وہ کام کرتے ہیں اس کے انداز سے انھیں مختلف اجرتیں ملتی ہیں اور کاروبار کا مالک ایک مقررہ کام پورا کرنے پر ایک مقررہ اجرت انھیں دیتا ہے، مثلاً ایک گز کپڑا بننے کی اتنی اجرت اور ایک صفحہ ٹائپ کمپوز کرنے کی اتنی۔ اگرچہ اجرت پانےوالوں کے جواب الگ الگ ہوں گے، تاہم ایک پائنٹ پر سب میں اتفاق‌رائے ہوگا کہ اجرت اس رقم کا نام ہے جو کام کے مقررہ

وقت کے بدلے یا محنت کے ایک خاص نتیجے کے بدلے سرمایہ‌دار کی طرف سے دی جاتی ھے۔

اس کے معنی یہ ھوئے کہ سرمایہ‌دار مزدوروں کی محنت (لیبر) روپیہ دے کر خریدتا ھے۔ یہ لوگ اپنی محنت روپے کے عوض بیچتے ھیں۔ مگر یہ تو محض سامنے کی بات ھوئی۔ اصلیت یہ ھے کہ جو چیز یہ لوگ بیچتے ھیں وہ (محنت نہیں) بلکہ ان کی محنت کی قوت ھے۔ سرمایہ‌دار ان سے محنت کی قوت ایک دن، ایک ھفتے یا ایک سھینے کے لئے خرید لیتا ھے۔ اور جب وہ خرید چکا تو پھر مزدور کو ایک طےشدہ وقت کے لئے کام میں لگا کر اس کا استعمال کرتا ھے۔ جتنی رقم میں سرمایہ‌دار نے محنت کی قوت خریدی ھے، فرض کیجئے دو مارک میں خریدی، تو اتنی ھی رقم میں وہ دو پونڈ شکر بھی خرید سکتا تھا، یا کسی اور مال کی کوئی اور مقدار۔ وہ دو مارک جن میں سرمایہ‌دار نے دو پونڈ شکر خریدی وہ شکر کی اس مقدار کی قیمت ھوئی۔ اسی طرح وہ دو مارک جن میں بارہ گھنٹے کی قوت‌محنت کا استعمال خریدا، بارہ گھنٹے کی محنت کی قیمت ٹھیری۔ لہاذا محنت کی قوت ایک ایسا مال ھوا جو شکر کی طرح ھے، نہ اس سے کم، نہ زیادہ۔ لیبر کو گھنٹوں سے ناپا جاتا ھے، شکر کو ترازو سے۔

مزدور اپنے مال یعنی قوت‌محنت کا سرمایہ‌دار کے مال یعنی روپے سے تبادلہ کرتے ھیں۔ اور اس تبادلے میں کوئی نہ کوئی ایک نسبت رکھی جاتی ھے۔ اتنے وقت کی قوت محنت اتنی رقم کے بدلے استعمال کی جائےگی۔ بارہ گھنٹے کپڑا بنائی کے دو مارک۔ اب ان دو مارک کا مطلب کیا وہ مال نہیں ھوا جو میں دو مارک کے بدلے خرید سکتا ھوں؟ مطلب یہ کہ مزدور نے اپنے مال یعنی قوت‌محنت کا سودا کیا ھے ھر قسم کے مال کے بدلے میں ایک خاص نسبت سے۔ سرمایہ‌دارنے اسے دو مارک دئے تو گویا اتنی مقدار گوشت کی، اتنی کپڑے کی، اتنی ایندھن، اتنی روشنی‌وغیرہ کی دے دی، یہ مزدور کے دن بھر کی محنت کے بدلے میں۔ اس حساب سے دو مارک اس نسبت کو ظاھر کرتے ھیں جس نسبت سے قوت‌محنت کا تبادلہ ھوا

دوسرے مال کے ساتھ۔ یہ ہے اس کی قوت‌محنت کی قدرتبادلہ (وہ قدر یا ''ویلیو''، جس پر مال بدلا جا سکے)۔ یہی قدرتبادلہ جب روپیے میں شمار ہوتی ہے تو اس مال کی قیمت کہلاتی ہے۔ کام کی اجرت یا مزدوری ایک خاص نام ہے جس کے معنی ہوتے ہیں قوت‌محنت کی قیمت۔ عام طور سے اسی کو لیبر کی قیمت کہا جاتا ہے، یعنی اپنے قسم کے اس ایک ہی مال کی قیمت، جس کا وجود الگ سے نہیں ہوتا، صرف آدمی کے گوشت پوست میں ہوتا ہے۔

کسی ایک مزدور کو لیجئے، مثلاً بنکر کو۔ سرمایہ‌دار اسے سانچہ اور سوت دیتا ہے۔ بنکر کام پر بیٹھ جاتا ہے اور سوت کا کپڑا بن جاتا ہے۔ سرمایہ‌دار اس کپڑے کو لے کر بیچ ڈالتا ہے، سمجھئے کہ بیس مارک میں بیچا۔ دیکھنا یہ ہے کہ کیا بنکر کی اجرت اس کپڑے میں حصہ‌دار ہے؟ اس بیس مارک میں، اس کی محنت کی پیداوار میں شریک ہے؟ ہرگز نہیں۔ کپڑا ابھی بکا بھی نہیں تھا، بلکہ ابھی اس کی بنائی بھی پوری نہ ہونے پائی تھی کہ بہت پہلے بنکر کو اپنی اجرت مل گئی۔ سرمایہ‌دار اس کو جو اجرت کی رقم دیتا ہے وہ اس کپڑے کی آمد میں سے نہیں ہوتی بلکہ وہ اس رقم میں سے ہوتی ہے جو پہلے سے ریزرو میں رکھی گئی ہے۔ جس طرح وہ سانچہ اور سوت جو مالک کی طرف سے کام کے لئے دیا گیا ہے، خود بنکر کی محنت کا نتیجہ نہیں ہوتا، ٹھیک ایسے ہی وہ مال ہے جو بنکر کو اپنے مال یعنی محنت کی قوت کے بدلے میں ملتا ہے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ مالک کو کپڑے کا کوئی خریدار نہ ملتا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ کپڑے کی فروخت سے اسے اتنی بھی رقم وصول نہ ہوتی جتنی اجرت میں دی جا چکی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بنکر کو جس حساب سے اجرت دی ہے، اس کے مقابلے میں کپڑا کہیں اچھے داموں بیچ لے۔ بنکر سے اس معاملے کا کوئی سروکار نہیں۔ سرمایہ‌دار نے بنکر کی لیبر پاور کو اسی دولت میں سے، اسی سرمائے میں سے خرچ کرکے خریدا ہے جو پہلے سے جمع تھا، اسی طرح جیسے اس نے کچا مال خریدا — سوت اور کام کے اوزار مثلاً سانچے پر بھی اس کا ایک حصہ خرچ کیا۔ جب وہ ساری

خریداری کر چکا اور اسی خریداری میں وہ ” لیبر پاور ،، بھی شامل ہے جو کپڑا تیار کرانے کے لئے لازمی ہے، تو وہ ایک مال تیار کرتا ہے جس میں کچا مال لگاتا ہے اور محنت کے وہ اوزار جو اس کی اپنی ملکیت ہیں۔ محنت کے انھی اوزاروں میں، ظاہر بات ہے کہ یہ بھلا آدمی بنکر بھی شامل ہے جس کا حصہ تیار مال میں یا مال کی قیمت میں ویسے ھی غائب ہے جیسے سانچے کا حصہ۔

نتیجہ یہ نکلا کہ کام کی اجرت اس مال میں جو مزدور نے تیار کیا ہے، مزدور کا حصہ (شئیر) نہیں ہوتی۔ اجرت ایک حصہ (جزو) ہے اس مال کا جو پہلے سے موجود تھا اور جس کے بدلے میں سرمایہ‌دار اپنے لئے پیداواری قوت‌محنت کی کوئی نہ کوئی مقدار خرید لیتا ہے۔

چناں‌چہ قوت‌محنت ایک ایسا مال ٹھیری جو اجرت پر کام کرنےوالا سرمائے کے ھاتھ فروخت کرتا ہے۔ فروخت کیوں کرتا ہے؟ زندگی بسر کرنے کے لئے۔

لیکن قوت‌محنت کا عمل میں آنا، یعنی خود محنت ھی مزدور کی زندگی کی کارگزاری ہے، یہ اس کی اپنی زندگی کا ظھورا ہے۔ یہ سرمایۂحیات وہ دوسرے آدمی کے ھاتھ بیچتا ہے تاکہ ضروریات زندگی حاصل کرسکے۔ مطلب یہ کہ اس کی اپنی زندگی کی کارگزاری (جسے ہم نے سرمایۂحیات کہا) محض ایک ذریعہ ہے جو اس کے وجود کو باقی رکھتا ہے۔ کام وہ اس لئے کرتا ہے کہ جی سکے۔ وہ محنت کو اپنی زندگی کا ایک حصہ نہیں بلکہ زندگی کی قربانی شمار کرتا ہے۔ محنت ایک مال ہے جو اس نے دوسرے کے ھاتھ بیچ دیا۔ اسی کارن وہ مال جو مزدور نے اپنی کارگزاری سے تیار کیا وہ اس کی کارگزاری کا مقصد نہیں ہوتا۔ مزدور خود اپنے لئے نہ تو وہ ریشم تیار کرتا ہے جو اس نے بنا ہے، نہ وہ سونا جو اس نے کان سے نکالا ہے، نہ وہ محل جو اس نے بنا کر کھڑا کیا ہے۔ خود اپنے لئے جو اس نے تیار کیا وہ تو اجرت ہے، رہا ریشم، سونا یا محل، وہ اس کے نزدیک خاص مقدار ہے ضروریات‌زندگی کی۔ وہ

مقدار بھی کیا ! تعجب نہیں جو روئی کی ایک واسکٹ ، تانبے کے چند سکے اور بیٹھی چال کا ایک آدھ کمرہ۔ وہ مزدور جو دن رات میں بارہ گھنٹے بنائی کتائی کرتا ہے ، برمہ چلاتا ہے ، خراد کرتا ہے ، بلڈنگ اٹھاتا ہے ، پھاوڑہ چلاتا ہے ، پتھر کوٹتا ہے ، بوجھ ڈھوتا ہے ، وغیرہ وغیرہ ، کیا بارہ گھنٹے کے ان محنت کے کاموں کو وہ اپنی زندگی کا ظھورا شمار کرتا ہے ؟ اپنی زندگی سمجھتا ہے ؟ نہیں ، اس کے برخلاف ، زندگی اس کے لئے تب شروع ہوتی ہے جب وہ اس کار گزاری سے نمٹتا ہے ، اپنے دسترخوان پر پہنچ کر ، شام کی تفریح کی جگہ پر ، یا اپنے بستر میں۔ غور کیجئے تو یہ بارہ گھنٹے کی محنت بنائی ، کتائی یا برمہ چلانے کی حیثیت سے کوئی معنی نہیں رکھتی بلکہ ایک کمائی کی حیثیت ہے اس کی ، جو کمائی دسترخوان تک ، تفریح کی جگہ تک اور بستر تک پہنچا دیتی ہے۔ اگر ریشم کے کیڑے کو یہ سمجھ کر تار نکالنا پڑے کہ وہ اس کی بدولت رینگنے کی عمر بسر کر لے تو وہ صحیح معنوں میں اجرت پر کام کرنےوالا مزدور ہوگا۔ محنت کی قوت ہمیشہ سے ایک مال نہیں تھی۔ محنت ہمیشہ سے بکتی نہیں آئی ہے — یعنی محنت کو ہمیشہ سے (خریدوفروخت کی) آزادی نہیں تھی۔ بندہ اپنے آقا کے ہاتھ محنت کی قوت فروخت نہیں کرتا ، ٹھیک اسی طرح جیسے بیل اپنی خدمات کسان کو نہیں بیچتا۔ بندہ تو اپنی قوت‌محنت سمیت ایک بار اور ہمیشہ کے لئے آقا کے ہاتھ بک چکا۔ وہ تو ایک مال ہے جو یکےبعددیگرے مالکوں کے قبضے میں جاتا رہتا ہے۔ وہ بذات خود ایک مال (جنس بازار) ضرور ہے ، مگر اس کی قوت‌محنت اپنے قبضے کی جنس نہیں۔ رعایا یا مزارع اپنی قوت‌محنت کا صرف ایک حصہ (جزو) ہی بیچتا ہے۔ زمین کے مالک سے اسے اپنی محنت کا صلہ نہیں ملتا ، بلکہ اور الٹا زمین کا مالک خود اسی سے نذرانہ وصول کیا کرتا ہے۔

مزارع یا رعایا ملکیت ہے آراضی کی — جو بھی پھل آئےگا ، وہ زمین کے مالک کو جائےگا۔ اس کے برخلاف کھلا ہوا مزدور خود اپنے کو بیچتا ہے اور وہ بھی قسطوں میں بیچتا ہے۔ وہ روز

کے روز اپنی زندگی کے آٹھ ، دس ، بارہ ، پندرہ گھنٹے نیلام کرتا ہے، جو زیادہ بولی دے اسی کو — کچے مال ، کام کے اوزار اور زندگی کی ضروریات کے مالک ، یعنی سرمایہ‌دار کو دے ڈالتا ہے - مزدور نہ کسی مالک کی ملکیت ہے ، نہ زمین کی ملکیت ، بلکہ اس کی روزمرہ زندگی کے آٹھ ، دس ، بارہ ، پندرہ گھنٹے اس شخص کی ملکیت ہیں جو انہیں خرید لے - مزدور کے جب جی میں آتا ہے ، جس سرمایہ‌دار سے پہلے سودا کیا تھا ، اسے چھوڑ دیتا ہے اور سرمایہ‌دار جب مناسب دیکھتا ہے کہ اسے مزدور کے کام سے منافع نہیں ہوتا ، یا اتنا منافع نہیں ہوتا جتنا اس‌نے انداز کیا تھا ، وہ مزدور کو الگ کر دیتا ہے - لیکن مزدور جس کی گزر بسر کا واحد ذریعہ قوت‌محنت کو بیچنا ہی ہے ، خریداروں کے پورے طبقے ، یعنی سرمایہ‌دار طبقے کا دامن نہیں چھوڑ سکتا جب تک کہ وہ بھوک کے مارے اپنی زندگی تج دینے کو تیار نہ ہوجائے - وہ کسی ایک یا دوسرے سرمایہ‌دار کی ملکیت نہیں ، بلکہ پورے سرمایہ‌دار طبقے کی ملکیت ہے ، پھر کرنا اس کو یہی ہے کہ اپنا سودا کرے ، اسی سرمایہ‌دار طبقے کے اندر کوئی گاھک تلاش کرے -

اب یہاں سے ، سرمایہ اور مزدوری کے باہمی تعلق کو اور نزدیک سے جانچنے کے پیشتر ، ہم فی‌الحال ان عام تعلقات پر مختصراً نظر ڈالیں‌گے جو اجرت کا فیصلہ کرنے میں زیر غور آتے ہیں -

جیسا کہ ہم نے دیکھ لیا اجرت یا مزدوری دراصل ایک خاص مال کی قیمت ہے اور مال ہے محنت کی قوت - چناں‌چہ اجرت کے فیصلے پر وھی اصول یا قاعدے لاگو ہوں گے جو اور دوسرے مال کی قیمت کا فیصلہ کرتے ہیں -

یہاں سوال یہ اٹھتا ہے کہ : مال کی قیمت کیوں کر طے ہوتی ہے؟

مال کی قیمت کاہے سے طے ہوتی ہے؟

خریدار اور بیچنے‌والے کے درمیان مقابلے سے ، مانگ کا جو تعلق سپلائی سے اور سپلائی کا مانگ سے ہوتا ہے ، اس تعلق کی

بنا پر طے ہوتی ہے ۔ مال کی قیمت کا فیصلہ جس مقابلے سے کیا جاتا ہے ، اس کے تین پہلو ہیں ۔

مال ایک ہے اور بیچنے والے کئی ہیں ۔ اگر مال کی کوالٹی سب کے یہاں ایک سی ہوتو جو سب سے سستا بیچے گا ، دوسرے حریفوں کو میدان سے نکال باہر کرے گا اور بکری میں سب پر حاوی ہو جائے گا ۔ چناں چہ مال بیچنے کے لئے ، مارکٹ کے لئے خود بیچنے والوں کے درمیان کھینچاتانی چلتی رہتی ہے ۔ ان میں سے ہر ایک کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اپنا مال بیچ لے ، زیادہ سے زیادہ بیچ لے اور اگر ممکن ہو تو دوسروں کو مقابلے سے ہٹا کر تن تنہا ہی بیچ لے ۔ اس کی خاطر وہ اوروں سے قیمت گھٹا کر بیچتا ہے ۔ نتیجہ یہ کہ خود بیچنے والوں کے درمیان مقابلہ چلتا ہے اور یہ مقابلہ اس مال کی قیمت جو وہ منڈی میں لاتے ہیں ، گرا دیتا ہے ۔

پھر خریداروں میں بھی مقابلے کا بازار گرم ہوتا ہے اور اس مقابلے کے کارن ، بازار میں لائے جانے والے مالوں کی قیمت بڑھتی ہے ۔

آخرکار بیچنے اور خریدنے والوں کے درمیان مقابلے کی نوبت آتی ہے ۔ خریدار کی خواہش ہوتی ہے کہ کم سے کم داموں پر خریدے ، بیچنے والا چاہتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ داموں پر بیچے ۔ خرایداروں اور بیچنے والوں کے باہمی مقابلے کا انت اس بات پر ہوتا ہے کہ ان دونوں فریقوں کے درمیان کس طرح کا تعلق ہے — یعنی یہ مقابلہ خریدنے والوں کی فوج میں زیادہ سخت ہے یا بیچنے والوں کی فوج میں ۔ صنعت ان دونوں فوجوں کو ایک دوسرے کے مقابل صف آرا کردیتی ہے ، جن میں سے ہر ایک خود اپنی ہی صفوں سے جنگ کرتا رہتا ہے ، اپنی ہی فوج سے لڑتا رہتا ہے ۔ وہ فوج جس کے دستوں میں چھین جھپٹ کم ہو ، آخر وہی فوج اپنے حریف پر فتحیاب ہو جاتی ہے ۔

فرض کیجئے کہ کپاس کی سو گانٹھیں منڈی میں آتی ہیں اور اس وقت ایک ہزار گانٹھ کے خریدار موجود ہیں ۔ ایسی حالت میں بازار کی مانگ مال کی سپلائی سے دس گنی ہوگی ۔ خریداروں میں مقابلہ تیز ہوجائے گا ۔ ان میں سے ہر ایک کی کوشش ہوگی کہ کم از کم

ایک ورنہ ممکن ہو تو ساری سو کی سو گانٹھیں اپنے ہاتھ میں لےلے۔ یہ مثال کوئی فرضی قیاس آرائی نہیں ہے۔ ایسے دور آتے رہے ہیں کہ اس صنعت کی تاریخ میں جہاں کپاس کی فصل بگڑی، چند سرمایہداروں نے مل ملاکر یہ کوشش کی کہ صرف سو گانٹھیں نہیں بلکہ دنیا بھر کی منڈی سے کپاس کا سارا اسٹاک خریدڈالیں۔ چناں چہ یہ جو مثال اوپر دی گئی ہے، اس میں ہر ایک خریدار پوری کوشش کرےگا کہ فی گانٹھ کپاس پر زرا اونچی بولی دےکر دوسرے خریدار کو میدان سے باہر کرے۔ کپاس کے بیوپاری، جنھوں نے منڈی میں مال رکھا ہے، جب دیکھتے ہیں کہ دشمن کی فوج میں سخت کٹاچھنی ہو رہی ہے، اور سو کی سو گانٹھوں کا سودا پٹ جانا یقینی ہے تو وہ چوکس ہو جائیں گے کہ ان کے درمیان ناچاقی نہ ہونے پائے اور خاص ایسے وقت جبکہ سامنےوالوں میں ایک دوسرے سے بڑھ‌کر بولی لگانےوالا ہے، کپاس کے دام گرنے نہ پائیں۔ اس صورت میں بیچنےوالوں کی فوج میں یک دلی ہو جائےگی۔ وہ ایک ہو کر خریداروں کا سامنا کریںگے: فلسفیانہ بےنیازی سے ہاتھ پر ہاتھ رکھ‌کر بیٹھ جائیںگے۔ ان کے منہ مانگے داموں کی کوئی انتہا نہ رہے اگر یوں نہ ہو کہ سب سے بڑھ چڑھ‌کر بولی لگانےوالوں کی بولی بھی آخر کہیں نہ کہیں پہنچ کر تھک جاتی ہے۔

بس، اگر کسی مال کی سپلائی اس کی مانگ سے کم ہو جائے تو بیچنےوالوں کے بیچ، تھوڑا سا کیا، بالکل بھی مقابلہ نہیں ہوتا۔ جس نسبت سے بیچنےوالوں کے درمیان مقابلہ گھٹتا ہے، اسی نسبت سے خریدنےوالوں کے درمیان مقابلہ بڑھتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ کسی مال کے بازار میں کم‌وبیش تیزی آتی رہتی ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے اکثر اوقات اس کے الٹ معاملہ ہوتا ہے اور نتیجہ بھی اس کے الٹ ہی نکلا کرتا ہے: منڈی کی مانگ سے سپلائی کہیں زیادہ رہتی ہے، بیچنےوالوں میں جان توڑ مقابلہ ہوتا ہے، گاہک کی کمی پڑجاتی ہے، اور مال کوڑیوں کے مول بکتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ قیمتوں کا چڑھنا اترنا، تیزی اور مندی کا مطلب کیا ہے؟ خوردبین سے دیکھیں تو ریت کا ایک ذرہ بھی بہت اونچا

نظرآتا ہے اور پہاڑ کے مقابلے میں دیکھئے تو مینار کی بلندی بھی پست دکھائی دےگی۔ اور اگر قیمتوں کا تعین سپلائی اور مانگ کے تعلق سے ہی ہوتا ہے تو خود سپلائی اور مانگ کا تعلق کاہے سے طے ہوتا ہے؟

پہلا بورژوا جو نظر آئے اسی سے ہم یہ سوال کرتے ہیں۔ وہ منٹ بھر کو سوچےگا نہیں بلکہ سکندر اعظم کی طرح، اس مابعد الطبیعاتی گرہ (۳۸) کو جمع مرکب کے قاعدے سے کاٹ کر رکھ دےگا۔ اس کی زبان سے یہ جواب ہوگا کہ میں جس مال کو بیچنا چاہتا ہوں اگر اس میں سو مارک لاگت آئی ہے اور ۱۱۰ مارک میں مال اٹھتا ہے اور اس میں سمجھئے کہ ایک سال لگ جاتا ہے تو میں اٹھا دوںگا اور یہ پکا، ایمانداری کا اور خاصا معقول منافع ہوگا۔ لیکن اگر مجھے اس کے بدلے ۱۲۰ یا ۱۳۰ مارک ملتے ہوں، یعنی بڑھیا منافع، اور اگر اس سے بھی زیادہ ۲۰۰ مارک ملتے ہوں تو کہنا چاہئے کہ یہ غیرمعمولی اور زبردست منافع ہوگا۔ یہاں یہ سوال آتا ہے کہ بورژوا کے نزدیک منافع کا ناپ کیا مقرر ہے؟ مال کی تیاری پر آئی ہوئی لاگت۔ اگر وہ اپنے مال کے بدلے دوسرے مالوں کی وہ مقدار پائے جن کی تیاری میں لاگت کم آئی ہے تو وہ گھاٹے میں رہا۔ اور اگر اپنے مال کے بدلے دوسرے مالوں کی وہ مقدار وصول ہو جن کی تیاری پر زیادہ لاگت آئی ہے تو وہ فائدے میں رہا۔ منافع کی کمی بیشی کا حساب وہ لگاتا ہے اس بات سے کہ اپنے مال کے بدلے میں جو ویلیو ہاتھ آئی وہ صفر سے اوپر ہے یا نیچے یعنی اپنے مال کی پیداوار کی لاگت سے کتنی زیادہ ہے، کتنی کم۔

اب یہ بات نظر میں آ گئی کہ مانگ اور سپلائی کے درمیان جو تعلق یا رشتہ ہے اس میں ادل بدل ہونا ہی کبھی قیمتیں چڑھاتا ہے، کبھی اتارتا ہے، کبھی تیزی لاتا ہے، کبھی مندی۔ اگر ایک مال کی قیمت کافی بڑھی ہے، چاہے وہ مال کی سپلائی ناکافی ہونے کے کارن یا مانگ کے اندادھند بڑھ جانے کے سبب ہو، بہرحال اس کا بڑھنا بتاتا ہے کہ کسی اور مال کی قیمت ضرور اسی نسبت سے گری ہے، کیوں کہ مال کی قیمت تو رقم کی صورت میں اسی نسبت کو

ظاهر کرتی ہے جس نسبت سے دوسرے مال بدلے میں وصول ہوتے ہیں ۔ مثال کے طور پر ایک گز ریشمی کپڑا لیتے ہیں ۔ اگر اس کی قیمت پانچ سے چھ مارک ہو گئی ۔ تو چاندی کی قیمت ریشمی کپڑے کے سامنے گر گئی ۔ صرف چاندی کی نہیں ، دوسرے تمام مال بھی جو پہلے کی قیمتوں پر اٹکے رہ گئے ، ریشم کے سامنے ان کے دام گھٹ گئے ۔ جسے اتنا ھی ریشمی کپڑا لینا ہو ، اب وہ بدلے میں اپنے مالوں کی زیادہ مقدار دے گا ۔ اس طرح جب ایک مال کے دام چڑھیں گے تو اس کا نتیجہ کیا نکلے گا ؟ صنعت کی اسی شاخ کی طرف ، جس کی تیزی ہے ، بہت سارا سرمایہ امنڈ پڑے گا اور روپیہ ڈھونے کی یہ دوڑ تب تک جاری رہے گی جب تک کہ سرمائے کی اس چہیتی صنعت میں بھی منافع کا اوسط معمول پر نہ آجائے یا پیداوار ہوتے ہوتے اتنی فالتو نہ ہو جائے کہ قیمت میں سے لاگت بھی نہ نکل سکے ۔

اس کے برعکس اگر کسی مال کی قیمت اتنی گر جائے کہ اصل لاگت بھی نہ نکل سکے تو سرمایہ اس مال کی تیاری سے منہ موڑ لیتا ہے ۔ سوائے ایسے موقع کے جب کسی صنعت کی کوئی شاخ اپنے زمانے کا تقاضا پورا کرنے کے قابل نہ رہے اور اسے ڈوبنا ھی ہو ، باقی ہر حالت میں اس مال کی پیداوار ، یعنی اس کی سپلائی سرمائے کے منہ موڑ لینے کے کارن برابر گھٹتی چلی جائے گی یہاں تک کہ وہ بازار کی مانگ کے مطابق ہو جائے اور تب اس کی قیمت پھر سے پیداوار کی لاگت کے ساتھ چلے گی بلکہ سپلائی گھٹتے گھٹتے بازار کی مانگ سے بھی نیچے اتر جائے گی ، یعنی وہاں تک گھٹے گی کہ اس کی لاگت کے مقابلے میں قیمت پھر بڑھ جائے ، کیوں کہ مال کی موجودہ قیمت ہمیشہ یا تو لاگت سے اونچی رہتی ہے یا نیچی ۔

ہم نے دیکھ لیا کہ سرمایہ صنعت کی ایک شاخ سے دوسری میں لگاتار ڈولتا رہتا ہے ۔ قیمتیں چڑھ جائیں تو اس صنعت میں سرمائے کی لہر چڑھ جاتی ہے ، قیمتوں کا اتار ہو تو لہر اتر جاتی ہے ۔

دوسرے نقطۂ نظر سے اس مسئلے کو دیکھیں تو یہ بتایا جاسکتا ہے کہ صرف سپلائی پر نہیں ، بلکہ مانگ پر بھی لاگت فیصلہ کن اثر ڈالتی ہے ۔ مگر یہ بحث ہمیں نفس مضمون سے دور لے جائے گی ۔

ابھی ہم نے دیکھا کہ سپلائی اور مانگ کا یہ اتار چڑھاؤ برابر کسی مال کی قیمت کو اس کی لاگت کی سطح پر لےآتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ کسی مال کی اصل قیمت ہمیشہ یا تو اس کی لاگت سے اونچی رہتی ہے یا نیچی۔ لیکن قیمتوں کا یہ چڑھنا یا گرنا آپس میں حساب برابر کر لیتا ہے۔ چناںچہ وقت کے ایک خاص دائرے میں اگر صنعت کی ساری مندی تیزی یا چڑھی اتری قیمتوں کی جوڑ جمع کی جائے تو یہ نکلےگا کہ مالوں کا ایک دوسرے سے تبادلہ پیداوار کی لاگت کی بنا پر ہوتا ہے اور یوں قیمت کا فیصلہ لاگت سے کیا جاتا ہے۔

قیمت کا لاگت کے انداز سے طے کیا جانا ان معنوں میں نہیں سمجھنا چاہئے جن میں ماہرین‌معاشیات نے سمجھا ہے۔ معاشیات‌والے تو کہتے ہیں کہ مال کی اوسط قیمت اس کی پیداوار کی لاگت کے برابر ہوتی ہے۔ بس یہی ان کے نزدیک قانون یا اصول ہے۔ رہی یہ افراتفری، جس میں قیمتوں کا بڑھنا ان کے گھٹنے سے اور گھٹنا بڑھنے سے برابر ہوتا رہتا ہے، یہ ان کی رائے میں محض ایک اتفاقی معاملہ یا چانس کی بات ہے۔ اتنا ہی حق یہ کہنے کا بھی ہے، بلکہ معاشیات کے بعض اور ماہرین نے کہا بھی، کہ قیمتوں کا یہ اتار چڑھاؤ ہی قانون یا اصول نظر آتا ہے اور پیداوار کی لاگت سے قیمتوں کا تعین محض ایک چانس کی‌بات ہے۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ اسی اتار چڑھاؤ کی لپیٹ میں (اگر زیادہ قریب سے چھان بین کی جائے تو وہ نہایت خوفناک تباہی آتی ہے جو شدید زلزلے کی طرح بورژوا سماج کو جڑ بنیاد سے ہلا ڈالتی ہے) صرف اسی اتار چڑھاؤ کے جھٹکوں میں، اسی کی لپیٹ میں یہ ہوتا ہے کہ قیمتیں لاگت کے حساب سے طے کی جائیں۔ اس بےقاعدگی کی ساری جوڑ جمع میں ہی اس کا قاعدہ یا بندوبست موجود ہے۔ اس صنعتی افراتفری کی لپیٹ میں، مقابلہ درمقابلہ کے اسی چکر میں، کہنا چاہئے کہ افراط و تفریط (یا ایک انتہا دوسری انتہا کا) حساب برابر کر دیتی ہے۔

چناں‌چہ ہم دیکھتے ہیں کہ کسی مال کی قیمت اس کی لاگت سے طے ہاتی ہے مگر اس طور پر کہ ایک وقت میں قیمت اصل لاگت

سے اوپر چلی جاتی ہے تو دوسرے وقت میں وہ لاگت سے نیچے اتر آتی ہے اور اس طرح لاگت سے اوپر جاکر یا نیچے اتر کر ایک دوسرے کی تلافی ہو جاتی ہے اور قیمتوں کا لاگت سے تعین ہو جاتا ہے۔ یہ اصول صحیح نہیں بیٹھےگا اگر ہم کسی ایک صنعتی مال کو الگ سے دیکھیں، یہ تبھی صحیح ہوگا جب کسی صنعت کو مجموعی طور پر نظر میں رکھیں۔ اسی طرح یہ اصول کسی ایک علاحدہ صنعت‌کار پر صادق نہیں آتا بلکہ صنعت‌کاروں کے پورے طبقے کو بیک وقت شمار میں لانا چاہئے۔

قیمت کا لاگت سے طے پانا برابر ہے اس بات کے کہ کسی مال کی تیاری پر جتنا وقت محنت لگنا ضروری ہے اس سے قیمت کا طے پانا، کیوں‌کہ لاگت میں دو چیزیں شامل ہوتی ہیں: (۱) کچا مال اور مشینوں اوزاروں کی گھسائی یا ٹوٹ پھوٹ کا خرچ — یعنی وہ صنعتی مال جن کی پیداوار پر محنت کا ایک وقت لگتا ہے اور جو محنت کے ایک مقررہ وقت کا حاصل ہوتے ہیں، اور (۲) براہ‌راست محنت، جس کا ناپ بھی وقت سے ہوتا ہے۔

وہی عام اصول یا قانون جو عام طور سے مال کی قیمت کا فیصلہ کرتے ہیں، اسے گھٹاتے بڑھاتے ہیں، وہی اجرت کا بھی فیصلہ کریں گے جو محنت کی قیمت ہے۔

اجرت یا مزدوری بھی سپلائی اور مانگ کے تعلق سے گھٹے بڑھے گی، "لیبر" کی قوت خریدنےوالوں، یعنی سرمایہ‌داروں اور بیچنےوالوں یعنی مزدوروں کے درمیان مقابلہ جیسی صورت اختیار کرےگا، اجرت بھی ویسا ہی رخ لےگی۔ اجرت کی اونچ نیچ عام طور سے مال کی خرید وفروخت کی قیمتوں میں اونچ نیچ کے مطابق ہوگی۔ پھر اسی چڑھاؤ اتار کی حدوں کے اندر محنت کی قیمت بھی لاگت سے قرار پائےگی، یعنی محنت کے اس وقت سے جو اس مال کو یعنی محنت کی قوت کو تیار کرنے میں لازمی لگتا ہے۔

بس یہیں سے یہ سوال آتا ہے کہ "لیبر" کی قوت تیار کرنے میں کتنی لاگت آتی ہے؟

اتنی لا گت جتنی مزدور کو بحیثیت مزدور برقرار رکھنے میں اور اسے تیار کر کے مزدور بنانے میں آئے۔

اس لئے کسی کام کو سکھانے میں جتنا کم وقت لگے گا، مزدور کی تیاری کی لا گت بھی اتنی ھی کم آئے گی، اور اسی نسبت سے محنت کی قیمت یعنی اجرت بھی کم ٹھیرے گی۔ ان صنعتوں میں جہاں امیدواری یا کام سیکھنے میں کوئی خاص مدت نہیں لگتی، بلکہ مزدور کے محض جسمانی طور پر موجود ہونے سے ھی کام چل جاتا ھے، وھاں مزدور کی تیاری کی لا گت صرف اسی قدر ہوتی ھے جتنے میں وہ زندہ رھے اور محنت کے قابل رھنے کا سامان خرید سکے۔ لہاذا اس کی محنت کی قیمت طے ہوتی ھے ان چیزوں کی قیمت سے جو زندگی گزارنے کے لئے نہایت ضروری ھیں۔

یہاں ایک اور صورت‌حال کو بھی پیش نظر رکھنا چاھئے۔ کارخانے کا مالک جب اپنے مال کی لا گت کا حساب لگاتا ھے اور اس کے انداز سے قیمت آنکتا ھے تو مشینوں اوزاروں کی گھسائی اور ٹوٹ پھوٹ کا خرچ بھی اس میں جوڑ لیتا ھے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی مشین ایک هزار مارک میں آئی ھے اور دس سال کام دینے‌والی ھے تو وہ سو مارک سالانہ اپنے مال کی قیمت میں جوڑ لے گا تاکہ جب دس سال ہونے کو آئیں تو وہ اس رقم سے نئی مشین اس کی جگہ چالو کر دے۔ اسی طرح جب سیدھی سیدھی قوت‌محنت کی لا گت نکالی جائے تو آگے محنت کرنے کی قوت کی لا گت بھی اس میں ملالینی چاھئے تاکہ مزدور آگے کی نسل پیدا کر سکے اور تھکے ہوئے مزدور کی جگہ تازہ دم مزدور آتا جائے۔ چناں‌چہ مزدور کی گھسائی اور ٹوٹ پھوٹ کا بھی ویسے ھی حساب لگایا جاتا ھے جیسے مشینوں اوزاروں کی ٹوٹ پھوٹ کا۔

سادہ قوت‌محنت کی لاگت گویا اتنی ہوئی جتنے میں مزدور خود جیے اور دوسرا مزدور پیدا کرے۔ مزدور کے خود جینے اور نیا مزدور تیار کرنے کی یہی قیمت ھے جسے اجرت کہتے ھیں۔ اس حساب سے جو اجرت (یا مزدوری) طے کی جاتی ھے وہ کم سے کم اجرت کہلاتی

ہے - جس طرح مال کی قیمت کا فیصلہ عام طور سے لاگت پر ہوتا ہے (اسے الگ کسی ایک مال میں نہیں دیکھا جاتا)، اسی طرح کم سے کم اجرت کا معاملہ کسی ایک مزدور تک محدود نہیں بلکہ عموماً مزدوروں کی قسم کے بارے میں صحیح ہے - الگ الگ مزدور، لاکھوں کروڑوں مزدور اتنی اجرت نہیں پاتے ہیں کہ خود بھی جیئیں اور اولاد بھی پال کر تیار کریں، البتہ پورے مزدور طبقے کی اجرت، سارے چڑھاؤ اتار کے دائرے میں اسی کم سے کم اجرت پر آ کر ٹھیرتی ہے -

اب جب کہ ہم اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ وہ کون سے اصول یا قانون ہیں جو دوسرے مالوں کی قیمت کی طرح اجرت گھٹانے بڑھانے کا بھی فیصلہ کیا کرتے ہیں، اپنے نفس مضمون کی طرف زیادہ نپی تلی بات کر سکتے ہیں -

سرمائے میں کچامال شامل ہے، محنت کے مشین اوزار، اور مختلف ضروریات زندگی، یعنی وہ سب سامان، جنھیں کام میں لایا جاتا ہے تاکہ نئے کچے مال تیار کئے جائیں، محنت کے نئے مشین اوزار بنائے جائیں اور ضروریات زندگی تیار کی جائیں - سرمائے کے یہ سارے اجزا محنت کا حاصل ہیں، محنت ہی کی پیداوار ہیں — یہ ایک جگہ ذخیرہ کی ہوئی محنت ہے - ذخیرہ کی ہوئی یہ محنت جو آگے کی نئی پیداوار کا ذریعہ بنےگی — یہ ہے سرمایہ -

یوں فرماتے ہیں معاشیات کے ماہرین -

نیگرو غلام کے کیا معنی؟ معنی یہ کہ سیاہ نسل کا آدمی - چاہے ایسے کہہ لو، چاہے ویسے، بات ایک ہی ہے -

نیگرو تو بہرحال نیگرو ہی رہتا ہے - کچھ خاص ایسے بندھن ہیں جو اسے غلام بنا لیتے ہیں - کپاس کی کتائی مشین بہرحال مشین ہی ہوتی ہے - لیکن کچھ بندھن ایسے ہیں کہ وہ کتائی کی مشین سرمایہ بن جاتی ہے - بندھن توڑدیں تو وہ سرمایہ نہ رہےگی، جیسے ان خاص بندھنوں کے بغیر نہ سونا (ایک دھات کے بجائے) رقم رہےگا، نہ شکر میں شکر کی قیمت رہ جائےگی -

پیداوار کے کام میں لگے ہوئے لوگ صرف قدرت یا فطرت پر ہی اثر انداز نہیں ہوتے بلکہ ایک دوسرے کو بھی متاثر کرتے ہیں -

وہ کسی نہ کسی صورت میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹا کر کام کرتے ہیں اور مل کر ایک دوسرے کے کام کا تبادلہ کرتے ہیں۔ کوئی شے تیار کرنے کی خاطر ان کے آپس میں کچھ خاص بندھن یا رشتے قائم ہو جاتے ہیں اور انھی سماجی رشتوں کے اندر بندھ کر وہ فطرت پر اثرانداز ہوتے ہیں اور مال کی پیداوار ہوتی ہے۔

یہی سماجی رشتے، جن میں مال بنانے والے ایک دوسرے کے شریک ہو جاتے ہیں، جن حالات میں ان کا کام ایک دوسرے سے ہاتھ بدلتا ہے اور پیداوار کے پورے عمل میں ان کی شرکت ہوتی ہے، وہ بھی ذرائع پیداوار کی حیثیت یا نوعیت کے مطابق ایک دوسرے سے بہت مختلف ہوا کرتے ہیں۔ جب کبھی جنگی کارروائی کا کوئی نیا پرزہ، نیا ہتھیار ایجاد ہوا ہے تو فوج کی پوری اندرونی ترتیب لازمی طور سے بدل گئی ہے۔ وہ سمبندھ جن کی بدولت الگ الگ افراد مل کر ایک فوج بنتے ہیں اور ایک فوج کی طرح کام کرتے ہیں وہ بھی کچھ کے کچھ ہو گئے ہیں اور فوجوں کی ایک دوسری سے نسبت میں بھی بڑا فرق آ گیا ہے۔

چناں چہ وہ سماجی تعلقات جن میں رہ کر افراد کچھ مال تیار کرتے ہیں، یا یوں کہو، سماجی پیداواری تعلقات بدل جاتے ہیں، پیداوار کے مادی ذریعوں کی تبدیلی اور ترقی کے ساتھ، پیداواری طاقتوں کے تغیر و تبدل کے ساتھ ان کی شکل بھی بدل جاتی ہے۔ پیداواری تعلقات کا یہی کل مجموعہ ہے جسے سماجی تعلقات کا نام دیا جاتا ہے، یہی سوسائٹی کہلاتا ہے، یہی سارے تعلقات مل ملا کر ایسے سماج کی شکل اختیار کرتے ہیں، جو تاریخی رفتار کے ایک خاص مرحلے پر پایا جاتا ہے، جو اپنا ایک خاص کیرکٹر رکھتا ہے۔ زمانہ قدیم کا سماج، جاگیرداری سماج، بورژوا (سرمایہ دارانہ) سماج کا مطلب ہے اسی قسم کے پیداواری تعلقات کا کل مجموعہ، جو ایک خاص شکل رکھتا ہے اور انسانی تاریخ کے ایک خاص مرحلے کا پتہ دیتا ہے۔

سرمایہ بھی پیداوار کا ایک سماجی تعلق ہے۔ یہ سرمایہ دارانہ تعلق ہے پیداوار کا، جو بورژوا سماج کی دین ہے۔ یہ جو ضروریات زندگی

هیں ، محنت کے مشین اوزار ہیں ، کچامال ہے ، سب مل ملا کر سرمایہ بنتے ہیں ، کیا یہ کسی خاص سماجی حالات کے ماتحت کسی مقررہ سماجی بندھنوں کے سائے میں تیار اور ذخیرہ نہیں ہوتے ہیں ؟ نئی پیداوار کے لئے ان کو جو کام میں لایا جاتاہے تو کیا کسی خاص سماجی حالات ، کسی مقررہ سماجی رشتوں کے بغیر ایسا ہوتا ہے ؟ کیا یہی وہ سماجی کیرکٹر نہیں ہے جو نئی پیداوار کے کام میں لگنے والے تیارشدہ سامان کو سرمائے میں تبدیل کر دیتا یا سرمایہ بنا دیتا ہے ؟

سرمایہ صرف ضروریات زندگی ، محنت کے اوزار اور کچے مال یا محض مادی سامان تک محدود نہیں ہوتا ۔ ان سب کے علاوہ ایک اور چیز بھی سرمائے میں شامل ہے ، اور وہ ہے قدر مبادلہ (اکسچینج ویلیو) ۔ تمام تیارشدہ سامان جن میں سرمایہ لگاہو ، وہ مال ہیں ۔ حاصل یہ کہ سرمایہ صرف مادی سامان کی ہی جمع پونجی نہیں بلکہ سارے کے سارے مال بھی، ان کی قدر مبادلہ بھی اور سماجی مرتبے بھی سرمایہ ہی ہیں ۔

اب چاہے ہم اون کی جگہ روئی رکھ دیں ، گیہوں کی جگہ چاول ، ریلوے کی جگہ پانی کے جہاز ، سرمایہ بہر صورت سرمایہ ہی رہےگا بشرطے کہ روئی ، چاول اور پانی کے جہاز ، جو سرمائے کی ٹھوس شکل ہیں، ان کی اکسچینج ویلیو وہی رہے ، قیمت وہی رہے جو پہلےوالے اون ، گیہوں اور ریلوے میں موجود تھی ۔ سرمائے کی ٹھوس شکل چاہے جتنی ادلتی بدلتی رہے، سرمایے میں کچھ فرق نہیں پڑتا ۔

یہ ضرور ہے کہ ہر ایک سرمایہ تو مالوں کی مجموعی مقدار ہوتا ہے یعنی مبادلے کی تمام قدروں کا مجموعہ ، لیکن مالوں کی ہر کوئی مجموعی مقدار یا مبادلے کی ساری قدریں مل کر سرمایہ نہیں ہوتا ۔

کیسی بھی ہوں ، لیکن مبادلے کی قدریں مل کر مبادلے کی ایک قدر یا اکسچینج ویلیو ہی بنتی ہیں اور ہر ایک الگ الگ اکسچینج ویلیو بھی مبادلے کی قدروں کا مجموعہ ہوتی ہے ۔ مثال کے طور پر

ایک مکان کی حیثیت ایک ہزار مارک کی ہے تو اس مکان کی قدرمبادلہ ایک ہزار مارک ہوئی۔ کاغذ کا کوئی پرزہ ایک پفینگ (پیسے) کا آتا ہے تو اس کی ایکسچینج ویلیو وہی ہوئی سو بٹا سو پفینگ۔ وہ سامان جو دوسرے سامان سے بدلا جاسکے وہ ہے مال۔ وہ بھاؤ یا تناسب جس پر مال بدلے جاتے ہیں، وہ ہے ان کی ایکسچینج ویلیو، یا اگر روپے کی شکل میں دیکھو تو وہ ہے ان کی قیمت۔ ان سامانوں کی مقدار چاہے کتنی ہو، اس خصوصیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا کہ وہ ہوتے ہیں مال ہی، ان میں بہرحال قدرمبادلہ پائی جاتی ہے یا یہ کہ اپنی ایک مقررہ قیمت رکھتے ہیں۔ درخت بڑا ہو یا چھوٹا، ہے بہرحال درخت ہی۔ لوہا ایک مال ہے جسے ہم دوسرے سامان سے بدلتے ہیں، چاہے اونس کے وزن سے بدلیں یا ہنڈرڈویٹ سے، اس کے مال ہونے میں یا ایکسچینج ویلیو ہونے میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جتنی اس مال کی مقدار ہوگی، اسی انداز سے قدر مبادلہ کم یا زیادہ ہو جائےگی، اس کی قیمت کم یا زیادہ شمار ہوگی۔

اچھا تو مالوں کی کوئی مجموعی مقدار، ایکسچینج ویلیو کی کوئی مقدار سرمایہ کیسے بنتی ہے؟

وہ سرمایہ بنتی ہے اس بات سے کہ بذات خود ایک سماجی طاقت کی حیثیت میں، یعنی ایسی طاقت کی حیثیت میں جو سماج کے ایک حصے ہی کے ہاتھ میں ہوتی ہے، براہ راست جیتی جاگتی قوت محنت سے ایکسچینج ہو ہو کر وہ باقی بھی رہتی ہے اور بڑھتی بھی جاتی ہے۔ ایک ایسے طبقے کا وجود ہونا جس کے پاس صرف محنت کی سکت ہو اور کچھ نہیں، بس، سرمائے کی وہی ایک لازمی شرط ہے۔

براہ راست جیتی جاگتی محنت پر جو پہلے کی، ذخیرہ کی ہوئی اور ایک ٹھوس روپ میں سمٹی ہوئی محنت کا غلبہ ہو جاتا ہے، وہی اس ذخیرہ کی ہوئی محنت کو سرمایہ بنا دیتا ہے۔

سرمائے کی اصلیت اس میں نہیں ہے کہ ذخیرہ کی ہوئی محنت جیتی جاگتی محنت کی خدمت میں لگ کر نئی پیداوار کا ذریعہ بن‌جاتی ہے۔ سرمائے کی اصلیت تو اس میں ہے کہ جیتی جاگتی محنت ذخیرہ

کی ہوئی محنت کی خدمت میں لگ کر ایک ذریعہ بن جاتی ہے اسی کی قدر مبادلہ باقی رکھنے اور بڑھانے کا۔

سرمایہداروں اور مزدوری پر کام کرنےوالوں کے درمیان تبادلے میں ہوتا کیا ہے؟

تبادلہ یوں ہوتا ہے کہ مزدور اپنی قوتمحنت کے بدلے میں ضروریات زندگی وصول کرتا ہے اور سرمایہدار ان ضروریاتزندگی کے بدلے میں محنت لیتا ہے، مزدور کی پیداواری کارگزاری وصول کرتا ہے، وہ تخلیقی طاقت لیتاہے کہ جتنی مزدور کے استعمال میں آ گئی، صرف اسی کی کمی پوری نہیں کرتا بلکہ ذخیرہ کی ہوئی محنت (سرمایے) کو اس سے کچھ زیادہ "ویلیو" دے نکلتا ہے جتنی پہلے سے موجود تھی۔ ضروریاتزندگی کی جو چیزیں مہیا ہوئی ہیں، صرف انھی کا ایک حصہ مزدور کو سرمایہدار کی طرف سے وصول ہوتا ہے۔ یہ حصہ اس کے کس کام آیا؟ اس کام کہ ملتے ہی استعمال میں آ گیا۔ ضروریاتزندگی کی یہ چیزیں ایک بار میں نے استعمال کرلیں تو پھر میرے لئے ان کا وجودوعدم برابر ہوگیا بشرطے کہ اسی وقت میں جب کہ میں ان کا استعمال کر رہا تھا، ان کے سہارے جی رہا تھا، ضروریاتزندگی کا اور ایسا سامان تیار نہ کرلوں، اپنی محنت کے بل پر اور ایسی "ویلیوز" نہ نکال‌لوں جو استعمال کے دوران کھپ جانےوالی ویلیوز (قدروں) کی کمی پوری کر دیں۔ لیکن کھپ جانےوالی ویلیو کی جگہ دوسری "ویلیوز" پیدا کرانے کا یہی کار خیر ہے، جس کی قوت ایک مزدور ضروریات زندگی کی چیزوں کے بدلے سرمایہدار کے حوالے کر دیتا ہے۔ اور خود اس سے کورا رہ جاتا ہے۔

یہاں ایک مثال لیتے ہیں: کاشتکار اپنے کھیت مزدور کو دن بھر کے کام پر چاندی کے پانچ ٹکے دیتا ہے۔ اس پانچ ٹکے کے عوض کھیت مزدور سارے دن کاشتکار کے کھیت پر کام کرتا ہے اور اس صورت میں چاندی کے دس ٹکوں کی آمدنی کراتا ہے۔ کاشتکار نے جو "ویلیو" دی اس کی کمی تو پوری کرہی لی، اتناہی اور وصول کیا۔ چناںچہ یہ پانچ ٹکے جو اس نے کھیت مزدور کو دئے ہیں، اس طرح کام میں لگائے کہ ان سے کام بھی بنا، منافع بھی۔

ان پانچ ٹکوں ھی سے اس نے کھیت مزدور کی محنت اور طاقت خریدی جو دوگنی ”ویلیو“ کی زراعتی پیداوار دیتی ھیں اور چاندی کے پانچ ٹکوں کو دس میں تبدیل کرتی ھیں۔ کھیت مزدور نے اپنی اس پیداواری طاقت کے بدلے میں، جس کی کارگزاری کاشت‌کار کے حوالے کر دی تھی، چاندی کے پانچ ٹکے پائے جو وہ ضروریات زندگی کے بدلے میں خرچے گا اور جلد یا بہ‌دیر ان کو استعمال کر کے نمٹادے گا۔ تو معلوم ھوا کہ چاندی کے یہ پانچ ٹکے دو طریقے سے استعمال ھوئے — پیداواری اور نا پیداواری۔ سرمائے نے اسے محنت کی اس قوت * کے بدلے خرچ کیا جو چاندی کے دس ٹکے دیتی ھے، یہ تھا پیداواری طریقہ۔ اور مزدور کے لئے وہ ناپیداواری طریقہ تھا کیوں کہ اس نے ضروریات زندگی کے بدلے میں خرچ کر دئے اور وہ ھمیشہ کے لئے اس کے ھاتھ سے گئے، ان کی ”ویلیو“ پھر سے صرف اسی صورت میں حاصل کر سکتا ھے جب کاشتکار کے ساتھ پھر وھی تبادلے کا عمل دھرائے۔ حاصل یہ کہ سرمائے کے لئے مزدوری (یعنی اجرتی محنت) کا موجود ھونا شرط ھے اور مزدوری کے لئے سرمائے کا موجود ھونا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے مشروط ھیں اور باھم ایک دوسرے کو جنم دیتے رھتے ھیں۔

کسی سوتی مل میں مزدور کیا محض سوتی کپڑا تیار کرتا ھے؟ نہیں، وہ سرمایہ تیار کرتا ھے۔ وہ ایسی قدریں (ویلیوز) پیدا کرتا ھے جو پھر اسی کی محنت پر حکم چلانے کے کام آتی ھیں اور اسی محنت سے آگے چل کر نئی قدریں پیدا کراتی ھیں۔

سرمایہ خود کو صرف محنت کی قوت کے بدلے میں بڑھاتا ھے، صرف اس صورت میں کہ اجرتی محنت میں جان ڈالے (اسے کام میں لگائے)۔ مزدوری پر کام کرنے‌والے کی قوت‌محنت سرمائے سے ھی بدلی جا سکتی ھے بشرطے کہ وہ سرمائے کو بڑھاتی ھو، یعنی اس طاقت

---

* اس مقام پر لفظ ”محنت کی قوت“ (لیبر پاور) اینگلس کا بڑھایا ھوا نہیں بلکہ اس اصل نسخے میں موجود تھا جسے مارکس نے «Neue Rheinische Zeitung» میں شائع کیا۔ (ایڈیٹر)

کو اور بڑھاتی ہو جس کی وہ غلام ہو چکی ہے ۔ لہازا سرمائے کا بڑھنا پرولتاریہ کا ، مزدور طبقے کا بڑھنا ہے ۔

مطلب یہ کہ سرمایہ‌داروں کے اور مزدوروں کے مفاد ایک ہی ہیں — یوں فرماتے ہیں بورژوا اور ان کے ماہرین‌معاشیات ۔ واقعی ! مزدور ہلاک ہو جائے اگر سرمایہ اسے کام نہ دے ۔ اور سرمایہ ڈوب جائے اگر وہ ''لیبر'' کی قوت سے فائدہ نہ اٹھائے ، اور فائدہ اٹھانے کی خاطر اس کا خرید لینا ضروری ہے ۔ وہ سرمایہ جو پیداوار کے کام کے لئے رکھا جاتا ہے ، وہ پیداواری سرمایہ جتنی تیزی سے بڑھے گا ، اتنی ہی زیادہ صنعت پھلے پھولے گی ۔ بورژوازی (سرمایہ‌دار طبقہ) جتنی زیادہ مالدار ہوگی اور کام خوب چلے گا ، سرمایہ‌دار کو اتنی ہی زیادہ مزدوروں کی ضرورت پڑے گی ، اور مزدور خود کو اتنے ہی مہنگے داموں بیچے گا ۔

نتیجہ نکلا کہ مزدور کے لئے گوارا صورت‌حال کی یہی ایک لازمی شرط ہے کہ جتنا بھی ممکن ہو پیداواری سرمایہ تیزی سے بڑھتا چلا جائے ۔

لیکن یہ پیداواری سرمائے کا بڑھنا دراصل ہے کیا ؟ یہ ہے جیتی جاگتی محنت پر ذخیرہ کی ہوئی محنت کا غلبہ بڑھ جانا ۔ یہ ہے مزدور طبقے پر بورژوازی کے اقتدار کا چھا جانا ۔ اگر اجرتی محنت غیر کے لئے وہ دولت پیدا کرتی ہے جو خود اسی پر حکم چلائے ، وہ طاقت پیدا کرتی ہے جو اس سے دشمنی باندھے ہوئے ہے یعنی سرمایہ تو اسی سرمائے سے مزدور کو روزگار بھی [Beschäftigungsmittel] ملتا ہے ، یا یوں کہو ، زندگی بسر کرنے کے ذریعے نصیب ہوتے ہیں ، اس شرط کے ساتھ کہ وہ خود کو پھر نئے سرے سے سرمائے کا حصہ بنائے ، ایسا لیور بنائے جو پھر سرمائے کو تیزی سے بڑھنے والے چکر میں لگادے ۔

اس نکتے پر زور دینا کہ سرمائے اور مزدوروں کے مفاد ایک ہی ہیں ، اصل میں یہ کہنا ہے کہ سرمایہ اور مزدوری یہ دونوں ایک ہی سمبندھ کے دو پہلو ہیں ۔ دونوں ایک دوسرے کے دم سے قائم

ہیں ٹھیک اسی طرح جیسے سودخوار مہاجن اور مفلس‌وقلاش باہم وابستہ ہوتے ہیں۔

جس وقت تک اجرت پر کام کرنےوالا مزدور ، مزدوری پر رہتا ہے ، اس کی تقدیر کا آسرا سرمائے پر رہتا ہے۔ یہی ہے وہ بدنام زمانہ مفادوں کا اشتراک مزدوروں اور سرمایہ‌داروں کے درمیان۔

اگر سرمایہ بڑھتا ہے تو اجرتی محنت کا ذخیرہ، مزدوری پر محنت کرنےوالوں کا ہجوم بڑھتا ہے ، دوسرے لفظوں میں یوں کہیں گے کہ سرمائے کی حکمرانی لوگوں کی اور بڑی تعداد پر پھیلتی ہے ۔ اس کی ایک خوش گوار حالت فرض کرلیں کہ پیداواری سرمائے کے بڑھنے سے ,, لیبر ،، کی مانگ بڑھتی ہے اور لیبر کی قیمت یعنی مزدوری بڑھ جاتی ہے ۔

کوئی مکان چاہے کتناہی چھوٹا ہو لیکن جب تک ارد گرد کے مکان اسی کی طرح چھوٹے ہیں اس وقت تک رہن‌سہن کا سماجی تقاضا اس سے پورا ہو جاتا ہے ۔ لیکن اگر کہیں اس چھوٹے سے مکان کے قریب کوئی محل کھڑا ہو گیا تو وہی مکان دب کر، سمٹ کر نہایت تنگ جھونپڑی رہ جاتا ہے ۔ اب اسی مکان کا چھوٹا سا رہ جانا صرف اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ یا تو مالک مکان بےنیاز ہے یا اس کی ضرورتیں نہایت محدود ہیں۔ تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس چھوٹے سے مکان کا سائز چاہے کتناہی بڑا ہوجائے لیکن اگر وہ قریب کا محل بھی اسی رفتار سے بڑھا یا کچھ اور بھی بڑھ گیا تو نسبتاً چھوٹے مکان کے رہنےوالے اپنی چار دیواری میں خود کو اور بھی سمٹا ہوا محسوس کریں‌گے ، انہیں اور بھی کوفت اور ذلت کا احساس ہوگا۔

اجرت کے کسی قدر بڑھ جانے کے ساتھ ہی پیداواری سرمائے کا تیزی سے بڑھ جانا لگا ہوا ہے ۔ اور پیداواری سرمائے کے تیزی سے بڑھ جانے کا تقاضا ہے کہ اسی حساب سے دولت بھی بڑھے ، عیش‌وعشرت بھی بڑھے ، سماج کی طلب بھی بڑھے اور اس کی آسائشیں بھی بڑھ جائیں۔ اس طرح سے خواہ مزدوروں کو نصیب ہونےوالی راحتیں بھی بڑھی ہوں تاہم وہ سماجی چین آرام جس تک ان کی پہنچ ہوگی ، اس کی حیثیت گر جائےگی کیوں کہ سامنے سرمایہ‌داروں کو کہیں زیادہ عیش وآسائش میسر ہوگا جس تک مزدوروں کی دسترس نہ ہونے پائےگی اور یوں بھی

سماج کی ترقی کی نسبت سے مزدوروں کی راحت کم ھی رھےگی ۔ ھماری طلب اور راحت دونوں ھی سوسائٹی سے پیدا ھوتی ھیں ، اسی لئے ھم سوسائٹی کے پیمانے سے انھیں ناپتے ھیں ، ان چیزوں سے نہیں ناپتے جو دل کی تسلی کے لئے کافی ھوں ۔ ھماری طلب اور ھماری راحتیں دونوں سماجی کیرکٹر رکھتی ھیں ، ان کی حیثیت اضافی ھے (قطعی نہیں ھے) ۔

کام کی اجرت عموماً صرف اس سے طے نہیں ھوتی کہ بدلے میں مال کی کتنی مقدار مجھے وصول ھوئی ۔ کام کی اجرت کے اندر کئی ایک رشتے پائے جاتے ھیں ۔

سب سے اول تو یہ کہ مزدور کو اپنی قوت‌محنت کے بدلے ایک مقررہ رقم ملتی ھے ۔ سوال ھے کہ کیا صرف اسی نقد رقم سے اس کی اجرت کا فیصلہ ھوتا ھے ؟

سولھویں صدی میں یورپ میں سونے چاندی کی مقدار جو گردش کر رھی تھی ، بہت بڑھ گئی کیوں‌کہ پتہ چلا کہ امریکہ کی کانوں میں سونا چاندی بھرا پڑا ھے اور زرا آسانی سے ھاتھ آنے قابل ھو جاتا ھے ۔ اس کی بدولت یورپ میں دوسرے مالوں کے مقابلے میں سونے چاندی کی قدر گرگئی ۔ مزدوروں کو اپنی قوت محنت کے بدلے چاندی کے سکوں میں اتنی ھی رقم ملتی رھی جتنی پہلے ملتی تھی ۔ ان کی محنت کی قیمت رقم میں تو اتنی ھی رھی لیکن ان کی کمائی گرگئی کیوں کہ اتنی ھی رقم کے بدلے میں اب دوسرے مالوں کی کم مقدار ملتی تھی ۔ یہ بھی ایک سبب تھا جس کی بدولت سولھویں صدی میں سرمایہ کافی بڑھا اور بورژوازی کو عروج حاصل ھوا ۔

ایک اور واقعہ لیتے ھیں : ۱۸۴۷ ء کی سردیوں میں فصل خراب ھونے کے کارن ضروریات‌زندگی کی سب سے اھم چیزیں یعنی اناج ، گوشت ، مکھن ، پنیر وغیرہ کی قیمتوں میں بہت تیزی آ گئی ۔ فرض کیجئے مزدوروں کو اپنی قوت محنت کے بدلے اتنی ھی رقم ملتی رھی جتنی پہلے ملا کرتی تھی ۔ تو کیا ان کی اجرت کٹ نہیں گئی ؟ یقیناً کٹ گئی ۔ اتنی ھی رقم کے بدلے میں اب انھیں اناج ، گوشت وغیرہ کی مقدار کم ملنے لگی ۔ اس بار ان کی اجرت کٹنے کا سبب یہ نہیں

تھا کہ چاندی کی ”ویلیو“ کم ہوگئی بلکہ ضروریات‌زندگی کے سامان کی ”ویلیو“ بڑھ گئی۔

آخر میں اب یہ فرض کریں کہ محنت کی قیمت جو نقدی میں ملتی تھی وہ جوں کی توں رہتی ہے لیکن زمین اور مشین سے تیار ہونےوالے مال کی قیمتیں گر جاتی ہیں، چاہے وہ نئی مشینوں کے لگ جانے سے گریں یا فصل بہت اچھی ہو جانے کی یا کسی اور وجہ سے گریں۔ اب مزدور اتنی ہی رقم میں ہر قسم کا مال زیادہ خرید سکتے ہیں۔ چناں‌چہ اس بار ان کی اجرت صرف اس لئے بڑھ گئی کہ نقدی میں اس کی ”ویلیو“ جوں کی توں باقی ہے۔

معلوم یہ ہوا کہ نقدی کی صورت میں جو محنت کی قیمت ملتی ہے، جو نام کی اجرت ہے، وہ اصلی اجرت کے عین مطابق نہیں ہوا کرتی — یعنی مال کی جتنی مقدار اجرت کے بدلے میں وصول ہوتی ہے اس سے یہ رقم‌والی اجرت میل نہیں کھاتی۔ اس لئے جب مزدوری یا اجرت کے بڑھنے یا گرنے کی بات آئے تو ہمیں نظر میں رکھنا چاہئے کہ مطلب صرف اس نقد رقم سے نہیں ہے جو محنت کے بدلے دی جاتی ہے، یہ نام کی اجرت ہے۔

لیکن چاہے نام کی اجرت ہو، یعنی وہ نقد رقم جس کی خاطر مزدور خود کو سرمایہ‌دار کے ہاتھ بیچتا ہے، یا اصلی اجرت ہو، یعنی مال کی وہ مقدار جو اس نقدرقم سے خریدی جا سکے، دونوں سے وہ رشتے پوری طرح ظاہر نہیں ہوتے جو اجرت میں پوشیدہ ہیں۔ اس کے علاوہ مقدم یہ ہے کہ اجرت اس تعلق سے بھی طے ہوتی ہے جو اجرت کو سیٹھ یا سرمایہ‌دار کے منافع سے ہوتا ہے — یہ ہوئی اضافی یا تقابلی اجرت۔

اصلی اجرت یہ ظاہر کرتی ہے کہ محنت کی قیمت دوسرے مالوں کے مقابلے میں کتنی ہوئی۔ اضافی یا تقابلی اجرت محنت کی پیدا کی ہوئی ”ویلیو“ کے اس حصے کو ظاہر کرتی ہے جو براہ‌راست محنت کو وصول ہوا بمقابلہ ”ویلیو“ کے اس حصے کے جو ذخیرہ کی ہوئی محنت یعنی سرمائے کو حاصل ہوا۔

اور صفحہ ۱۱۴ پر* ہم کہہ چکے ہیں کہ " کام کی اجرت اس مال میں جو مزدور نے تیار کیا ہے، مزدور کا حصہ نہیں ہوتی۔ اجرت ایک حصہ (جزو) ہے اس مال کا جو پہلے سے موجود تھا اور جس کے بدلے میں سرمایہ‌دار اپنے لئے پیداواری قوت‌محنت کی کوئی نہ کوئی مقدار خرید لیتا ہے۔" اب دیکھئے کہ سرمایہ‌دار اس دی ہوئی اجرت یا مزدوری کو اس سامان کی فروخت کی رقم میں سے نکالتا ہے جو سامان مزدور نے تیار کیا تھا۔ اجرت کو فروخت کی رقم میں سے اس طرح نکالنا ہوگا کہ، جیسا کہ قاعدہ ہے، سرمایہ‌دار کو جتنی لاگت آئی ہے، اس کے اوپر سے کچھ بچے، کچھ منافع ملے۔ مزدور نے جو مال تیار کیا ہے، اس کی فروخت کی رقم سرمایہ‌دار کے نزدیک تین حصے رکھتی ہے: پہلا حصہ ان قیمتوں کا پورا کرنا جو وہ کچے مال میں پیشگی لگاچکا۔ انھی کے ساتھ مشینوں اوزاروں اور کام کے دوسرے سامان کا خرچ، گھسائی، ٹوٹ‌پھوٹ اور جو بھی رقم ان میں پیشگی لگ چکی ہے۔ دوسرا حصہ وہ رقم جو اجرت میں پہلے دی جاچکی (یا اس مدمیں الگ کی جاچکی) اور تیسرا حصہ جو اوپر سے بچ رہے یعنی سرمایہ‌دار کا منافع۔ اگر فروخت کی رقم کا پہلا حصہ صرف ان قدروں (ویلیوز) کو پورا پڑتا ہے جو پہلے سے موجود تھیں، تو ظاہر بات ہے کہ باقی کے دونوں حصے یعنی اجرت اور منافع اس نئی ویلیو سے نکالے جاتے ہیں جو مزدور کی محنت نے پیدا کی ہے اور جسے کچے مال کی ویلیو میں جوڑ دیا ہے۔ انھی معنوں میں ایک کا دوسرے سے مقابلہ یا موازنہ کرنے کی خاطر ہم یہ کرتے ہیں کہ اجرت اور منافع دونوں کو مزدور کے تیار کئے ہوئے مال کا حصہ قرار دیں۔

اصلی اجرت ممکن ہے جوں کی توں رہے، ممکن ہے بڑھ جائے، تب بھی یہ ہو سکتا ہے کہ تقابلی اجرت گر جائے۔ مثال کے طور پر فرض کریں کہ تمام ضروریات‌زندگی کی قیمتیں دو تہائی گر گئیں اور روزانہ اجرت صرف ایک تہائی کم ہوئی، یا یوں کہہ‌لیجئے

* دیکھئے اس ایڈیشن کا صفحہ ۱۱۴۔ (ایڈیٹر)

کہ تین مارک ملتے تھے اب دو مارک رہ گئے۔ اگرچہ (قیمتوں کے گر جانے کی بدولت) اب مزدور دو مارک میں اس سے زیادہ مال خرید سکتا ہے جتنا وہ تین مارک میں خریدا کرتا تھا، مگر پھر بھی اس کی اجرت سرمایہ‌دار کے منافع کے مقابلے میں گری ہے۔ سرمایہ‌دار یا کارخانے کے مالک کا منافع ایک مارک بڑھا ہے، دوسرے لفظوں میں، مزدور کو سرمایہ‌دار سے جو اجرت ملتی ہے یا کہنا چاہئے کہ اکس‌چینج ویلیوز (مبادلے کی قدریں) وصول ہوتی ہیں اب ان کی کم مقدار کے عوض مزدور کو پہلے سے زیادہ ہی اکس‌چینج ویلیوز پیدا کرنی پڑیں‌گی۔ محنت کو جتنا حصہ ملا، سرمائے کو اس سے زیادہ حصہ وصول ہو گیا۔ سرمائے اور محنت کے درمیان سماجی دولت کی تقسیم میں اور بھی زیادہ نابرابری ہو گئی۔ اسی پہلےوالے سرمائے کی بدولت اب محنت کی اور زیادہ مقدار پر سرمایہ‌دار کا غلبہ ہونے لگا۔ مزدور طبقے پر سرمایہ‌دار طبقے کی حکمرانی اور بڑھ گئی۔ مزدور کی سماجی پوزیشن پہلے سے بھی بدتر ہو گئی، وہ سرمایہ‌دار کی پوزیشن کے سامنے ایک سیڑھی اور اتر گیا۔

تو پھر وہ کون‌سا عام قانون ہے جو اجرت اور منافع کے ایک دوسرے کے سامنے اتار چڑھاؤ کا فیصلہ کرتا ہے؟

اجرت اور منافع ایک دوسرے کے سامنے الٹی سمت کو چلتے ہیں۔ سرمائے کا حصہ یعنی منافع اسی نسبت سے بڑھتا ہے جس نسبت سے محنت کا حصہ، روزانہ اجرت گھٹتی ہے اور یہی گھٹنا بڑھنا دوسری سمت میں بھی ہے۔ منافع اتنا بڑھتا ہے جتنی اجرت گھٹتی ہے اور منافع اتنا گھٹتا ہے جتنی اجرت بڑھ جاتی ہے۔

اس پر اعتراض یہ ہوگا کہ سرمایہ‌دار جو منافع کماتا ہے وہ اپنی پیداوار کو دوسرے سرمایہ‌داروں کی پیداوار کے بدلے فائدے سے نکال کر کماتا ہے، یا اس وجہ سے کہ نئے مارکٹ کھل جاتے ہیں، یا اس سبب سے کہ پرانی منڈی میں اسی پیداوار کی نکاسی اچانک بڑھ جاتی ہے، اس کے مال کی مانگ بڑھ جاتی ہے۔ ان سب باتوں کی وجہ سے ایک سرمایہ‌دار دوسرے سرمایہ‌داروں کی چوٹ

پر منافع لے جاتا ہے ، اجرت کے گھٹنے بڑھنے سے ، قوت محنت کی قدرمبادلہ کے اتار چڑھاؤ سے اسے کوئی واسط نہیں ۔ کسی سرمایہ‌دار کا منافع اس لئے بھی بڑھ سکتا ہے کہ محنت کے اوزار مشین میں بہتری ہو گئی اور قدرتی ذرائع کو زیادہ سلیقے سے استعمال کیا جانے لگا ۔

اول تو یہ ماننا ہوگا کہ چاہے الٹے رخ سے دیکھئے ، نتیجہ وہی رہتا ہے ۔ مان لیا کہ منافع اس لئے نہیں بڑھ گیا کہ اجرتیں گری ہیں ، پھر بھی ضرور ہے کہ اجرتیں اس لئے گری ہیں کہ منافع بڑھ گیا ۔ دوسروں کی محنت کی اتنی ہی مقدار کے بدلے سرمایہ‌دار نے مبادلے کی قدروں کی زیادہ مقدار خریدلی لیکن اس پر بھی محنت کو مہنگے داموں نہیں لیا ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ سرمایہ‌دار کو وہ محنت جس سے کھرا منافع وصول ہوا ہے ، نسبتاً سستی پڑی ۔

اسی سلسلے میں یہ جتا دیا جائے کہ مال کی قیمتوں میں چاہے کتنی ہی تیزی یا مندی آیا کرے ، ہر ایک مال کی اوسط قیمت یعنی وہ نسبت جس پر دوسرے مالوں کے ساتھ تبادلہ کیا جاتا ہے ، وہ بہر حال اس کی لاگت سے ہی طے ہوتی ہے ۔ چناں‌چہ سرمایہ‌دار طبقے میں اگر ایک‌سرمایہ‌دار دوسرے کی چوٹ پر منافع لے جائے تو پھر آخر میں وہ برابر ہی چھوٹتے ہیں ۔ مشینری میں بہتری ہو جائے یا پیداوار کے کام میں قدرتی ذرائع کو زیادہ سلیقے سے لگایا جائے تو اس کی بدولت ایک مقررہ وقت میں محنت اور سرمائے کی اتنی ہی مقدار سے ، پہلے کی بہ‌نسبت زیادہ سامان تیار ہونے لگتا ہے لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ قدرمبادلہ بھی زیادہ وصول ہوگی ۔ اگر کتائی کی نئی جیننگ مشین لگاکر ایک گھنٹے کے اندر میں پہلے سے دوگنا سوت کات لیتا ہوں (مثلاً پہلے پچاس پونڈ سوت تھا اور اب سو پونڈ سوت کات کر رکھ دیتاہوں) تو کچھ آگے چل کر مجھے سو پونڈ سوت کے بدلے میں اوسطاً مال کی اتنی ہی مقدار ملنے لگےگی جتنی پہلے پچاس پونڈ کے بدلے ملا کرتی تھی کیوں‌کہ اب اس کی لاگت آدھی ہوگئی ہے یا کیوں کہ میں اب اتنی ہی لاگت میں دو گنا سامان دے سکتا ہوں ۔

آخر میں یہ نکلا کہ سرمایہ‌دار طبقہ ، بورژوازی ، چاہے وہ

ایک ملک کی ہو ، چاہے ساری دنیا کی منڈی کی اور چاہے جس تناسب سے وہ پیداوار کا کھرا منافع اپنے اندر بانٹ لے لیکن اس منافع کی کل جوڑ جمع بہرحال وہی مقدار ہوگی جو ذخیرہ کی ہوئی محنت میں مجموعی طور سے بڑھائی ہے براہ راست محنت نے ۔ منافع کی کل جوڑ جمع اسی نسبت سے بڑھتی ہے جس نسبت سے محنت سرمائے کو بڑھاتی ہے، یعنی جس نسبت سے اجرت کے مقابلے میں منافع بڑھ جاتا ہے ۔

ہم نے دیکھلیا کہ سرمائے اور مزدوری کے رشتے کی حدوں میں رہتے ہوئے بھی نظر ڈالئے تو سرمائے اور مزدوری (اجرتی محنت) کے مفاد ایک دوسرے کے بالکل برخلاف جاتے ہیں ۔

سرمائے کا تیزی سے بڑھنا برابر ہے اس بات کے کہ منافع تیزی سے بڑھا ۔ اور منافع تیزی سے صرف اس صورت میں بڑھ سکتا ہے کہ محنت کی قیمت یعنی تقابلی اجرت اسی تیزی سے گھٹے ۔ یہ تقابلی اجرت اس صورت میں بھی گر سکتی ہے جب کہ نام کی اجرت یعنی محنت کی نقدرقم بڑھنے کے ساتھ ساتھ اصلی اجرت بھی بڑھ جائے ، بشرطیکہ اصلی اجرت اتنی نہ بڑھی ہو جتنا منافع بڑھا ہے ۔ مثال کے طور پر ایسے وقت جب کاروبار مزے میں چل رہا ہو اجرت پانچ فیصدی بڑھتی ہے اور منافع تیس فیصدی ، تب یہ تقابلی اجرت بڑھی نہیں بلکہ اور گھٹ گئی ۔

اس طرح سے ، اگر مزدور کی آمدنی سرمائے کی تیز رفتار ترقی کے ساتھ بڑھ جاتی ہے تو وہ سماجی خلیج بھی اسی کے ساتھ اور چوڑی ہو جاتی ہے جو مزدوروں اور سرمایہداروں کے درمیان موجود ہے اور پھر ساتھ ساتھ لیبر پر سرمائے کی حکمرانی بھی بڑھ جاتی ہے اور لیبر کا سرمائے کے رحم وکرم پر جینا بھی ۔

یہ کہنا کہ مزدور کا فائدہ اسی میں ہے کہ سرمایہ تیزی سے بڑھے ، دراصل یہ معنی رکھتا ہے کہ : مزدور جتنی تیزی سے غیر کی دولت بڑھاتا ہے ، اتنے ہی چپڑی روٹی کے زیادہ ٹکڑے اس کے آگے ڈالے جاتے ہیں ، اتنے ہی زیادہ مزدوروں کو روزگار میسر آتا ہے اور ان کے وجود کی ضرورت پڑتی ہے اور اتنی ہی زیادہ ان غلاموں کی تعداد بڑھتی ہے جو سرمائے کے رحم وکرم پر جیتے ہیں ۔

اس بحث کا حاصل یہ ہوا کہ :

مزدور طبقے کے لئے جو بہتر سے بہتر صورت‌حال ہو سکتی ہے، سرمائے کا تیزی سے بڑھنا، وہ بھی چاہے مزدوروں کی گزر اوقات کی حالت کتنی ہی اچھی کر دے، لیکن اس ٹکراؤ کو دور نہیں کر سکتی جو بورژوازی یا سرمایہ‌دار کے مفادوں اور مزدور کے مفادوں میں پایا جاتا ہے۔ منافع اور اجرت پہلے کی طرح یہاں بھی ایک دوسرے کے خلاف سمتوں میں چلتے ہیں۔

اگر سرمایہ تیزی سے بڑھے تو اجرت بھی بڑھ سکتی ہے — لیکن سرمایہ‌دار کا منافع بڑھنے کی رفتار کہیں زیادہ تیز ہوتی ہے۔ مزدور کی مادی حالت کچھ سدھری لیکن یہ سدھرنا اس کی سماجی حالت گرجانے کے دم سے ہوا ہے۔ وہ سماجی خلیج جو اسے سرمایہ‌دار سے دور رکھتی تھی، وہ اور چوڑی ہوگئی۔

آخر میں یہ کہ :

اس بات پر زور دینا کہ پیداواری سرمائے کا زیادہ سے زیادہ تیزی سے بڑھنا اجرتی محنت کےلئے بہتر سے بہتر موقعے فراہم کرتا ہے، دراصل یہ معنی رکھتا ہے کہ مزدور طبقہ جتنی تیزی سے اپنے دشمن کی طاقت اور تعداد بڑھائے، اپنے اوپر حکم چلانےوالی غیر کی دولت کو بڑھائے، اتنے ہی عمدہ موقعے فراہم ہوتے ہیں اس بات کے کہ وہ پھر سے محنت کرے، سرمایہ‌دار کی دولت میں اور اضافہ کرے اور سرمائے کی حکمرانی کو اور اوپر تک لےجائے — کام کٹے‌جائے اور اسی میں مگن رہے کہ اپنے ہاتھوں وہ سنہری زنجیریں گڑھ رہا ہے جن میں سرمایہ‌دار اسے جکڑ کر اپنے پیچھے گھسیٹےگا۔

کیا واقعی پیداواری سرمائے کا بڑھنا اور اجرت کا بڑھنا دونوں ایک دوسرے سے بالکل جڑے ہوئے ہیں جیسا کہ بورژوازی کے ماہرین‌معاشیات ہمیں بتاتے ہیں؟ ہم ان کے کہنے کو نہیں مانتے۔ ہم یہ بھی نہیں مانتے کہ سرمائے پر جتنی چربی چڑھےگی اتنا ہی وہ اپنے فرماں‌بردار کو اچھا کھلائےگا۔ بورژوازی کافی ہوشیار ہے، حساب کتاب پر بہت نظر رکھتی ہے، وہ ان جاگیرداروں کے پھیر

میں نہیں پڑنےوالی جو نوکرچاکر کے ٹھاٹھ سے اپنی شان جتایا کرتے هیں - بورژوازی کے حالات‌زندگی هی ایسے هیں که اسے حساب‌کتاب پر بہت نظر رکھنی پڑتی ہے -

اسی‌لئے ضروری هے که هم اس سوال کی تہه میں اتریں که: پیداواری سرمائے کا بڑھنا اجرت پر کیوں کر اثر ڈالتا ہے ؟

اگر بورژوا سماج کا پیداواری سرمایه مجموعی حیثیت سے بڑھتا هے تو یه ظاهر کرتا هے که محنت اور بھی کئی پہلوؤں سے ذخیره کی گئی - سرمایه‌داروں کی تعداد بھی بڑھتی هے اور ان کے سرمائے کا پھیلاؤ بھی - سرمایوں کے بڑھ جانے سے سرمایه‌داروں کے درمیان مقابلے کی گرما گرمی هوجاتی هے - سرمائے کا پھیلاؤ بڑھنا یه امکان پیدا کرتا هے که وه مزدوروں کی زیاده طاقتور فوج کو صنعت کے میدان‌کارزار میں نکال لائے ایسی فوج جس کے پاس مقابلے کے زیاده زبردست هتھیار هوتے هیں -

ایک سرمایه‌دار دوسرے کو میدان سے نکال باهر کرتا هے اور اس کے سرمائے پر بھی هاتھ صاف کردیتا هے، بشرطےکه اس کے مقابلے میں سستا بیچتا هو - مصیبت میں پڑے بغیر سستا بیچنے کےلئے اسے مال سستا بنانا چاهئے یعنی جہاں تک بن پڑے محنت کی پیداواری قوت کو بڑھانا چاهئے - محنت کی پیداواری قوت بڑھانے میں سب سے مقدم یه هے که محنت کی زیاده تقسیم کی جائے ، مشینری کا هر ایک پہلو سے استعمال بھی هو اور مستقل اس کی بہتری بھی هوتی رهے - مزدوروں کی فوج جتنی زیاده هوگی که اسی کے اندر محنت کی تقسیم هوتی هے ، اتنا هی بڑا وه پیمانه هوگا جس پر مشین سے کام لینا هے اور اسی نسبت سے پیداواری لاگت برابر کم هوتی جائےگی — محنت اتنی هی زیاده پیداوار دیتی جائےگی - اسی‌لئے سرمایه‌داروں کے درمیان هر پہلو سے مقابله هوتا هے — ان میں سے هر ایک کی کوشش هوتی هے که محنت کی تقسیم زیاده سے زیاده هو ، مشینوں کی تعداد بڑھے اور ان مشینوں کو زیاده بڑے پیمانے پر کام میں لایا جائے -

اب اگر محنت کی زیاده تقسیم کرکے ، نئی مشینری کا استعمال

کرکے اور ان کو ترقی دے کر ، قدرتی ذرائع کو زیادہ نفع بخش اور وسیع طور پر کام میں لا کر کسی سرمایہ‌دار کو یہ موقع مل جاتا ہے کہ محنت کی اتنی ہی مقدار میں یا ذخیرہ کی ہوئی اتنی ہی محنت میں زیادہ سامان تیار کرلے ، اپنے حریفوں سے زیادہ مال پیدا کرلے ، مثلاً جتنے وقت محنت میں اس کے مدمقابل آدھ گز کپڑا بناتے ہیں ، وہ ایک گز تیار کر لے تو پھر یہ سرمایہ‌دار کیسے قدم اٹھائے گا ؟

وہ اب بھی پہلے کی طرح آدھ گز کپڑا مارکٹ کی اسی پرانی قیمت پر بیچ سکتا ہے ، لیکن ایسا کرے تو نہ وہ اپنے حریفوں کو میدان سے نکال سکتا ہے اور نہ اپنے مال کی نکاسی بڑھا سکتا ہے ۔ اتنے میں جس نسبت سے اس کی پیداوار بڑھی ، اسی نسبت سے بیچنے کی ضرورت بھی بڑھ گئی ۔ پیداوار کے زیادہ مہنگے اور زیادہ طاقتور ذریعے ، جو اس نے کام میں لگائے ، انھی کی بدولت درحقیقت وہ اس قابل ہوا کہ اپنا مال کم قیمت پر نکالے اور وہی اسے مجبور کرتے ہیں کہ پہلے سے زیادہ مال بیچے تاکہ مال کی کھپت کےلئے زیادہ بڑے بازار پر حاوی ہو سکے ۔ نتیجہ یہ کہ وہ سرمایہ‌دار اپنے آدھ گز کپڑے کو حریفوں کے مقابلے میں کم قیمت پر بیچتا ہے ۔

اگرچہ پورے ایک گز کپڑے کی تیاری اس سرمایہ‌دار کو آدھ گز کپڑا بنانےوالوں کے مقابلے میں کچھ مہنگی نہیں پڑی ، تاہم وہ اس پورے گز کو ہرگز اس قیمت پر بیچنے کےلئے آمادہ نہیں ہوگا جس پر حریف آدھ گز کپڑا بیچ رہے ہیں ۔ اگر وہ ایسا کرنے لگے تو اوپر سے کوئی بچت نہ ہو بلکہ صرف لاگت واپس ملے ۔ اب اگر اس کی آمدنی بڑھتی ہے تو صرف اس‌لئے بڑھی کہ زیادہ سرمایہ کام میں لگا دیا ہے ، اس وجہ سے نہیں بڑھی کہ اس کے سرمائے نے دوسرے سرمایوں کے مقابلے میں زیادہ ”ویلیو،، کمائی ۔ پھر یہ بھی ہے کہ اگر وہ اپنے مال کے دام دوسرے حریفوں سے صرف چند فیصدی کم کرکے رکھتا ہے تو اپنی مراد پوری کرلیتا ہے ۔ قیمتیں (بازار بھاؤ سے) گھٹا کر وہ اپنے سامنےوالوں پر بازار تنگ کر دیتا ہے ، یا کم‌ازکم ان کے مارکٹ کا ایک حصہ توڑنے میں کامیاب ہوجاتا ہے ۔ اور آخر میں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ چالو قیمت

(بازار بھاؤ) ہمیشه یا تو لاگت سے اوپر ہوتی ہے یا نیچے ، دار و مدار اس بات پر ہے که صنعت کا بازار کیسا جارہا ہے ، گرم یا نرم ۔ اب جس سرمایه‌دار نے پیداوار کے زیادہ مفید مطلب اور نئے ذریعے کام میں لئے ہیں ، وہ اپنا مال اصل لاگت سے کتنے فیصدی بڑھاکر بیچے اس میں فرق پڑےگا اور یه طے کرنا منحصر ہوگا اس پر که آیا فی گز کپڑے کا بازار بھاؤ تب‌تک کی عام لاگت سے اونچا جا رہا ہے ، یا نیچا ۔

بہرحال اس سرمایه‌دار کی یه اونچی پوزیشن بہت زمانے تک نہیں چلتی ۔ سامنے کے دوسرے سرمایه‌دار بھی وہی مشینیں لگا دیں‌گے ، محنت کی تقسیم ویسی ہی یا اس سے بھی بڑے پیمانے پر کردیں‌گے اور یه سلسله اتنا عام ہوجائےگا که کپڑے کی قیمت نه صرف پرانی بلکه نئی لاگتوں سے بھی نیچے اتر جائےگی ۔

چناں‌چه سرمایه‌دار باہم اسی حالت میں پہنچ جاتے ہیں جس میں وہ پیداوار کے نئے ذریعے اختیار کرنے سے پہلے تھے ۔ اور اگر ان ذریعوں کے اختیار کرنے کی بدولت پچھلی قیمت پر پہلے سے دوگنا مال دینے کے قابل ہوئے تھے تو اب وہ مجبور ہوتے ہیں که پہلے سے بھی کم قیمت پر مال کی دوگنی مقدار کی نکاسی کریں ۔ نئی لاگتوں کے حساب سے وہی کھیل کا چکر پھر چل پڑتا ہے — محنت کی اور زیادہ تقسیم اور زیادہ مشینری ، محنت کی تقسیم اور مشینری سے اور زیادہ بڑے پیمانے پر کام لینا ۔ پھر مقابله درمقابله ، پھر اسی نتیجے کی جوابی کارروائی کا سلسله چھڑتا ہے ۔

ہم نے دیکھ لیا که کس طرح سے پیداوار کے طریق اور پیداوار کے ذرائع لگاتار نئے سانچوں میں ڈھلتے اور انقلاب سے گزرتے رہتے ہیں ، کس طرح محنت کی تقسیم لازمی طور پر اور زیادہ تقسیم در تقسیم کی طرف لےجاتی ہے ، مشینری کا استعمال مشین کے اور زیادہ وسیع استعمال کو لاتا ہے اور بڑے پیمانے کی پیداوار اس سے بھی زیادہ بڑے پیمانے کی پیداوار کو اپنی لپیٹ میں لاتی ہے ۔

یه ہے وہ قانون جو باربار نئے سرے سے سرمایه‌دارانه پیداوار

کو اس کے پرانے کھانچے سے نکال دیتا ہے اور سرمائے کو مجبور کرتا ہے کہ وہ محنت کی پیداواری طاقت کو تیزی سے دوڑائے کیوں کہ اس نے ان طاقتوں کو پہلے بھی دوڑایا تھا۔ یہ ہے وہ قانون جو سرمائے کو دم بھر چین نہیں لینے دیتا اور برابر اس کے کان میں پھونکتا رہتا ہے کہ — ”ابھی اور، ابھی اور آگے!“

یہ خاص وہی قانون ہے جو کاروبار میں تیزی مندی کے دائرے میں رہ کر مال کی قیمت کو، چاہے کچھ ہو، لیکن مال کی لاگت کے برابر لے آتا ہے۔

کوئی سرمایہ‌دار چاہے کتنے ہی زبردست پیداوار کے ذرائع میدان میں کیوں نہ اتار لائے لیکن (سرمایہ‌داروں کے آپس کا) مقابلہ ان ذریعوں کو عام کرتا جائے گا اور جیسے ہی وہ عام ہوں گے، اپنے سرمائے کا پہلے سے بھی زیادہ فائدہ اٹھانے کا واحد نتیجہ یہ ہوگا کہ اب اسے اتنی ہی قیمت میں پہلے سے دس بیس یا سو گنا مال دینا چاہئے۔ بہت ہی گرے ہوئے بھاؤ کو پورا پڑنے کے لئے چوں کہ اسے غالباً پہلے سے ہزار گنا مال بیچنا ہوگا تاکہ مال کی زیادہ نکاسی کی جائے اور اب فروخت کا زیادہ پھیلاؤ ضروری بھی ہوگا صرف منافع کمانے کی خاطر نہیں، بلکہ لاگت کا حساب برابر کرنے کے لئے بھی یہ ضروری ہوگا — اور جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، پیداوار کے مشین اوزار پر بھی زیادہ خرچ آنے لگتا ہے، — مال کی زیادہ نکاسی اس لئے بھی ضروری ہوجاتی ہے کہ یہ نہ صرف اس ایک سرمایہ‌دار کے لئے بلکہ اس کے حریفوں کے لئے بھی زندگی اور موت کا سوال بن جاتا ہے، تو پھر وہی پرانی کشمکش، پیداوار کے نئے ذریعے جتنے زیادہ کارآمد ہوتے ہیں، اتنی ہی شدت سے شروع ہوجاتی ہے۔ محنت کی تقسیم اور مشینری کا استعمال نئے سرے سے اور کہیں بڑے پیمانے پر برابر جاری رہتا ہے۔

پیداوار کے جو ذریعے کام میں لگائے جاتے ہیں وہ چاہے کتنے ہی زبردست کیوں نہ ہوں، مقابلے کا سارا زور اس پر ہوتا ہے کہ مال کی قیمت کو لاگت تک پہنچا کر سونے کا وہ انڈا سرمائے سے

چھین لے جو پیداوار کے زبردست ذریعوں نے اسے دیا ہے۔ یعنی اتنی ہی مجموعی قیمت میں اسے سامان کی زیادہ بڑی مقدار سپلائی کرنی پڑے، یہ ایسا قانون ہے جو وہاں تک اثر دکھاتا ہے جہاں‌تک پیداوار کو سستا کیا جا سکے، یا یوں کہیں کہ محنت کی اتنی ہی مقدار میں اس سے زیادہ پیدا کیا جا سکے۔ چناں‌چہ سرمایہ‌دار کو اپنی ساری بھاگ‌دوڑ سے سوا اس کے کچھ حاصل ہونےوالا نہیں کہ وہ اتنے ہی وقت محنت میں زیادہ مال سپلائی کرنے کی ذمہ‌داری اپنے سر لے، مطلب یہ کہ سرمائے کی ”ویلیو،، بڑھانے کی شرطیں اب اور زیادہ سخت ہو جاتی ہیں۔ چناں‌چہ سرمایہ‌داروں کے درمیان مقابلہ لاگت اور قیمت کے تناسب کا قانون لئے ہوئے برابر سرمایہ‌دار کا پیچھا کرتا رہتا ہے اور وہ جو بھی ہتھیار اپنے حریفوں کے مقابلے کےلئے تیار کرتا ہے، وہ الٹ کر اسی کے لگتا ہے۔ سرمایہ‌دار مسلسل اس کوشش میں رہتا ہے کہ نئی مشینری لگاکر، جس کا خرچ زیادہ سہی، تاہم مال کی لاگت کم ہوجائے، محنت کے پرانے ڈھچر کی جگہ نئی تقسیم لاکر، مقابلے میں لگے ہاتھوں کچھ فائدہ اٹھالے۔ جب‌تک مقابلے کی نفسانفسی نئی تدبیروں کو نکما کرے وہ انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھا رہتا۔

اب ہم زرا تصور کریں کہ یہ بےتابی کی سرسامی حالت تمام دنیا کی منڈی پر چھاجاتی ہے تو ہماری سمجھ میں آجائےگا کہ سرمائے کا بڑھنا، اس کا ذخیرہ ہونا اور چند ہاتھوں میں سمٹ جانا ادھر لےجاتا ہے کہ محنت کی تقسیم، نئی مشینری کا لگنا اور پرانی کا ترقی دیا جانا لگاتار جاری رہے، ہر پچھلا قدم آگے پڑے اور یہ عمل پہلے سے کہیں زیادہ زبردست پیمانے پر ہوتا رہے۔

یہ اسباب جو پیداواری سرمائے کے بڑھنے کے دم کے ساتھ لگے ہیں، یہ اجرت کے فیصلے پر کس طرح اثر ڈالتے ہیں؟

محنت کی جتنی زیادہ تقسیم ہوگی وہ ایک مزدور کو پانچ یا دس یا بیس مزدوروں کا کام کرنے کا موقع دیتی جائےگی۔ لہازا اس کی بدولت خود مزدوروں میں بھی مقابلہ پانچ یا دس یا بیس گنا ہوتا

جائے گا۔ مزدوروں میں جو مقابلہ ہوتا ہے وہ صرف اسی میں نہیں کہ کون اپنے آپ کو دوسرے سے سستا بیچے، بلکہ اس میں بھی کہ کون مزدور پانچ یا دس یا بیس کا کام کرکے دکھاتا ہے۔ محنت کی تقسیم جو سرمائے کی لائی ہوئی اور لگاتار اسی کے ہاتھوں بڑھائی ہوئی ہے وہ مزدوروں کو مجبور کرتی ہے کہ وہ بھی ایک دوسرے سے ایسا مقابلہ کریں۔

جیسے جیسے محنت کی تقسیم بڑھتی جاتی ہے، محنت کا کام سادہ ہوتا جاتا ہے۔ مزدور کی خاص ہنر مندی بےمعنی ہوکر رہجاتی ہے۔ اب اسے نہ شدید جسمانی مشقت سے کام لینا ہے نہ دماغی قابلیت سے بلکہ وہ ایک سادہ سی پیداواری طاقت ہوکر رہ جاتا ہے جسے برابر ایک ہی کام کرتے رہنا ہے۔ اب اس کی ''لیبر'' ایسی ہے جو کوئی بھی انجام دے سکتا ہے۔ اب اس پر بھی ہر طرف سے مقابلے کے کام کرنےوالے ٹوٹ پڑتے ہیں۔ یہاں پڑھنےوالوں کو (پہلے کا یہ نکتہ) ذہن میں رکھنا چاہئے کہ کوئی ''لیبر''، جتنی عام‌فہم یا سیکھنے میں آسان ہوگی، اس پر ہاتھ بٹھانے کی لاگت جتنی کم ہوجائےگی اتنی ہی اس کی اجرت بھی گھٹ جائےگی کیوں‌کہ ہر ایک مال کی قیمت کی طرح اجرت کا فیصلہ بھی اس کی لاگت سے ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ محنت جتنی کم اطمینان بخش ہوتی جائےگی، جتنی اکتاہٹ پیدا کرنےوالی ہوگی، اتناھی مزدوروں کے درمیان مقابلہ بڑھےگا اور اجرت کم ہوگی۔ مزدور کی کوشش ہوتی ہے کہ اجرت کی رقم میں جو گھٹت ہوئی ہے اسے وہ زیادہ کام سے پورا کرے، چاہے زیادہ وقت دےکر، چاہے اتنے وقت میں زیادہ مال تیار کرکے۔ اپنی ضروریات کے ہاتھوں وہ مجبور ہوتا ہے کہ محنت کی تقسیم کی بری تاثیر اور بڑھادے۔ انجام یہ کہ جتنا زیادہ وہ کام کرتا ہے، اجرت اتنی ہی کم وصول ہوتی ہے۔ اور چوں کہ وہ جتنا زیادہ کام دیتا ہے، اتنا ہی زیادہ اپنے ساتھ کے کام کرنےوالوں سے مقابلہ بڑھاتا جاتا ہے اور ان کو اپنا حریف یا مدمقابل بنالیتا ہے ایسے مدمقابل جو خود بھی اسی کی طرح انھی بری شرطوں پر اپنے آپ کو پیش کرنے لگتے ہیں۔ اس سیدھے اور صاف سبب سے نوبت یہاں

تک پہنچتی ہے کہ مزدور خود اپنے وجود سے مقابلے پر اتر آتا ہے ، مزدور طبقے کے ایک فرد کی حیثیت سے خود اپنا حریف بن جاتا ہے۔

مشینوں کی تاثیر بھی یہی ہے لیکن کافی بڑے پیمانے پر۔ مشینری ہنرمند مزدور کو ہٹاکر کم ہنر یا بےہنر کو ، مرد کی جگہ عورت کو ، بڑے کی جگہ بچے کو لگا دیتی ہے۔ جہاں نئی ایجاد کی مشینری آتی ہے وہاں ہاتھ کے کاریگروں کی بڑی سے بڑی تعداد مارے مارے پھرنے پر مجبور کی جاتی ہے اور جہاں پرانی مشینری کو بہتر بنا کر اس کی پیداواری طاقت بڑھا کر کام لیا جاتا ہے وہاں مزدوروں کی الگ الگ ٹکڑیاں الگ کردی جاتی ہیں۔ سرمایہ‌داروں کے درمیان جو صنعتی جنگ چلتی ہے ، اس کا ایک سرسری خاکہ ہم اوپر دے آئے ہیں۔ اس جنگ کی ایک عجیب خاصیت یہ ہے کہ یہاں مزدوروں کی فوج بھرتی کرکے جیت اتنی نہیں ہوتی جتنی اس فوج کو نکال کر ہوتی ہے۔ اس جنگ کے سپہ‌سالار یعنی سرمایہ‌دار ایک دوسرے سے مقابلہ اس میں کرتے ہیں کہ کون زیادہ صنعتی سپاہی نکال باہر کرتا ہے۔

سچ ہے کہ ماہرین‌معاشیات ہمیں بتاتے ہیں کہ مشینوں کی بدولت جو مزدور ایک جگہ فالتو ہوجاتے ہیں وہ صنعت کی دوسری شاخوں میں کام سے لگ جاتے ہیں۔

یہ حضرات صاف بات کہنے کی جرات نہیں کرتے کہ محنت کی نئی شاخوں میں وہی مزدور کام پاتے ہیں جن کو دوسری جگہ سے نکالا گیا تھا۔ اصلیت چیخ چیخ کر اس جھوٹ کا پول کھول رہی ہے۔ انہیں دراصل کہنا یہ تھا کہ روزگار کے جو نئے ذریعے کھلتے ہیں وہ مزدور طبقے کے دوسرے پرتوں کےلئے کھلتے ہیں ، مثلاً مزدوروں کی نوجوان نسل کے اس حصے کےلئے جو صنعت کی اسی شاخ میں کام کرنے کےلئے کھڑا ہوا تھا جس کا خاتمہ ہوچکا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بےروزگار ہوجانےوالے مزدور کےلئے یہ بھی ایک تسکین ہے۔ سرمایہ‌دار حضرات کو فائدہ اٹھانے کےلئے کبھی تازہ

رگ پٹھے اور جوان خون کی کمی نہیں پڑتی۔ وہ مرنےوالوں کے کفن‌دفن کا انتظام کر دیتے ہیں۔ اور مزدوروں کو تشفی دینے کے‌بجائے کم از کم اس طرح اپنے دل کی تسلی کر لیتے ہیں۔ اگر مشینری کی بدولت کہیں مزدوری کرنےوالے سارے طبقے کا صفایا کرنا پڑجاتا تو یہ سرمائے کےلئے کیسی ہیبت‌ناک بات ہوتی کیوں کہ اجرتی لیبر کے بغیر خود وہ بھی سرمایہ نہ رہتا۔

آئیے، فرض کریں کہ وہ مزدور، جن کا روزگار مشینوں نے چھین‌لیا اور نئی نسل کا وہ پورا حصہ جو خاص اسی روزگار کی تاک میں تھا دونوں یہ نیا روزگار پالیتے ہیں۔ کیا یہ یقین کیا جا سکتا ہے کہ نئے کام کی اجرت اتنی ہی اونچی رہے گی جتنی پہلےوالے کی تھی؟ اس سے تو معاشیات کے سارے قانون کٹ جاتے ہیں۔ ہم پہلے کہہ آئے ہیں کہ نئی سے نئی صنعت پہلے کے پیچیدہ اور اونچے درجے کے کام کی جگہ کو ہمیشہ سادہ اور نیچے درجے کے کام سے بھر دیتی ہے۔

پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ مزدوروں کی وہ بہت بڑی تعداد جو مشینری کی بدولت صنعت کی ایک شاخ سے نکالی گئی ہے دوسری شاخ میں کھپ‌جائے اور اس میں پہلے سے کم اور بدتر اجرت نہ ہو؟

جو مزدور خود مشینوں کے بنانے پر کام کرتے ہیں، ان کی مثال دی جاتی ہے گویا وہ اس سے مستثنی ہیں۔ کہنےوالے کہتے ہیں کہ صنعت میں جیسے جیسے نئی مشین کی مانگ بڑھتی ہے اور وہ لگائی جاتی ہے تو مشینیں اور ساتھ ہی مشین‌سازی بھی قطعی طور پر بڑھ جاتی ہے، جو مزدور مشین‌سازی کی صنعت میں تھے ان کےلئے روزگار بڑھتا ہے۔ جو مزدور اس شاخ میں لگے ہوئے ہیں، ان کےلئے دعوا کیا جاتا ہے کہ ہنرمند ہی نہیں، تعلیم‌یافتہ بھی ہوتے ہیں۔

پہلے بھی اس دعوے میں آدھی سچائی تھی، اب ۱۸۴۰ء کے بعد سے تو اس کا رہا سہا بھرم بھی کھل گیا کیوں کہ مشین‌سازی کی صنعت میں بھی بیک وقت کئی کام دینےوالی ایسی مشینیں لگائی جارہی ہیں جو کتائی کے سوتی مل کی جدید مشینوں سے کچھ کم یا کچھ

زیادہ کارگذاری نہیں رکھتیں۔ اور جو مزدور مشین‌سازی کے کام میں ھیں ، اب انھیں بھی نہایت مکمل مشینوں پر نہایت ناقص مشینوں کا سا کام کرنا رہ گیا ھے۔

لیکن ایک مرد مزدور کی جگہ جسے مشین نے نکالا ھے ، فیکٹری اب تین بچوں اور ایک عورت کو کام دیتی ھے۔ سوال یہ ھے کہ کیا ایک مرد کی مزدوری اب تک تین بچوں اور ایک بیوی کا پیٹ پالنے کےلئے کافی نہیں رھی تھی ؟ کیا کم سے کم اجرت ایک نسل کو باقی رکھنے اور اسے آگے پھیلانے کو پوری نہیں پڑتی ؟ اس صورت میں بورژوازی کے یہ پسندیدہ جملے کیا ظاھر کرتے ھیں ؟ صرف ایک بات ثابت کرتے ھیں کہ: ایک مزدورکنبے کا پیٹ پالنے کےلئے جہاں پہلے ایک کی محنت کافی تھی اب وھاں چار کی محنت لگتی ھے۔

خلاصہ یہ ھوا کہ : پیداواری سرمایہ جتنا بڑھتا ھے اسی قدر محنت کی تقسیم اور مشینری کے استعمال میں وسعت ھوتی جاتی ھے محنت میں جتنی تقسیم در تقسیم ھوگی اور مشین جتنی زیادہ لگےگی ، مزدوروں کے درمیان مقابلہ بھی اتنا ھی کڑا ھوتا جائےگا اور ان کی اجرت اتنی ھی سکڑتی جائےگی۔

اسی ضمن میں یہ کہنا ھے کہ سوسائٹی کے اوپروالی صفوں سے آنے والے بھی مزدور طبقے میں بھرتی ھوتے ھیں۔ بہت سے چھوٹے موٹے کرخندار ، معمولی حیثیت کے کاروباری بھی پرولتاری صفوں میں آ کر مل جاتے ھیں کہ اب ان کے سامنے سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں رھتا کہ جہاں مزدور کا ھاتھ اٹھتا ھے وھیں اپنا ھاتھ اٹھائیں۔ اس طرح سے ھاتھوں کا وہ جنگل جو روزگار مانگنے کےلئے اٹھا ھے اور گھنا ھو جاتا ھے اور بازو پہلے سے بھی زیادہ سوکھ جاتے ھیں۔

سمجھ میں آنےوالی بات ھے کہ چھوٹا کارخانہ‌دار ایسے مقابلے میں دیر تک ٹھیر نہیں سکتا جس کی پہلی شرط ھوتی ھے کہ پیداوار زیادہ سے زیادہ بڑے پیمانے پر چلتی رھے یعنی جس کےلئے لازمی ھے کہ بڑے سے بڑا صنعت‌کار ھو ، چھوٹے کی سمائی نہیں۔

وضاحت کے بغیر یہ بھی ظاہر ہے کہ سرمائے پر جو فیصدی ملتا وہ بھی سرمایہ بڑھنے کے ساتھ ساتھ کم ہوتا چلاجاتا ہے، سرمائے کی جتنی بھاری مقدار اور تعداد بڑھتی ہے، اس پر فیصد منافع اتنا ہی گھٹتا ہے۔ اس لئے چھوٹی حیثیت کے کاروباری کو اپنے سرمائے کی فیصد پر جینا مشکل ہوجاتا ہے، وہ بھی صنعت کا رخ کرتا ہے یعنی چھوٹے صنعت‌کاروں کی صفوں میں سما جاتا ہے اور ساتھ ہی پرولتاریہ میں شامل ہونےوالے امیدواروں کی لائن میں کھڑا ہو جاتا ہے۔

آخری بات یہ کہ اوپر بیان کی ہوئی تبدیلیاں جتنا جتنا سرمایہ‌داروں کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ پیداوار کے ان زبردست ذریعوں کو جو وجود میں آچکے ہیں، زیادہ سے زیادہ بڑے پیمانے پر استعمال کرتے چلےجائیں اور اس مقصد سے قرض کے تمام ممکن حربے کام میں لاتے رہیں، اسی قدر صنعتی زلزلوں کے جھٹکے بھی بڑھتے جاتے ہیں۔ ان زلزلوں سے کاروباری دنیا خود کو صرف اسی تدبیر سے بچاتی ہے کہ پاتال کے دیوتا کے مندر پر دھن دولت کا ایک حصہ، اپنے سامان کا، یہاں تک کہ پیداواری طاقت کا ایک بھاگ بلیدان کردے، مختصر یہ کہ سنکٹ (بحران) زور پکڑ جاتے ہیں۔ ان سنکٹوں کی بہتات اور ان کا زور بڑھنے کی وجہ یہ کہ جب تیار ہونےوالا سامان بہت بڑھ جاتا ہے اور ضرورت پڑتی ہے کہ اس کی کھپت کی منڈی بھی بڑھے تو دنیا کا مارکٹ اور بھی سکڑجاتا ہے، نئے مارکٹ جن میں مال کھپاکر منافع بٹورا جائے، اور بھی کم رہ جاتے ہیں، کیوں‌کہ جو بحران گزر چکا وہ پہلے ہی دنیا کے بیوپار کو یا تو نئی منڈی دےگیا یا ایسی منڈیاں جنھیں اندر تک نہیں کھرچا گیا تھا۔ مگر محنت کے بل پر سرمایہ صرف زندہ ہی نہیں رہتا بلکہ پرانے زمانے کے آقاؤں کی طرح، جن کے ساتھ غلام دفن کر دئے جاتے تھے، سرمایہ اپنے بندوں کی لاشیں بھی قبر میں ساتھ لےجاتا ہے۔ جو مزدور سنکٹ کے وقت مارے گئے ان کے بھرے جنازے بھی اٹھائے جاتے ہیں۔ اس طرح سے یہ بات صاف ہوگئی کہ: اگر سرمایہ تیزی سے بڑھتا ہے تو مزدوروں کے درمیان مقابلہ بڑھنے کا کوئی تناسب ہی نہیں یعنی جتنی تیزی سے سرمایہ بڑھےگا اتنی ہی تیزی سے

روزگار کے ذریعے سکڑتے جائیں گے ، وہ ذریعے جو مزدور طبقے کے لئے گزر اوقات کا سہارا ہوتے ھیں۔ تاھم یہ بھی ھے کہ سرمائے کا تیزی سے بڑھنا ایسی شرط ھے جو اجرت پر بسر کرنے والی محنت (مزدوری) کے لئے سازگار ہوتی ھے۔

دسمبر ۱۸۴۷ء کے دوسرے پندرھواڑے میں کارل مارکس نے جو لکچر دئے تھے، انھی کی بنیاد پر یہ پمفلٹ خود لکھا۔
« Neue Rheinishe Zeitung »
اخبار کے شمارہ ۲۶۴ — ۲۶۷ تک اور ۲۶۹ میں، ۵ — ۸ اور ۱۱ اپریل ۱۸۴۹ء کو شائع ھوا۔ اینگلس نے برلن میں ۱۸۹۱ء میں اس کا دیباچہ لکھ کر علاحدہ پمفلٹ کی صورت میں شائع کیا۔

کارل مارکس

لوئی بوناپارٹ کی اٹھارویں برومیئر

۱۸۸۵ء کے تیسرے جرمن ایڈیشن پر
فریڈرک اینگلس کا دیباچہ

"اٹھارویں برومیئر" (۳۹) کا پہلا ایڈیشن نکلے ہوئے ۳۳ سال ہوگئے، اور اب پھر اس کا نیا ایڈیشن شایع کرنے کی ضرورت یہ ثابت کرتی ہے کہ کتاب کی اہمیت آج بھی کم نہیں ہوئی۔

واقعی یہ ایک بےمثل ذہنی کارنامہ ہے۔ وہ ہنگامہ‌خیز واقعہ جس نے تمام سیاسی دنیا کو ایک گرج کے ساتھ ہلا ڈالا تھا، جس پر کچھ لوگوں نے اخلاقی گراوٹ کہہ کر چیخ پکار مچائی تھی اور کچھ نے اسے انقلاب سے بچ نکلنے اور اپنی گمراہی کی سزا پانے کے طور پر قبول کر لیا تھا، جس پر سب کی آنکھیں کھلی رہ گئی تھیں لیکن سمجھا کوئی نہ تھا، اس واقعے کے فوراً بعد کارل مارکس نے اس مختصر، ملفوظات جیسی تحریر پر قلم اٹھایا اور فروری ۱۸۴۸ء کے دنوں سے لےکر آگے تک فرانسیسی تاریخ کی رفتار صفائی سے پیش کرکے دکھادیا کہ اس تاریخی رفتار کے اندرونی رشتے کیا تھے، دوسری دسمبر ۱۸۵۱ء (۴۰) کو جو معجزہ سا ہو گیا وہ قدرتی نتیجہ تھا ان اندرونی رشتوں کا۔ فرانسیسی سرکار الٹ دینے کا جو ہیرو تھا، مارکس نے اپنی تحریر میں اس کے ساتھ نفرت کا وہی برتاؤ کیا ہے جس کا وہ مستحق تھا۔ یہ تصویر ایسے کمال کے ساتھ کھینچی گئی

ہے کہ تب سے آج تک جتنے واقعات روشنی میں آئے ہیں ، وہ اس کی صداقت کا تازہ ثبوت پیش کرتے ہیں۔ عہد حاضر کی زندہ تاریخ کی ایسی لاجواب سوجھ بوجھ ، اور جس لمحے واقعات ہوئے اسی وقت ان کو اتنی صفائی سے گہرائی تک سمجھ لینا ایسی صفات ہیں جن کی مثال نہیں ملتی۔

اس کے لئے لازمی ہے کہ فرانسیسی تاریخ کا اتنا گہرا علم ہو جتنا مارکس کو نصیب تھا۔ فرانس وہ ملک ہے ، جہاں دنیا کے اور ملکوں سے کہیں زیادہ ہر مرتبہ طبقوں کی تاریخی رسہ کشی اپنے فیصلہ کن انجام کو پہنچتی رہی ہے۔ فرانس میں وہ بدلتی ہوئی سیاسی شکلیں ، جن کے اندر طبقاتی کش‌مکش حرکت میں رہتی تھی اور اس کا انجام کوئی صورت اختیار کرتا تھا ، بہت ہی صاف لائنوں میں خود کو ابھارتی رہی ہیں۔ قرون‌وسطی میں جاگیرداری نظام کا یہ مرکز فرانس اور نشاۃ ثانیہ (۳۱) کے زمانے سے جاگیروں کے اوپر ٹکی ہوئی سارے ملک کی ایک شاہی حکومت کا یہ نمونہ فرانس ، انقلاب عظیم کے زمانے میں اس نے جاگیرداری کے پرزے اڑادئے اور بورژوازی کی کھری حکمرانی ایسے طبقاتی رنگ‌روپ کے ساتھ قائم کردی جس کی مثال یورپ کے کسی ملک میں نہیں ملتی۔ بورژوازی کے غلبے کے مقابل سر اٹھانےوالی پرولتاریہ کی جدوجہد بھی فرانس میں اتنے کھلے روپ میں ابھرتی ہے جو دوسرے ملکوں میں نظر نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ مارکس نے فرانس کی نہ صرف پچھلی تاریخ کے مطالعے پر خاص دیدہ‌ریزی کی بلکہ موجودہ زمانے کی تاریخ کی ساری تفصیلات کا کھوج لگایا اور ماضی‌وحال سے وہ تاریخی سروسامان جمع کیا جو اس کے مستقبل میں کام آئے ، چنان‌چہ واقعات آگے بڑھے تو مارکس ان سے بدحواس نہیں ہوا۔

یہیں ایک اور پہلو بھی ملتا ہے۔ مارکس وہ پہلا شخص ہے جس نے تاریخ کی حرکت کا عظیم الشان قانون دریافت کیا — وہ قانون یا اصول جس پر ہر قسم کی تاریخی کش‌مکش چلتی ہے ، تو چاہے وہ سیاسی دائرے میں ہو ، مذہبی ، فلسفیانہ یا کسی اور نظریاتی میدان میں ہو ، لیکن دراصل وہ سماجی طبقوں کے درمیان رسہ کشی کا

ھی کم‌وبیش اظہار کرتی ھے اور یہ کہ ان طبقوں کا وجود ، اس وجود کے ساتھ ھی ان کا باھمی ٹکراؤ بھی اس سے طے ھوتا ھے کہ ان طبقوں کی معاشی حالت کس درجے پر پہنچی ھے ، طریق پیداوار اور اس کی خصوصیت کیا ھے ، اور اس کی بدولت پیداوار کے تبادلے کی صورت کیا ھے ۔ یہ قانون جو انسانی تاریخ کے رگ‌وریشہ میں وھی اھمیت رکھتا ھے جو قدرتی سائنسوں میں ”انرجی“ کے روپ بدلتے رھنے کا قانون، وھی مارکس کے کام آیا اور یہاں بھی اس نے ایک کنجی کا کام دیا جس سے مارکس نے دوسری ریپبلک (۴۲) والے فرانس کی تاریخ کھول کر رکھ دی ۔ پیش نظر کتاب میں تاریخ کے ان تازہ واقعات کو بھی مارکس نے اپنے دریافت کئے ھوئے قانون کے لئے کسوٹی بنا کر دیکھا اور ماننا پڑتا ھے کہ اب ۳۳ سال گزر جانے کے بعد بھی ، وہ قانون بالکل کھرا نکلا ۔

فریڈرک اینگلس

۱۸۸۵ ء میں لکھا گیا ۔

کتاب کا نام تھا :

Karl Marx

«Der Achtzehnte Brumaire des

Louis Bonaparte». Humburg, 1885.

کارل مارکس

لوئی بوناپارٹ کی اٹھارویں برومیئر

۱

ہیگل نے کسی جگہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ایسے واقعات اور ایسی ہستیاں جو تمام دنیا کی تاریخ میں اہمیت کی مالک ہوں، دوبار ظاہر ہوتی ہیں۔ یہاں وہ اتنا بڑھانا بھول گیا کہ پہلی بار ٹریجیڈی کی شکل میں اور دوسری بار مسخرےپن کے روپ میں۔ پہلے دانتن تھا تو دوسرا کوسی‌دیئر، پہلا روبس‌پیری تھا تو دوسرا لوئی‌بلان۔ پہلا ۱۷۹۳ — ۹۵ ء والا Montagne ("مونٹین،، یا "پہاڑی،،) تھا تو دوسرا ۱۸۴۸ — ۵۱ ء کا Montagne (۴۳)، پہلا چچا تھا تو دوسرا بھتیجا۔ اٹھارویں برومیئر کا جو یہ دوسرا تازہ ایڈیشن آیا ہے، اس کا نقشہ بھی کچھ ایسا ہی جما ہے (۴۴)۔

لوگ ہی اپنی تاریخ بناتے ہیں لیکن یہ نہیں ہوتا کہ جیسی سوچی تھی ویسی ہی بنالیں۔ کیوں‌کہ جن حالات میں تاریخ بنائی جاتی ہے، وہ ان کی اپنی پسند کے نہیں ہوتے، وہ تو انہیں براہ‌راست ماضی کی طرف سے بنےبنائے ملتے ہیں۔ ساری گزری ہوئی نسلوں کا کیا دھرا زندہ نسلوں کے دماغوں پر کابوس کی طرح سوار رہتا ہے۔ اور عین اس وقت جب یہ زندہ لوگ اپنے آپ کو اور اپنے اردگرد کو بدلنے پر آمادہ ہوتے ہیں اور کچھ ایسا کر گزرنا چاہتے ہیں جو پہلے کبھی نہ ہوا ہو، ایسے ہی انقلابی بحرانوں کے دور

میں وہ ڈر اور جھجک کے ساتھ ماضی کی روحوں کو اپنی مدد کےلئے پکارتے ھیں ، ان کے پچھلے ناموں سے کام نکالتے ھیں ، ان کے جنگی نعروں اور لباسوں کو اپناتے ھیں تاکہ ماضی کی مقدس پوشاک میں اور مانگی ھوئی زبان کی مدد سے وہ دنیا کی تاریخ کے اسٹیج پر نیا منظر پیش کردیں۔ چناںچہ لوتھر نے حضرت پاول کا چھرہ لگایا ، ۱۷۸۹ء سے ۱۸۱۴ء تک کے انقلاب نے باری باری کبھی روم کی ریپلک کا ، کبھی سلطنت روما کا جامہ پہن‌لیا ، اور ۱۸۴۸ء کے انقلاب کو اور کچھ ھاتھ نہ آیا تو اس نے بعض اوقات ۱۷۸۹ء کے واقعات کی نقالی کی اور کبھی ۹۵ — ۱۷۹۳ء تک کے انقلابی روایات کا منہ چڑایا۔ یہ ایسی بات ھے کہ جب کسی آدمی نے نئی نئی بدیسی زبان سیکھی ھو تو وہ برابر اپنی مادری زبان میں اس کا ترجمہ سوچتا جاتا ھے۔ جب تک کہ وہ ترجمے میں سوچنے سے خود کو آزاد نہیں کر لیتا اور جب تک نئی زبان کے استعمال کے وقت وہ اپنی زبان کو ذھن سے نکال نہیں دیتا تب تک نئی زبان کی روح نہ تو اس کی گرفت میں آتی ھے اور نہ وہ اس کی مہارت حاصل کرتا ھے۔

عالمی تاریخ میں جب ھم مردہ روحوں کے طلب کئے جانے کو دیکھتے ھیں تو فوراً ان کے درمیان نمایاں فرق نظر کے سامنے ابھر آتا ھے۔ کاسل دیمولین ، دانتن ، رابس‌پیری ، سین‌ژوست ، نپولین جیسے ھیرو اور پرانے انقلاب فرانس کی پارٹیاں اور عام لوگ جب اپنے زمانے کا عظیم فریضہ ادا کرتے کھڑے ھوئے کہ عہد حاضر کے پاؤں میں پڑی زنجیریں توڑ ڈالیں اور بورژوا سماج کے قدم جمائیں تو انھوں نے قدیم تاریخ روما کا چولا پھن لیا اور اسی کی بولی اپنالی۔ ایک نے تو یہ کیا کہ جاگیرداری بنیاد کے پرخچے اڑا دئے اور اس پر جاگیرداروں کے جو سر اٹھے ھوئے تھے وھی اتار لئے۔ دوسرے نے فرانس کے اندر ان حالات کی داغ بیل ڈالی جن کا ھونا شرط تھا کھلے مقابلے کی ترقی کےلئے ، زمین کی چھوٹی حدبندیوں سے پورا فیض اٹھانے کےلئے ، قوم کی اس صنعتی پیداواری طاقت کو کام سے لگانے کےلئے جو اپنی زنجیریں توڑ چکی تھی۔ فرانس کی سرحدوں کے پار اس دوسرے نے جاگیرداری صورتوں کا ھر طرف سے اسی حد تک صفایا کر ڈالا

جہاں تک فرانس میں اٹھتے ہوئے بورژوا سماج کی یہ غرض پوری ہوتی تھی کہ یورپ کے براعظم پر وقت کے تقاضے کے مطابق مناسب حالات قائم ہوجائیں۔ جب ایک دفعہ سماج کا نیا رنگ روپ نکل آیا، تو وہ دقیانوسی دیوی دیوتا سب غائب ہوگئے، اور انھی کےساتھ قدیم تاریخ روم کے وہ ہیرو بھی گئے جو کفن پھاڑ کر نکل آئے تھے، وہ بروٹس، گراخی، پبلکولاسِ، وہ دربار اور درباری — یہاں تک کہ خود جولیس سیزر بھی غائب ہوگیا۔ ہوشیار اور کاروباری لحاظ سے چوکس بورژوا سماج کو اب سیئی، کوزین، روائی کولر، بنجامن کانستان اور گیزو جیسے حضرات کے وجود میں اپنے سچے ترجمان اور طرفدار مل گئے۔ اس سماج کے سپہ‌سالار دفتروں میں میز کرسی لگائے بیٹھے تھے اور اس سماج کا سیاسی پیشوا تھا موٹی عقل کا لوئی ہژدہم۔ اب انھیں دولت پیدا کرنے اور کھلے مقابلے کی فضا بنانے کی کوششوں میں دم مارنے کی بھی مہلت نہ تھی، اور اتنا بھی یاد نہ رہا کہ قدیم روما کی روحیں ان کے جھولے کی رکھوالی کر چکی ہیں۔ بورژوا سماج میں جانبازی کی کتنی ہی کمی سہی، لیکن ہاتھ پاؤں نکالنے کےلئے اسے جانبازی سے بھی کام لینا پڑا، ایثار سے بھی، دہشت بھی پھیلانی پڑی، خانہ جنگی بھی اور عوام کی طرف سے میدان بھی لینا پڑا۔ رومن ریپبلک کی نپی‌تلی قدیم روایات میں سے، بورژوا سماج کے شیرافگنوں (گلےڈی‌ایٹروں) کو وہ آئڈیل، آرٹ کی وہ شکلیں، وہ خودفریبیاں بھی ہاتھ آ گئیں جو خاص اس غرض سے درکار تھیں کہ اپنی جدوجہد میں جو بورژوا مصلحتیں یا مجبوریاں ہیں وہ خود کی نظر سے بھی پوشیدہ رہیں اور اپنا حوصلہ بھی ویسا بلند رکھا جائے جیسا تاریخ کی عالی‌شان ٹریجیڈی (ڈرامے) میں رہتا ہے۔ بالکل اسی طرح ایک صدی پہلے، حالات کی سطح مختلف ہوتے ہوئے بھی، یہ واقعہ ہو چکا تھا کہ کرومویل اور انگریزوں نے بورژوا انقلاب (۴۵) کے لئے انجیل کے عہدنامہ عتیق (۴۶) والی زبان بھی استعمال کی تھی، اس کے جوش اور نیرنگی سے بھی کام لیا تھا۔ جب کام نکل گیا، مراد برآئی اور انگریزی سماج بورژوا سانچے میں ڈھل چکا تو پھر برطانوی فلسفی لوک نے انجیل‌والے پیغمبر ہیا کوک کو دھتا بتادی۔

اس طرح سے ان انقلابوں میں مردہ روحوں کو پھر سے زندگی دینے کا مطلب ھی یہ تھا کہ نئی جدوجہد میں آن‌بان پیدا ھو ، نہ یہ کہ پرانے کا منھ چڑایا جائے ، جو مہم درپیش ھے دماغوں میں اس کی عظمت بٹھائی جائے ، نہ یہ کہ اصل مسئلے کے حل کرنے سے جان چھڑائی جائے ، انقلاب کی روح پھر سے تازہ کی جائے ، نہ یہ کہ ان روحوں کو آسیب کی طرح منڈلانے پر مجبور کیا جائے۔

۱۸۴۸ ء سے ۱۸۵۱ ء تک پرانے انقلاب (فرانس) کا صرف آسیب منڈلاتا رھا ، مراست républicain en gants jaunes (زرد دستانوں‌والے ریپبلکن) سے لےکر جس نے پرانے (انقلاب کے ایک سورما) بیئی کا بھروپ بھرا تھا ، اس بےمقصد قسمت‌آزمائی کرنےوالے تک ، جس نے اپنے گھٹیا اور گھناونے خدوخال کو نپولین مرحوم کے فولادی نقاب میں چھپا رکھا تھا ، وھی آسیبی روحیں پھرتی رھیں۔ پوری کی پوری قوم جو سوچتی تھی کہ ھم نے انقلاب کے ذریعے سے اپنی آگے بڑھنے کی قوت تیز کر دی ھے ، ایک دم کیا دیکھتی ھے کہ وہ اور پیچھے مردہ دور میں جا پڑی ھے۔ اپنی اس حالت میں شک کی کیا گنجائش ھے ، جب‌کہ پرانی تاریخیں پھر سے زندہ کی جا رھی ھیں ، واقعات کی پرانی کھتونی ، پرانے نام ، پرانے احکام جن سے محض داستان پاستاں کے عالموں کو سروکار رہ گیا تھا ، اور پرانے طرز کی جابرانہ پولیس ، وہ کوڑا شاھی ، جو بہت پہلے گل سڑ چکی تھی ، پھر سے نمودار ھوگئی ھے۔ قوم محسوس کرتی ھے کہ وہ اس دیوانے انگریز کی طرح ھوگئی جو بیڈلم (۴۷) کے پاگل خانے میں پڑا ھوا سمجھتا ھے کہ فرعونی مصر کے زمانے سے گزر رھا ھے ، ایتھوپیا (حبش) میں سونے کی کان کھودنے کا سخت بوجھ لدا ھے اور وہ اس بوجھ تلے ھائے واویلا کرتا جا رھا ھے۔ تہہ‌خانے کی قید میں اس کے سر سے بندھی ھوئی مشعل کی بجھی بجھی روشنی ھے ، جلاد سپرڈنٹ ھاتھ میں لمبا سا ھنٹر لئے نگرانی کر رھا ھے ، باھر نکلنے کے دروازے پر جنونی پہرہ‌داروں کا ھجوم ھے جو نہ تو کان کھودنے کی مشقت کرنےوالوں کی بات سمجھتے ھیں اور نہ ایک دوسرے کی ، کیوں کہ ایک کی زبان دوسرا نہیں جانتا۔ انگریز دیوانہ چیخ رھا ھے ” یہ سب

مجھے بھگتنا پڑتا ہے، میں جو آزاد برطانوی پیدا ہوا تھا، مجھ سے یہ مشقت لی جا رہی ہے کہ پرانے زمانے کے فرعونوں کے لئے کان کھود کر سونا نکالوں،،۔ فرانسیسی قوم آہ بھر کر کہتی ہے '' ہاں، بوناپارٹ خاندان کا قرضہ چکانے کےلئے یہ سب کرنا پڑیگا،،۔ انگریز کی جب تک عقل ٹھکانے تھی اس پر سونا بنانے کا بھوت سوار رہا۔ فرانسیسی جب تک انقلاب میں لگے ہوئے تھے، نپولین کی یاد سے غافل نہیں ہونے پائے جیساکہ دسویں دسمبر ۱۸۴۸ء کے الکشن سے (۴۸) ثابت ہوگیا۔ انقلاب کی آفتوں سے وہ ایسے گھبرائے کہ مصر قدیم کے سالن کو پچھتانے لگے (۴۹)۔ اور دوسری دسمبر ۱۸۵۱ء نے اس کا جواب دےدیا۔ انھیں اپنے پرانے نپولین کا صرف کارٹون ہی نہیں نصیب ہوا بلکہ سچ مچ کا نپولین ملا، البتہ کارٹون کی شکل میں - ۱۹ ویں صدی کے وسط میں جیسا نظر آنا چاہئے تھا، ویسا ہی نپولین ملا ہے۔

۱۹ ویں صدی کے سماجی انقلاب کو اپنی شاعری مستقبل سے لینی ہے، ماضی سے نہیں۔ اسے جو مہم درپیش ہے، اس کی شروعات ہی نہیں ہوسکتی جب تک کہ وہ پرانے زمانے کے وہموں سے خود کو پاک نہیں کر لیتا۔ پہلے کے انقلابوں کو محتاجی تھی ماضی کی عالمی تاریخ کے واقعات تازہ کرنے کی، تاکہ وہ اپنے باطن کے بارے میں خود کو فریب دے سکیں۔ ۱۹ ویں صدی کے انقلاب کو ضرورت ہے اپنے مردوں کو دفنانے کی، تاکہ اس کا باطن نظر کے سامنے صاف آجائے۔ وہاں باطن پر بیان حاوی تھا، یہاں بیان پر باطن حاوی ہے۔

فروری کا انقلاب پرانے سماج کےلئے ناگہانی بات تھی، پرانا سماج دیدے پھاڑکر رہ گیا اور لوگوں نے کہہ دیا کہ یہ ناگہانی چوٹ عالمی تاریخ کی اہمیت رکھتی ہے، یہ نئے دور کی آمد کا ڈنکا بجا رہی ہے۔ دوسری دسمبر کو چالاک پتہباز نے کوئی اور ہی پتہ پھینکا اور فروری کا انقلاب غائب ہوگیا۔ نتیجہ یہ کہ موروثی بادشاہی تو کیا مٹتی، وہ معتدل رعایتیں ہی چھن گئیں جو موروثی بادشاہی کے قبضے سے صدیوں کی جدوجہد کے بعد زبردستی وصول کی گئی تھیں۔ بجائے اس کے کہ سماج میں نئی صفات کی جان پڑتی، معلوم یہ ہوا کہ

ریاست الٹے پاؤں بہت قدیم شکل پر پہنچ گئی اور بےغیرتی کا وہ پرانا عمل دخل پھر سے ہوگیا جہاں صلیب اور دارورسن کا زور چلتا ہے۔ فروری ۱۸۴۸ ء میں جو سامنے کی چوٹ (coup de main) لگائی گئی تھی ، دسمبر ۱۸۵۱ ء کو حکومت کا تختہ الٹنے (coup de tête) سے اس کا جواب مل گیا۔ '' جھونکا ہوا کا تھا ادھر آیا ادھر گیا ''۔ تاہم ان دونوں واقعات کے درمیان جو وقت گزرا ، رائگاں نہیں گیا۔ ۱۸۴۸ ء اور ۱۸۵۱ ء کے درمیان فرانسیسی سوسائٹی نے ، خلاصے کی صورت میں ، چوں کہ یہ خلاصہ انقلابی تھا ، وہ سبق یاد کر لئے ، وہ تجربہ حاصل کرلیا جن کا فروری کے انقلاب سے مقدم ہونا ضروری تھا تا کہ ، اگر واقعات کو محض اوپر کی سطح پر ہلچل برپا کرنے کے بجائے زیادہ سنجیدہ عمل کرنا ہے تو انہیں صحیح سمت یا قاعدے کی رفتار دی جا سکے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سماج جس نقطے سے چلا تھا اس سے بھی پیچھے جا پڑا ، اور اب انقلاب کے اگلے سفر سے پہلے اسے نقطہ آغاز مقرر کرنا پڑےگا ، وہ تعلقات اور وہ حالات پیدا کرنے ہوں‌گے جن کے ہونے پر ہی آج کے زمانے کا انقلاب ایک سنجیدہ حیثیت اختیار کرسکتا ہے۔

بورژوا انقلاب ، مثلاً ۱۸ ویں صدی کے انقلابوں کا قدم ایک فتح سے دوسری فتح کی طرف اٹھتا ہے۔ ایک کے بعد ایک ڈرامائی اثر چکا چوندھ کرتا جاتا ہے ، لوگ اور سب کچھ پھل‌جھڑیاں چھوڑتے گزرتے ہیں ، روز ایک نیا لطف ہے ، نیا ولولہ ہے ، لیکن ان سب کی عمر مختصر ہوتی ہے۔ جلدی سے وہ اپنی انتہائی بلندی کو چھو لیتے ہیں اور پھر نشہ اترتا ہے تو دیر تک خمار رہنے کے بعد یہ ہوش آتا ہے کہ طوفان اور ہنگامے کے دور کا جو حاصل ہوا ہے اسے سمیٹا جائے۔ اس کے برخلاف پرولتاری انقلاب ، جو ۱۹ ویں صدی کے انقلاب ہیں ، لگاتار اپنی نکتہ‌چینی کرتے ہیں ، اور باربار اپنی رفتار روک لیتے ہیں ، پھر اسی پر پلٹ کر آتے ہیں جو بظاہر تکمیل پا چکا تھا تاکہ پھر وہیں سے قدم بڑھایا جائے ، اور بےدردی کے ساتھ اپنی پہلے کی کوششوں کے ادھ کچرے‌پن اور کوتاہیوں کا مذاق اڑاتے ہیں ، دشمن کے قدم اکھاڑنے میں لگ

جاتے ہیں گویا مقصد صرف اتنا ہے کہ وہ زمین سے پھر تازہ قوت لے کر اٹھ کھڑا ہو اور پہلے سے بھی زیادہ قدم جما کر ، طاقتور ہو کر ان کے سامنے آجائے۔ جس منزل مقصود پر پہنچنا ہے ، اس سے پہلے جو انجانے مرحلے آتے ہیں ، ان کا سامنا کرتے ہوئے بار بار پیچھے ہٹتے ہیں اور اس وقت تک یہ عمل جاری رہتا ہے جب تک پیچھے ہٹنے کی ساری راہیں کٹنے کی نوبت نہیں آجاتی اور جب تک خود زندگی پکار کر نہیں کہتی:

«Hic Rhodus, hic saltal»

ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے ! (۵۰)

فی‌الحال، وہ شخص جس نے فرانس کے واقعات کی رفتار کو سرسری نظر سے ہی دیکھا ہے ، اس کے ہر قدم پر نگاہ نہیں رکھی ، وہ بھی پہلے سے کھٹکتا ہوگا کہ یہ انقلاب آگے جاکر ایسا ڈوبے گا جس کی مثال نہیں ملتی۔ ڈیموکریٹ حضرات جس طرح اپنے دل میں خوش ہو ہو کر فتح کے شادیانے بجا رہے تھے اور ایک دوسرے کو مبارکبادیں دے رہے تھے ، وہ سننے قابل تھا۔ مئی ۱۸۵۲ء کے دوسرے اتوار (۵۱) کو انھیں اپنے عمل کے انجام بخیر ہونے کی امید تھی ، اس دوسرے اتوار کو انھوں نے کچھ ایسا اپنے دماغ میں بٹھا رکھا تھا گویا اس روز حضرت عیسی پھر سے نمودار ہو جائیں گے اور اہل ایمان (خلیاست) (۵۲) کا ہزار سالہ دور حکومت شروع ہوگا۔ معجزوں پر ایمان رکھنا ہمیشہ سے کمزوری کا بچاؤ رہا ہے۔ اگر یہ گمان کرلیا کہ جادو کے زور سے اس نے میدان مارلیا تو اپنی جگہ سوچ لیتی ہے کہ دشمن کا سر نیچا ہوگیا۔ غیب سے نازل ہونےوالی آئندہ فتوحات پر بےعملی خوب بغلیں بجاتی ہے اور اس نشے میں حقیقت کا رہاسہا احساس بھی زائل کر دیتی ہے -- اسے یہ امید رہتی ہے کہ آئندہ بڑے معرکے سر کرنے ہیں لیکن ان کے بتانے کا ابھی وقت نہیں آیا۔ یہ سورما جو اپنی کھلی نالائقی کو ان ترکیبوں سے غلط ثابت کرنے چلے تھے کہ ایک دوسرے سے ہمدردی

جتائیں اور خاص ٹولی میں گروہ‌بند ہوجائیں ، اب وہ اپنا بوریا بستر باندھ چکے ہیں اور اپنے سر جو سہرا بندھوانا تھا ، اسی سہرے کے کچھ پھول اٹھائے ہوئے ، اکس‌چینج مارکٹ پر اپنی جیب میں پڑی ہوئی in partibus (۵۳) ریپبلکیں بھنانے پہنچ گئے ہیں جن ریپبلکوں کی حکومت کی باگ‌ڈور سنبھالنےوالوں کی فہرست بھی انھوں نے چپتے چپاتے پہلے سے ہی بنا رکھی تھی ۔ دوسری دسمبر ۱۸۵۱ ء نے ان سورماؤں کے ہوش اڑا دئے ، گویا کھلے آسمان سے بجلی گری ہو ۔ ایسے لوگ جو پست ہمتی کے وقت خوب زور کی آوازیں نکال کر اپنے اندرونی خوف و اضطراب کو چھپالیا کرتے ہیں ، وہ بھی اس بار مان گئے ہوں گے کہ وہ زمانے لد گئے جب بطخیں قائیں قائیں کرکے کیپٹول (۵۴) کا قلعہ بچا لیتی تھیں ۔

آئین ، قومی اسمبلی ، خاندانی پارٹیاں ، نیلے اور لال ریپبلکن ، افریقی ہیرو (۵۵) ، ڈائس کی گھن گرج ، اخباروں کی جگمگاتی سرخیاں ، سارا ادب ، سیاسی نام اور علمی شہرتیں ، شہری قانون اور تعزیرات ، آزادی ، مساوات اور بھائی چارہ (liberté, égalité, fraternité) کے اصول اور پھر مئی ۱۸۵۲ ء کا دوسرا اتوار — سب کا سب گویا طلسم خیال تھا جو ایک ایسے آدمی کے چھومنتر سے غائب ہو گیا جسے دشمن بھی جادوگر نہیں مانتے ۔ ووٹ دینے کا عام حق جو تھوڑے دنوں بچا رہا وہ بھی وقتی تھا تاکہ ساری دنیا کی نظروں کے سامنے وہ اپنی مرضی سے وصیت‌نامے پر دستخط کرکے عام لوگوں کی طرف سے کھلا اعلان کردے کہ ’’کل من علیہافان،، (جس چیز کا وجود ہے اسے فنا ہونا ہے) ۔

جیسا کہ فرانسیسی کہتے ہیں ، یہ کہنا کافی نہیں کہ ان کی قوم بےخبری کا شکار ہوگئی تھی ۔ کوئی قوم ہو یا عورت ، ان کی زبان سے یہ عذر قابل‌قبول نہیں کہ جس منچلے نے پہلے قدم بڑھایا وہی بےخبری میں ان کے ساتھ جبریہ کارروائی کرگیا ۔ لفظوں کی الٹ پھیر سے معمہ حل نہیں ہوا کرتا البتہ وہ دوسری شکل میں سامنے آجاتا ہے ۔ سمجھ میں بات نہیں آتی کہ تین جعل‌ساز کس طرح تین

کروڑ ساٹھ لاکھ کی قوم پر ایکا ایکی چھا سکتے ہیں اور بغیر کسی مقابلے کے انہیں جال میں پھانس سکتے ہیں۔

اب ہم مختصر لفظوں میں عام نقشہ پیش کرتے ہیں ان مرحلوں کا جن سے یہ تازہ انقلاب فرانس ۲۴ فروری ۱۸۴۸ء سے لے کر دسمبر ۱۸۵۱ء تک گزرا ہے۔

اس کے تین خاص دور تھے: فروری کا زمانہ؛ پھر ۴ مئی ۱۸۴۸ء سے ۲۸ مئی ۱۸۴۹ء تک کا وہ زمانہ جس میں ریپبلک کا قیام ہوا یا آئین‌ساز قومی اسمبلی قائم ہوئی۔ اس کے بعد ۲۸ مئی ۱۸۴۹ء سے دوسری دسمبر ۱۸۵۱ء کا دور یعنی آئینی ریپبلک یا قانون‌ساز قومی اسمبلی کا زمانہ۔

پہلا دور جو ۲۴ فروری ۱۸۴۸ء کو لوئی فلپ کے اختیارات کے خاتمے سے شروع ہوتا ہے، ۴ مئی ۱۸۴۸ء تک رہا، یعنی آئین‌ساز اسمبلی کا اجلاس شروع ہونے تک۔ خاص یہی فروری کا دور ہے جسے انقلاب کی تمہید کہنا چاہئے۔ اس زمانے کی خصوصیت سرکاری طور پر یوں ظاہر ہوئی کہ ہاتھوں ہاتھ جو سرکار بنائی گئی تھی اس نے خود ہی اعلان کر دیا کہ وہ صرف وقتی یا عارضی ہے۔ سرکار کے عارضی ہونے کے ساتھ ساتھ جو بھی کارروائی، حکم احکام، اعلان وغیرہ اس دور میں ہونے‌والے تھے، ان کی حیثیت بھی محض عارضی رہ گئی۔ کسی کو یہ جرات نہ ہوئی کہ اپنے مستقل وجود کا یا عمل کی صداقت کا دعوا کرے۔ وہ سارے عناصر جو انقلاب کی تیاری میں یا اس کے تصفیے میں شریک تھے، مثلاً موروثی خاندانی اپوزیشن (۵۶)، ریپبلکن بورژوازی، جمہوری ریپبلکن خیالات کی چھوٹی بورژوازی، اشتراکی جمہوریت‌پسند خیالات کے مزدور، ان سب عناصر کو فروری‌والی حکومت میں جو جگہ ملی وہ عارضی تھی۔

اس کے سوا اور ہو بھی کیا سکتا تھا۔ فروری کے دنوں کی اول غرض یہ تھی کہ ایسی انتخابی اصلاحات کی جائیں جن کے ذریعے صاحب جائداد طبقوں کے اندر خاص سیاسی مراعات پانے‌والوں کا حلقہ اور وسیع ہوجائے اور مالیاتی شرفا کا تن‌تنہا غلبہ توڑ دیا جائے۔ لیکن جب واقعی ٹکر لینے کی نوبت آئی، جب عام لوگوں نے سڑکوں

پر رکاوٹیں کھڑی کیں اور نیشنل گارڈ نے کوئی سرگرمی نہ دکھائی تو فوج نے بھی جم کر مقابلہ نہیں کیا، اور موروثی بادشاہت نے فرار کی راہ اختیار کی تو ریپبلک آپ ہی آپ قائم ہوگئی۔ ہر ایک پارٹی نے اس کا اپنا مطلب نکالا۔ پرولتاریہ نے ہتھیار سنبھال کر ریپبلک جیتی تھی، اس نے اپنی چھاپ لگائی اور اعلان کردیا کہ یہ سماجی ریپبلک ہوگی۔ چناں‌چہ نئے عہد کے انقلاب کی عام اندرونی کیفیت سامنے آ گئی۔ یہ اندرونی کیفیت ایسی تھی کہ عجیب طرح سے ہر اس بات کے خلاف پڑتی تھی جو موجودہ سروسامان کو دیکھتے ہوئے، لوگوں میں عام ترقی کی حالت کا اندازہ کرتے ہوئے، صورت‌حال اور ماحول کو نظر میں رکھتے ہوئے فوراً عمل میں لائی جا سکتی تھی۔ دوسری طرف یہ ہوا کہ فروری کے انقلاب میں اور جن جن عناصر نے ہاتھ بٹایا تھا ان سب کے دعوے مان لئے گئے اور ان کو حکومت میں شریک غالب بنالیا گیا۔ چناں‌چہ اور کوئی ایسا معجون مرکب دور نہیں ملتا جس میں اتنے بڑھ بڑھ کر دعوے بھی موجود ہوں اور اصل بے‌بسی اور بے‌یقینی بھی ملی ہوئی ہو، جس میں جدت و ندرت کا اتنا بے‌تحاشا جوش بھی موجود ہو اور پرانے ڈھچر کا ایسا پکا غلبہ بھی، جس میں بظاہر پورے سماج کی ہم‌آہنگی اور تال‌میل کا بھرم بھی رکھا گیا ہو اور اندر سے سب عناصر بے‌میل اور بے‌جوڑ بھی رہتے ہوں۔ اس مدت میں جب پیرس کا پرولتاریہ اپنی نظر کے سامنے کھلے ہوئے شاندار امکانات کے نشے میں چور تھا اور نہایت سنجیدگی سے سماجی مسائل کی بحثوں میں لگا ہوا تھا، پرانی سماجی طاقتوں نے گروہ بندی کرلی، اپنی صفیں جوڑلیں، سوچ بچار کیا اور قوم کی عام آبادی سے، کسانوں سے، چھوٹی حیثیت کے مالکوں سے وہ مدد مل گئی جس کی توقع نہ تھی؛ یہ وہ لوگ تھے جنھیں جولائی کی بادشاہت (۵۷) کے وقت تک رکاوٹوں کا سامنا تھا اور اب رکاوٹوں کے گرتے ہی ایک دم سیاسی منظر پر چڑھ آئے تھے۔

دوسرا دور ۴ مئی ۱۸۴۸ء سے شروع ہو کر مئی ۱۸۴۹ء کے آخر تک چلتا ہے۔ یہ زمانہ ہے آئین‌سازی کا، بورژوائی ریپبلک کی بنیاد پڑنے کا۔ فروری کے دنوں کے فوراً بعد صرف یہی نہیں کہ ریپبلک

کے حامیوں نے موروثی خاندان‌والے مخالفین کو حواس باختہ کیا اور رپبلک‌والوں کو اشتراکیوں نے بدحواس کردیا ، بلکہ پیرس نے پورے فرانس کے ہاتھ پاؤں پھلا دئے ۔ قومی اسمبلی جس کا پہلا اجلاس ۴ مئی ۱۸۴۸ء کو ہوا ، پوری قوم کے ووٹوں سے چنی گئی تھی اور پوری قوم کی نمائندہ تھی ۔ فروری کے دن جن جن باتوں کے دعوےدار تھے ، قومی اسمبلی ان سب کےخلاف ایک زندہ احتجاج بن گئی اور اس نے یہ کام کیا کہ انقلاب کے سارے پھل بورژوازی کی جھولی میں ڈال دے ۔ ابھی اسمبلی کو شروع ہوئے چند روز گزرے تھے کہ پیرس کے پرولتاریہ نے اس کا اصلی کیرکٹر بھانپ لیا اور ۱۵ مئی ۱۸۴۸ء (۵۸) کو ایک ناکام کوشش کی کہ طاقت سے اسمبلی کا کام تمام کردے ، اس کو توڑدے اور پھر اجزا میں بکھیردے جن اجزا سے مل کر یہ ڈھانچہ بنا تھا جو قوم کی اسپرٹ کی الٹی تاثیر سے خود پرولتاریہ کےلئے خطرہ بن گیا تھا ۔ نتیجہ کیا ہوا ؟ ۱۵ مئی کو بلانکی اور اس کے ہم‌خیالوں کو جو واقعی پرولتاری پارٹی کے لیڈر تھے ، سماجی زندگی کے دائرے سے نکال دیا گیا اور ایسا نکالا گیا کہ پھر زیربحث دور میں وہ منظرعام پر آنے نہیں پائے ۔

لوئی فلپ کی بورژوا بادشاہی کی جگہ صرف بورژوا رپبلک لےسکتی ہے ، یعنی اگر بادشاہ کے نام کے پردے میں اب تک بورژوا کا چھوٹا سا حصہ حکمرانی کرتا تھا تو اب سے عوام کے پردے میں پوری کی پوری بورژوازی کی فرماں‌روائی چلےگی ۔ پیرس کے پرولتاریہ کے مطالبے سب ہوائی قلعے ہیں جن کا خاتمہ کردینا چاہئے ۔ آئین‌ساز قومی اسمبلی نے ادھر یہ اعلان کیا ، ادھر پیرس کے پرولتاریہ نے جون کی بغاوت برپا کرکے (دیکھئے نوٹ نمبر ۶) اس کا جواب دیا ، جو یورپ کی خانہ جنگیوں کی تاریخ میں بہت ہی زبردست واقعہ تھا ۔ بورژوائی رپبلک نے یہ میدان مارلیا ۔ اس کے حمایتیوں میں اوپر کے مالیاتی شرفا کا گروہ تھا ، صنعتی بورژوازی تھی ، درمیانی طبقہ تھا ، چھوٹی حیثیت کے کاروباری ، فوج اور مفلس آوارہ‌گرد (lumpenproletariat) جنھیں گشتی گارڈ (۵۹) کی حیثیت سے منظم کر لیا گیا تھا ، اعلا تعلیم‌یافتہ لوگ ، پادری اور دیہاتی آبادی ، سب شریک تھے ۔ پیرس

کے پرولتاری طبقے کی حمایت میں کوئی نہ تھا ، وہ تنہا رہ گیا ۔ بغاوت فرو ہوتے ہی تین ہزار سے زیادہ باغیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور پندرہ ہزار کو مقدمہ چلائے بغیر جلا وطن کردیا گیا ۔ اس شکست کے بعد سے پرولتاری طبقہ انقلاب کے منظرعام سے اوجھل ہوگیا ۔ تب سے ہر ایک موقع پر ، جہاں تحریک میں کچھ امنگ کے آثار پیدا ہوتے ہیں ، پرولتاریہ پھر سے سامنے آنے کی کوشش کرتا ہے لیکن ہر بار اس کی طاقت گھٹتی جاتی ہے اور کوشش کا حاصل کم سے کم ہوتا جاتا ہے ۔ پرولتاریہ سے اوپر کے جو سماجی پرت تھے ، ان میں سے جب کوئی انقلاب کی آنچ سے گرم ہونے لگتا ہے تو پرولتاریہ اس سے مل جاتا ہے اور اس طرح ان تمام شکستوں کی مار کھاتا ہے جو بعد میں ایک کے بعد ایک پارٹی کو اٹھانی پڑتی ہے ۔ شکست کھانے والی سوسائٹی کی سطح جتنی زیادہ جگہ گھیرتی ہے ، بعد کی چوٹوں کا اثر اتنا ہی کم ہوتا ہے ۔ اسمبلی میں اور پریس میں پرولتاریہ کے جتنے زیادہ نمایاں لیڈر تھے وہ یکے بعد دیگرے عدالت کی قربان گاھوں پر لائے جا رہے ہیں اور مشتبہ قسم کے لوگ ان کی جگہ سنبھالتے جا رہے ہیں ۔ پرولتاریہ کا ایک حصہ ایسا ہے جو نظریاتی تجربوں کے پھیر میں ، اکس چینج بینکوں اور مزدور انجمنوں میں پڑتا جا رہا ہے ، یوں کہئے کہ ایسی تحریک میں جا رہا ہے جہاں پہنچ کر وہ پرانی دنیا میں اتھل پتھل کرنے کے خیال سے ہی منکر ہے — وہ اتھل پتھل جو خود پرانی دنیا کے سارے زبردست ذریعے سمیٹ کر ، ان کے بل پر کی جاتی ہے ، اسی کو نہیں مانتا — اور سماج کی پیٹھ پیچھے سے بالکل ذاتی طور پر اپنی ہستی کے محدود حالات کے مطابق جیسے تیسے اپنی جان چھڑانے کی کوشش کر رہا ہے ، لازمی نتیجہ یہ کہ ہر بار کام بگڑ جاتا ہے ۔ نظر ایسا آتا ہے کہ پرولتاریہ میں نہ تو اب اتنا دم ہے کہ اپنی پہلے کی سی انقلابی عظمت پھر حاصل کرلے ، نہ اس کا یارا ہے کہ اپنے تازہ حلیفوں کی شرکت سے تازہ دم ہوجائے — یہ حالت تب تک رہے گی جب تک وہ

تمام طبقے جن سے اس نے جون میں مقابلہ کیا تھا، خود بھی بےدم ہوکر گر نہ جائیں۔ خیر، کم از کم اتنا تو ھوا کہ پرولتاریہ نے عالمی تاریخی جنگ کے شایان شان عزت‌آبرو کے ساتھ زخم کھائے۔ نہ صرف فرانس، بلکہ سارا یورپ جون کے واقعات کے زلزلے سے کانپ اٹھا ھے۔ حالاں‌کہ اوپر کے طبقوں نے بعد میں جو شکستیں کھائیں وہ اتنی سستی پڑتی ھیں کہ خود فتح پانے والے فریق کو بےشرمی کے ساتھ بڑھاچڑھا کر بیان کرنا پڑتا ھے تا کہ انھیں بھی قابل ذکر واقعہ شمار کیا جا سکے، تاھم شکست‌خوردہ فریق پرولتاریہ سے جتنا دور ھٹتا ھے بعد کی یہ شکستیں اور زیادہ شرمناک ھوتی جاتی ھیں۔

سچ یہ ھے کہ جون کے باغیوں کی شکست نے وہ زمین تیار کردی جس پر بورژوائی ریپبلک کی عمارت اٹھائی جا سکے اور یہ بھی دکھادیا کہ یورپ میں آج "ریپبلک یا بادشاھت" کی بحث نہیں بلکہ زیربحث سوال کچھ اور ھے۔ اس شکست نے یہ راز بھی کھول دیا کہ بورژوائی ریپبلک کا مطلب یہاں یہ ھے کہ ایک طبقہ دوسرے طبقوں پر من‌مانی حکومت چلائے۔ یہ بھی دکھا دیا کہ پرانے تمدن کے ملکوں میں جہاں طبقوں کی تقسیم بہت بڑھی ھوئی ھو، پیداوار کے جدید طریقے عام ھوں، اور ذھنوں کی بیداری اس حد کو پہنچ چکی ھو کہ صدیوں کے اثر سے تمام پچھلے خیالات تحلیل ھوکر رہ گئے ھوں، وھاں ریپبلک کا مطلب عام طور سے یہ ھوگا کہ بورژوائی سماج کے انقلابی کایا کلپ کی سیاسی شکل، نہ کہ قدامت‌پسندانہ شکل، جیسا کہ مثال کے طور پر شمالی امریکہ کی متحدہ ریاستوں میں رائج ھے جہاں اگرچہ طبقوں کا وجود ھے، لیکن ابھی وہ ایک حالت پر قائم نہیں ھوئے بلکہ ایک سے دوسرے طبقے میں آمدورفت یا ریل پیل برابر جاری ھے، جہاں پیداوار کے جدید ذریعے اپنے ساتھ ایک ٹھیری ھوئی فالتو آبادی اگانے کے بجائے آدمیوں یا محنتیوں کی کمی پورے کرنے کا فرض انجام دے رھے ھیں اور بالآخر جہاں مادی پیداوار کو آگے لےجانے کا جنون اور جوان ولولہ، جسے ابھی نئی دنیا کو اپنا نا ھے، اتنا مصروف‌کار ھے کہ بھوتوں‌والی پرانی دنیا کا خاتمہ کرنے کے لئے نہ تو اس کے پاس وقت ھے، نہ موقع۔

جون کے دنوں میں سارے طبقوں اور پارٹیوں نے مل کر ایک ضابطہ پارٹی بنائی پرولتاریوں کے طبقے کے خلاف ، جسے بےضابطہ پارٹی کہا گیا ، سوشلزم اور کمیونزم کی پارٹی کا نام دیا گیا۔ انھوں نے سماج کو ''سماج کے دشمنوں'' سے ''بچا لیا''۔ اپنی فوج کے لئے انھوں نے جو پہلول یعنی شناخت کا بول چنا وہ بھی پرانے سماج کا نعرہ تھا : ''نجی ملکیت ، خاندان ، مذہب اور قاعدہ قانون'' اور انقلاب کے مخالف مجاہدوں کو اس نعرے سے ابھارا کہ ''اس صلیب کے سائے میں فتح پاؤگے'' (۶۰)۔ اس لمحے کے بعد سے جب بھی ان کئی پارٹیوں میں سے ایسی کوئی پارٹی جو کبھی جون کے باغیوں کے مقابلے پر ان پرچموں تلے کھڑی ہوئی تھی ، خود اپنے طبقے کی خاطر انقلابی میدان میں اترنے کی کوشش کرتی ہے تو اسے بھی انھی نعروں سے شکست دی‌جاتی ہے کہ ''نجی ملکیت ، خاندان ، مذہب اور قاعدہ قانون''۔ ہر بار جب حکمرانوں کا حلقہ اور سکڑتا ہے ، ہر بار جب زیادہ عام مفادوں کےبجائے خاص مفاد حاوی ہوتے ہیں تو کہا جاتا ہے کہ سماج کو دشمن کی زد سے بچایا گیا۔ چاہے سرمایہ‌دارانہ مالیاتی نظام کی اصلاح کا معمولی سا تقاضا ہو ، چاہے سیدھا سادہ اعتدال‌پسندی کا مطالبہ ہو ، چاہے یوں ہی رسمی سی رپبلکن‌ازم کی مانگ ہو ، یا سطحی سی جمہوریت پسندی کا مطالبہ ، ان سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکا جاتا ہے کہ یہ ''سماج پر قاتلانہ حملہ'' ہے اور اس سے ''سوشلزم'' کی بو آتی ہے۔ آخری بات یہ کہ وہی جو ''مذہب اور قاعدے قانون'' کے سب سے اونچے نگہبان تھے ، انھی کو ٹھوکریں مارمارکر روحانی مسندوں سے اتارا جاتا ہے ، آدھی رات کو بستروں سے گھسیٹا جاتا ہے ، حوالات کی گاڑیوں میں بھرا جاتا ہے ، جیل میں ٹھونسا یا جلاوطنی میں پھینکا جاتا ہے ، ان کی عبادت‌گاہوں کو مسمار کیا جاتا ہے ، ان کے ہونٹوں پر مہر لگتی ہے ، قلم توڑے جاتے ہیں اور ان کے قانون کی دھجیاں اڑائی جاتی ہیں مذہب ، نجی ملکیت ، خاندان اور قاعدے قانون کے نام پر۔ اسی نام پر یہ ہو رہا ہے کہ نشے میں بےقابو

فوجیوں کے ھجوم اپنے چھجے پر کھڑے انھی بورژواؤں کو گولی مار دیتے ھیں جنھیں قاعدے قانون کی رٹ لگی ھوئی تھی ، ان کے خاندان کی عزت پر آنچ آتی ھے ، ان کے گھروں پر یوں ھی تفریح میں بم پھینکے جاتے ھیں ۔ اور کمال یہ کہ بورژوائی سماج کا کوڑاکرکٹ بٹور کر قاعدے قانون کا پاکیزہ بازو تیار کیا جاتا ھے ، پھر کراپیولینسکی سورما (لوئی بوناپارٹ) تویلری کے قصر شاھی میں ”سماج کا نجات‌دھندہ،، بن کر براجمان ھوتا ھے ۔

۲

آئیے ، پھر سے ڈور کا سرا تھامیں ۔

جون‌والے دنوں کے بعد سے آئین‌ساز قومی اسمبلی کی تاریخ بورژوازی کے ریپبلکن گروہ کے غالب آجانے اور بکھر جانے کی تاریخ ھے ، اس گروہ کے غلبے اور بکھراؤ کی جو مختلف ناموں سے پکارا جاتا ھے ، ترنگے ریپبلکن ، خالص ریپبلکن ، سیاسی ریپبلکن اور رسمی ریپبلکن وغیرہ وغیرہ ۔

جب تک لوئی فلپ کی بورژوائی بادشاھت قائم تھی ، اس گروہ نے باقاعدہ ریپبلکن خیالات کا ایک حزب مخالف بنالیا تھا اور اپنے وقت کی سیاسی دنیا کے ایک جزو کی حیثیت منوا لی تھی ۔ خاص خاص اداروں میں اس کے نمائندے موجود تھے اور اخباری دنیا میں اچھا خاصا حلقۂ‌اثر بنا ھوا تھا ۔ پیرس میں جو اس کا ترجمان اخبار «National» (” نیشنل ،،) (٦۱) کے نام سے نکلتا تھا ، بجائے خود اس کی اتنی ھی وقعت تھی جتنی «Journal des Débats» (٦۲) کی ۔ آئینی بادشاھت کے ھوتے اس کی جو حیثیت بنی وہ اس کے کیرکٹر کے عین مطابق تھی ۔ یہ بورژوازی کا کوئی ایسا گروہ نہ تھا جسے مشترکہ مفاد نے جوڑ رکھا ھو اور جسے پیداوار کے خاص حالات نے ابھارا ھو ۔ یہ دراصل ایک ایسی ٹولی تھی جس میں ریپبلکن خیالات کے بورژوا بھی شامل تھے ، اھل قلم بھی ، قانون پیشہ لوگ ، افسر اور سرکاری اھلکار بھی ۔ اس ٹولی کا اثر قائم ھوگیا ملک کی اس نفرت کی بدولت جو لوئی فلپ کے خلاف عام تھی ، فرانس کی پہلی ریپبلک کی

یاد جو دماغوں میں بسی ہوئی تھی ، اس کی بدولت ، خوابوں کی دنیا کے ان باسیوں کی بدولت جو رپبلکن اعتقاد رکھتے تھے ، اور سب سے بڑی وجہ تھی فرانسیسی نیشنلزم جو ویانا کے صلح ناموں (٦٣) کو اور انگلینڈ سے اتحاد کے تصور کو کسی طرح گلے اتارنے پر آمادہ نہیں تھا ۔ لوئی فلپ کے زمانے میں ''نیشنل'' کے حامیوں کا ایک بڑا حصہ اسی درپردہ اسپریلزم کی بدولت بنا تھا جو بعد میں ، رپبلک قائم ہوجانے پر خاص اسی کارن لوئی بوناپارٹ کی صورت میں ''نیشنل'' کا مدمقابل اور دشمن بن کر کھڑا ہو گیا ۔ ''نیشنل'' اخبار نے بھی اوپر کے مالیاتی شرفا کی اسی طرح کاٹ کی جیسے حزب مخالف کے دوسرے بورژوا حلقوں نے کی ۔ بجٹ پر جو بحث مباحثہ چلا اور فرانس میں یہ مباحثہ اور مالیات پر چھائے ہوئے شرفا کا منہتوڑ مقابلہ دونوں ایک دوسرے سے مطابقت رکھتے تھے ، اس نے اخبار کو بہت سستی شہرت بھی دلوا دی اور ایسا مسالہ بھی ڈھیر کر دیا جس سے نہایت پاک‌پاکیزہ قسم کے اڈی‌ٹوریل لکھے جائیں کہ اس مباحثے سے فائدہ اٹھایا جاتا تھا ۔ صنعتی بورژوازی اس کی شکرگزار ہوئی کہ ''نیشنل'' نے فرانس کے سرپرستانہ سسٹم کی حمایت میں آنکھیں بند کرکے پورا زور لگادیا ، اگرچہ اخبار نے یہ اندھادھند طرفداری زیادہ تر قوم‌پرستی کی نظر سے کی تھی ، سیاسی معاشیات کے پہلو سے نہیں ۔ ساری کی ساری بورژوازی نے احسان مانا اس بات کا کہ ''نیشنل'' نے سوشلزم اور کمیونزم پر دل کا بخار خوب نکالا ۔ یہ ضرور ہے کہ ''نیشنل'' والوں کی پارٹی خالص رپبلکن تھی یعنی اس نے بورژوائی حکمرانی‌والی بادشاہی شکل کے بجائے رپبلکن شکل طلب کی ، اور سب سے اول یہ کہ اس حکمرانی میں اوروں کے حصے سے کچھ زیادہ ہی دبا لینا چاہا ۔ مگر اس سیاسی ادل بدل کی شرطوں کے بارے میں اس کا ذہن بہت دھندلکے میں تھا ۔ البتہ ایک بات روز روشن کی طرح صاف تھی اور لوئی فلپ کے آخری دنوں میں جو اصلاحات کے سلسلے کی شاندار دعوتیں ہوئی ہیں ان سوقعوں پر بھی کھلے لفظوں میں مانی گئی ، وہ یہ کہ چھوٹی حیثیت کے جمہوریت‌پسندوں میں ، خاص کر انقلابی پرولتاریہ میں اس پارٹی کو

اچھی نظر سے نہیں دیکھا جا رہا۔ یہ خالص ریپبلکن لوگ شروع شروع میں صرف اتنے پر راضی ہونےوالے تھے، اور اتنے ہی پر راضی ہوجانا خالص ریپبلکنوں کا چلن بھی ہے، کہ اورلین کی شہزدی (Ducshess of Orleans) کو لےکر ایک کام‌چلاؤ حکومتی ریجنسی بنالی‌جائے، چناں‌چہ فروری کا انقلاب اٹھتے ہی انھوں نے اپنے بہترین آدمیوں کو عارضی حکومت میں جگہ بھی دلوا دی۔ شروع سے ہی انھیں قدرتی طور پر بورژوازی کا اعتماد حاصل تھا اور آئین‌ساز قومی اسمبلی میں اکثریت بھی بنی ہوئی تھی۔ عارضی حکومت میں جو اشتراکی عنصر آ گیا تھا، اس کو لگے ہاتھوں انتظامیہ کمیشن سے باہر رکھا گیا — یہ وہی انتظامیہ کمیشن ہے جسے قومی اسمبلی نے اپنے اولین اجلاس میں مقرر کیا تھا۔ ”نیشنل،، والوں کی پارٹی نے جون میں پھوٹ پڑنےوالی بغاوت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خود انتظامیہ کمیشن کو ہی برخاست کردیا اور اس ترکیب سے اپنے سب سے نزدیکی حریفوں، یعنی چھوٹی بورژوائی یا جمہوریت پسند ریپبلکنوں (مثلاً لیدرو رولین وغیرہ) سے بھی جان چھڑالی۔ بورژوائی ریپبلکن پارٹی کے جنرل کوےنیاک نے، جون کے قتل‌عام کا سپہ‌سالار یہی شخص تھا، انتظامیہ کمیشن کی ساری ذمہ‌داریاں، ڈکٹیٹرانہ اختیارات کے ساتھ اپنے ہاتھ میں لےلیں۔ ”نیشنل،، اخبار کا چیف ایڈیٹر مراست آئین‌ساز قومی اسمبلی کا مستقل صدر بن بیٹھا۔ وزارتیں اور انھی کے ساتھ خاص خاص عہدے خالص ریپبلکنوں کے ہاتھ‌پڑے۔

ریپبلکنوں کے بورژوائی گروہ نے، جو بہت دنوں سے خود کو جولائی‌والی بادشاہت کا جائز وارث سمجھ رہا تھا، دیکھا کہ ارمان پورے ہونے سے کچھ زیادہ ہی مل رہا ہے۔ البتہ اس گروہ کو جو نصیب ہوا وہ اس صورت سے نہیں جیسا لوئی فلپ کے زمانے میں سوچ رکھا تھا، کہ بورژوازی کی طرف سے تخت و تاج کے خلاف ایک آزاد خیال قسم کا ہنگامہ برپا ہوگا، بلکہ ہوا یہ کہ سرمائے کے خلاف پرولتاریہ کی بغاوت کو بندوق کے چھروں سے ٹھنڈا کر دیا گیا۔ وہ واقعہ جسے اس گروہ نے انتہائی انقلابی ہنگامہ فرض کیا تھا وہ حقیقت میں الٹا انقلاب کے‌خلاف واقعہ نکلا۔ پکے پھل اس بورژوائی

گروہ کی جھولی میں گرے، لیکن زندگی کے درخت پر پکے ہوئے نہیں بلکہ علم وآگاہی کے درخت سے اترے ہوئے۔

بورژوا ریپبلکنوں کی بےشرکت حکومت صرف ۲۴ جون سے ۱۰ دسمبر ۱۸۴۸ء تک چلی۔ آخر میں ریپبلکن آئین کا ایک خاکہ دے کر اور پیرس کے محاصرے کی حالت کا اعلان کرکے اٹھ گئی۔

نیا آئین اصلیت میں ۱۸۳۰ء کے آئینی چارٹر (۶۴) کا ایک ریپبلکن ایڈیشن تھا اور کچھ نہیں۔ جولائی والی بادشاہت نے جو انتخابی حق کو شرطیں لگاکر محدود کر رکھا تھا، جس کے تحت بورژوازی کے بڑے حصے کو سیاسی اختیارات یا حکمرانی کا موقع نہیں ملتا تھا، وہ بورژوائی ریپبلک کے وجود سے میل نہیں کھاتے تھے۔ فروری والے انقلاب نے ان شرطوں کو منسوخ کرکے ان کی جگہ فوراً عام رائے دہندگی اور انتخاب کا حق دینے کا اعلان کردیا۔ بورژوا ریپبلکنوں کے اختیار کی بات نہ تھی کہ اس اعلان کو رد کر دیتے، اس پر صرف اتنی شرط بڑھا کر ان کی تسلی ہوگئی کہ رائے دہندہ اپنے حلقۂ انتخاب میں چھ مہینے رہ چکا ہو۔ پہلے سے جو انتظامیہ محکمے چلے آرہے تھے، میونسپل سسٹم تھا، عدالتی نظام تھا، فوج وغیرہ تھی، وہ سب جوں کا توں رہا۔ جو نئے آئین نے کہیں کچھ بدلا بھی تو صرف خانے بدلے، اندر تک نہیں چھیڑا، صرف نام بدلے، چیزوں کو نہیں چھوا۔

۱۸۴۸ء کی آزادیوں کے جنرل اسٹاف، یعنی شخصی آزادی، تحریرو تقریر، یونین، جلسہ جلوس، تعلیم اور عقیدے کی آزادی، ان سب کو آئینی وردی پہنا دی گئی جس سے وہ ہر قسم کی دخل اندازی سے بالاتر ہوگئے۔ ان میں سے ہر ایک آزادی کو ہر ایک فرانسیسی باشندے کا بےدخل حق مان لیا گیا، اس ہلکی سی شرط کے ساتھ کہ ان پر تب تک کسی قسم کی پابندی نہ ہوگی جب تک "دوسروں کے مساویانہ حقوق اور سماجی سلامتی" کی طرف سے رکاوٹ نہ پڑے — یعنی ایسے "قانونوں" کی طرف سے پابندی نہ لگائی جائے جن کا مطلب ہوگا انفرادی آزادی اور سماجی سلامتی کے درمیان ہم آہنگی کی خاطر بیچ بچاؤ کرنا۔ مثال کے طور پر فرانسیسی آئین

کا باب دوم ، دفعہ ۸ کہتی ہے : " باشندوں کو انجمن بنانے کا ، پرامن اور بےہتھیار جلسےجلوس کا ، اپیل داخل کرنے کا ، عدالتی چارہ جوئی کا ، پریس میں یا جس طرح چاہیں اپنے خیالات ظاہر کرنے کا پورا اختیار ہے ۔ ان اختیارات کے استعمال پر سوائے اس کے کوئی حدبندی نہ ہوگی کہ دوسروں کو بھی برابر کا اختیار ملے ، اور سماجی سلامتی قائم رہے "۔ دفعہ ۹ کہتی ہے : " تعلیم آزاد ہے ۔ تعلیم کی آزادی کا استعمال ان شرطوں کے تحت عام ہوگا جو قانون کی طرف سے احتیاطاً یا سرکاری نگرانی کی طرف سے لگائی جائیں "۔ دفعہ ۳ کہتی ہے : " ہر ایک باشندے کے رہنے کی جگہ پر کوئی دخل‌اندازی نہیں ہوسکتی ۔ اس حق کی خلاف‌ورزی صرف اس صورت میں ہو سکتی ہے جب قانون میں درج کی ہوئی صورتوں کی پوری پابندی کی جائے "، وغیرہ وغیرہ ۔ بس یہ آئین باربار حوالہ دے رہا ہے کہ آئندہ کچھ ایسے ضمنی قانون آنےوالے ہیں جو تفصیلی تشریح کریں گے ان شرطوں کی جو آزادانہ حقوق کے ساتھ لگی ہیں اور ان غیرمشروط آزادیوں کے استعمال میں باقاعدگی پیدا کریں گے تاکہ وہ ایک دوسرے سے بھی نہ ٹکرائیں اور سماجی سلامتی سے بھی ان کا تصادم نہ ہو ۔ آگے چل کر قاعدے قانون کے خیرخواہوں نے یہ ضمنی قانون بنادئے اور ان آزادیوں میں کچھ ایسی باقاعدگی پیدا کی کہ بورژوازی ان سے کھلا فائدہ اٹھا سکے ، اور برابر کے حقوق رکھنےوالے دوسرے طبقوں کی طرف سے کوئی رکاوٹ نہ پڑنے پائے ۔ جہاں بھی " دوسروں "، کو ان آزادیوں سے محروم کیا گیا ، یا ان کے استعمال کو ایسی شرطوں کا پابند کیا گیا جو پولیس کے پھندوں میں پھنسانےوالی تھیں وہاں ہمیشہ ایک ہی عذر تھا کہ یہ سب کچھ " سماجی سلامتی "، کی خاطر کیا جا رہا ہے یعنی بورژوازی کی سلامتی کی خاطر ، جیسی کہ آئین میں گنجائش رکھی گئی تھی ۔ چناں چہ دونوں فریق بجا طور پر آئین کی طرف رجوع کرتے تھے — قاعدے قانون کے خیرخواہ بھی جنھوں نے ساری آزادیوں کو معطل کردیا ، اور وہ ڈیموکریٹ بھی جو ساری آزادیاں طلب کرتے تھے ۔ آئین کے ہر ایک پیراگراف میں اس کی کاٹ بھی رکھی گئی تھی ، اس کا اپنا

ایوان بالا (راجیہ سبھا) اور ایوان عوام (لوک سبھا) موجود تھا: عام جملوں میں آزادی ھی آزادی اور ضمنی شرطوں میں اس کی منسوخی۔ نتیجہ یہ کہ جب تک آزادی کے نام کی آبرو رھی اور صرف اس کے اصلی وجود میں رکاوٹ پڑتی تھی — ظاھر ھے کہ یہ رکاوٹ قانون کی بنیاد پر ڈالی جاتی تھی — تب تک آزادی کا آئینی وجود بھی بنا رھا، اسے نہیں چھیڑا گیا، اگرچہ روزمرہ کی زندگی میں آزادی کے وجود پر کاری ضرب پڑتی رھتی تھی۔

اس آئین کو دخل اندازی سے پاک رکھنے میں بڑی چالاکی سے کام لیا گیا تھا پھربھی یونانی داستان کے اکیلیس پہلوان کی طرح اس میں کمزور رگ موجود تھی — ایڑی میں نہیں بلکہ سر میں، اور ایک نہیں بلکہ دو سروں میں، جو اس کے شانوں کے اوپر اٹھے ھوئے تھے: ایک طرف قانون ساز اسمبلی، دوسری طرف پریسیڈنٹ۔ آئین پر ایک سرسری نظر ڈالنا کافی ھے اور فوراً معلوم ھوجاتا ھے کہ صرف وہ دفعات جن میں پریسیڈنٹ کا قانون‌ساز اسمبلی سے تعلق جتایا گیا ھے، صرف وھی غیرمشروط ھیں، انھی کی اثباتی حیثیت ھے، ان میں ایک دوسرے کی کاٹ نہیں، کسی ھیر پھیر کی گنجائش نہیں۔ بورژوائی رپبلکنوں کو یہاں صرف اس سے غرض تھی کہ اپنی پوزیشن پر کوئی آنچ نہ آنے پائے۔ دفعہ ۴۵ سے ۷۰ تک آئین میں یہ رکھا گیا ھے کہ قومی اسمبلی آئین کی پابند رہ کر پریسیڈنٹ کو ھٹا سکتی ھے، لیکن پریسیڈنٹ چاھے تو قومی اسمبلی کو آئین کی پابندی کرتے ھوئے نہیں ھٹا سکتا، ھٹانے کے لئے خود آئین کو ھی رد کرنا ھوگا۔ چناں‌چہ خود آئین ھی شہ دیتا ھے کہ طاقت کے زور سے اس کا خاتمہ کردیا جائے۔ ۱۸۳۰ء کے چارٹر میں تو صرف اقتدار ھی بٹا ھوا تھا، یہاں اس تقسیم کو ایسی انتہا تک پہنچا دیا گیا ھے کہ اس کا تضاد ناقابل برداشت ھوگیا۔ آئینی اختیارات کا کھیل، جسے گیزو نے قانون‌سازی اور انتظامیہ کے جداگانہ اختیارات کی پارلیمنٹری چخ‌چخ کہا ھے، ۱۸۴۸ء کے آئین میں اس طرح کھیلا گیا کہ جو کچھ ھے، داؤ پر لگا دو۔ ایک طرف ساڑھے سات سو نمائندوں کی قومی اسمبلی ھے، یہ نمائندے عام رائے دھندگی سے چن کر آئے ھیں،

اور پھر سے چنے جانے کے مجاز ہیں ، ان سے مل کر قومی اسمبلی بنی ہے جس پر کسی کا زور نہیں ، وہ نہ تحلیل کی جا سکتی ہے ، نہ تقسیم کی جا سکتی ہے ، اس کے قانون سازی کے اختیارات کی کوئی حد نہیں ، جنگ ، امن یا تجارتی معاهدے کے فیصلوں کی مختار ہے ، معافی دینے کا حق صرف اس کو پہنچتا ہے اور مستقل اجلاس رکھنے کی بدولت وہ ہمیشہ منظر عام پر حاوی رہتی ہے ۔ دوسری طرف پریسیڈنٹ ہے ، جسے شاہی کے تمام اختیارات حاصل ہیں ۔ وہ قومی اسمبلی سے پوچھے بغیر اپنے وزیر مقرر یا الگ کر سکتا ہے ۔ انتظامیہ اختیارات کی تمام باگ‌ڈور اس کے ہاتھ میں ہے ، سارے عہدوں کی تقرری کا اختیار ہے ، جس کی بدولت پورے فرانس کے کم‌از کم پندرہ لاکھ آدمی کی تقدیر اس کے قبضہ قدرت میں ہے ، کیوں کہ مختلف درجوں کے ۵ لاکھ سرکاری ملازموں سے پندرہ لاکھ کی روزی وابستہ ہوتی ہے ۔ فوج کی ساری مسلح طاقت اس کے تحت ہے ۔ یہ خصوصی اختیار حاصل ہے کہ کسی مجرم کو چاہے تو معاف کردے ، نیشنل گارڈ کو برخاست کردے ، اور اسٹیٹ کونسل کی منظوری کے ساتھ جنرل کونسلوں ، ضلع کونسلوں اور میونسپل کونسلوں کو بھی توڑدے جو لوگوں کے ووٹ سے چنی جاتی ہیں ۔ دوسرے ملکوں سے جو معاهدے کئے‌جائیں ، ان کی تحریک کرنے اور انھیں کوئی رخ دینے کا رول بھی اسے انجام دینا ہے ۔ اور ایسی حالت میں جب کہ اسمبلی برابر لوگوں کی نظر کے سامنے موجود ہے اور آئے دن پبلک کی نکتہ‌چینی کی شکار رہتی ہے ، پریسیڈنٹ سب کی نظر سے اوجھل یلی‌سےئی (۶۵) کے شاہی محل میں زندگی گزارتا ہے ۔ اس کے دل‌ونظر کے سامنے آئین کی ایک دفعہ ۴۵ ایسی ہے جو روزانہ پکار کر کہتی ہے : * «frère, il faut mourir!» (بھائی ، مرنے کو تیار رہو !) ۔ اپنے انتخاب کے چوتھے سال مئی کے لاجواب مہینے میں دوسرے اتوار کو آپ کے اختیارات کا خاتمہ ہونے‌والا

---

* کیتھولک راهبوں کا ایک فرقہ ان لفظوں سے آپس میں سلام کرتا ہے ۔ (ایڈیٹر)

ہے ۔ آپ کی شان ہوا ہوجائےگی : اس ڈرامے کا دوسرا منظر نہیں کھلنےوالا ، اور اگر آپ کی طرف قرضہ نکلتا ہو تو وہ جو آپ کو آئین کی منظوری سے ۶ لاکھ فرانک تنخواہ ملتی ہے ، اس میں سے وقت پر ادا کرنے کی کوشش کیجئے ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ مئی کے لاجواب مہینے کے دوسرے سوموار کو کلیشی (٦٦) روانہ ہونےوالے ہوں ! — اس طرح سے ، اگر آئین نے اصل طاقت پریسیڈنٹ کے ہاتھ میں دے رکھی تھی تو اس نے کوشش کی کہ اخلاقی طاقت قومی اسمبلی کے ہاتھ میں رہے ۔ یہ تو خیر حقیقت ہے کہ اخلاقی طاقت قانونی پیراگرافوں سے پیدا کرنا ممکن نہیں ہوتا ، اس کے علاوہ یہ بھی ہوا کہ پریسیڈنٹ کو تمام فرانسیسیوں کے براہ راست ووٹ سے چنوا کر آئین نے خود اپنے پاؤں میں کلھاڑی مارلی ۔ ایسے میں جب‌کہ سارے فرانس کے ووٹ قومی اسمبلی کے ساڑھے سات سو ممبروں میں تقسیم ہوئے ہوں ، پریسیڈنٹ کے چناؤ میں وہ سب ایک شخص پر جمع ہوگئے ۔ ایسے میں جب‌کہ قومی اسمبلی کا ہر ایک ممبر کسی ایک پارٹی کا ، کسی ایک حلقے یا ٹھکانے کا نمائندہ ہے یا اور کچھ نہیں تو صرف اس‌لئے نمائندگی کر رہا ہے کہ ساڑھے سات سو میں سے ایک کا چناؤ کرنا ہے ، حالاں‌کہ نہ تو اصل سوال پر کوئی خاص دھیان دیا گیا ، نہ چنےجانےوالے کی شخصیت پر ، — اور ایک ہے پریسیڈنٹ جسے پوری قوم کے ووٹوں سے چنا گیا اور اس کا چناؤ ترپ کا پتہ ہے جو ایک خودمختار قوم چار سال میں صرف ایک بار چلتی ہے ۔ قوم کے ساتھ چنی‌ہوئی قومی اسمبلی کا رشتہ مالعدالطبیعیاتی (بہت۔ پھیر کا) ہے ، لیکن چنے ہوئے پریسیڈنٹ کا رشتہ قوم کے ساتھ ذاتی ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ قومی اسمبلی کے الگ الگ ممبروں میں قومی اسپرٹ کے رنگارنگ پہلوؤں کی ترجمانی ہوتی ہے ، لیکن پریسیڈنٹ کی ذات میں ساری قوم کی اسپرٹ سمٹ آتی ہے ۔ قومی اسمبلی کے مقابلے میں پریسیڈنٹ کی پشت پر گویا غیبی ہاتھ ہے ، وہ قوم کی عنایت سے صاحب اختیار ہوا ہے ۔

کہتے ہیں کہ سمندروں کی دیوی تھی‌ٹس (Thetis) نے اکیلیس کے حق میں جوانا مرگی کی پیش گوئی کی تھی ۔ یہ آئین جس میں

اکیلیس کی طرح کمزور رگ پائی جاتی ہے، اسی یونانی ہیرو کی طرح پیشگوئی کا شکار ہوا کہ اسے بھی عین نوجوانی میں موت آئےگی۔ سمندر کی دیوی کو ضرورت نہیں تھی کہ پانی سے نکل کر آئے اور ریپبلک کے قانون سازوں، خالص ریپبلکنوں کے کان میں اپنا منتر پھونک جائے۔ بس، اگر یہ لوگ اپنے آدرشوں کی ریپبلک کے ہوائی محل سے نیچے جھک کر حقیر پرتقصیر زمین پر ایک نظر ڈال لیتے تو صاف پتہ چل جاتا کہ شاہ‌پرستوں، بوناپارٹ والوں، ڈیموکریٹوں اور کمیونسٹوں کی سینہ‌زوری بڑھنے کے ساتھ خود ان کی مقبولیت بھی روز بہ روز اسی رفتار سے گھٹتی جا رہی تھی جس رفتار سے وہ قانون سازی کے فنی شہپارے کی تکمیل کے قریب پہنچ رہے تھے۔ انھوں نے آئین کے پھندے میں تقدیر کو پھانسنے کی کوشش کی۔ آئین کی دفعہ ۱۱۱ کے مطابق یہ قاعدہ رکھا کہ آئین پر کسی نظرثانی یا ترمیم کے لئے ضروری ہے کہ کم از کم تین چوتھائی ووٹ سے اس کی تحریک کی جائے، اور پے‌درپے تین ایسے مباحثوں میں یہ ووٹ دئےجائیں جن میں سے ہر ایک کےدرمیان پورے ایک مہینے کا وقفہ ہو اور اسی میں یہ شق بھی شامل تھی کہ قومی اسمبلی کے کم‌ازکم پانچ سو ممبروں نے (تحریک کے حق میں) ووٹ ڈالے ہوں۔ یہ محض ایک ناکارہ کوشش تھی ایسے برے وقت بھی اپنے ہاتھ میں اقتدار رکھنے کی، جسے انھوں نے دور سے بھانپ لیا تھا کہ وہ پارلیمنٹ کے اندر اقلیت میں رہ جائیں‌گے۔ اور ایسی حالت میں جبکہ پارلیمنٹ کی اکثریت حاصل کرلی تھی اور حکومت کی طاقت کے سارے ذریعے ان کے ہاتھ میں آ گئے تھے، وہ اپنی طاقت اس برے وقت کے لئے بنائے رکھنے کی کوشش کر رہے تھے کیونکہ وہ روزبہ‌روز ان کے کمزور ہاتھوں سے پھسلتی جا رہی تھی۔

آخر میں آئین ایک نیم ڈرامائی پیراگراف میں خود کو سپرد کرتا ہے ”پوری فرانسیسی قوم اور ہر ایک فرانسیسی فرد کی خبرداری اور حب‌وطن کو“۔ حالاں‌کہ اس سے پہلے ایک دفعہ میں یہی آئین ”خبردار“ اور ”حب‌وطن رکھنےوالے“ فرانسیسیوں کو نرم و نازک اور بہت ہی گہری چھان پھٹک کرنےوالے «haute cour»

(ھائی کورٹ) کے سپرد کرچکا ھے جسے آئین نے خاص اسی غرض سے وضع کیا تھا۔

یہ تھا وہ ۱۸۴۸ء کا دستور جو دوسری دسمبر ۱۸۵۱ء کو کسی ایک شخص کے سر مار دینے سے نہیں بلکہ محض ٹوپ چھوا دینے سے منھ کے بل گرگیا، یہ ضرور ھے کہ ٹوپ نپولین کا سا تکونا ٹوپ تھا۔

جن دنوں قومی اسمبلی کے اندر بورژوائی رپبلکن اس آئین میں رنگ بھر رھے تھے، اس پر بحث کر رھے تھے اور اس کے حق میں ووٹ دے رھے تھے، اسمبلی کے باھر کوےنیاک نے پیرس کے محاصرے کا اعلان کر رکھا تھا۔ یہ محاصرہ آئین‌ساز اسمبلی کی دایہ تھی جو رپبلک کی پیدائش کے وقت دردزہ کی دیکھ بھال کر رھی تھی۔ اگر آگے چل کر سنگینوں کے زور سے آئین کا خاتمہ کر دیا گیا تو یہ نہ بھولنا چاھئے کہ پہلے رحم مادر میں بھی اس کی نگہبانی سنگینوں نے ھی کی تھی اور سنگینوں کے سائے میں ھی اس کا وجود ھوا تھا، اور بعد میں انھی سنگینوں کا رخ عوام کی طرف پھیر دیا گیا۔ ”باصول رپبلکنوں،، کے باپ‌دادا نے اپنی آئین کے نشان یعنی ترنگے جھنڈے (۶۷) کو سارے یورپ میں گھمایا تھا۔ انھی ”باصول رپبلکنوں،، نے اپنی باری آنے پر ایک نئی ایجاد کی جو خود سارے یورپ میں گھوم گئی۔ ابھی دلوں میں اس کی محبت سرد نہ ھوئی تھی کہ یہ ایجاد جب اپنے وطن کو واپس آئی تو فرانس کے آدھے محکموں نے اس کے حق شہریت پر مہر بھی لگائی۔ یہ فرانسیسی ایجاد ھے محاصرے کی حالت۔ لاجواب ایجاد ھے۔ فرانسیسی انقلاب کے دور میں جب بھی باربار سنکٹ کا وقت آیا، یہ ایجاد کارآمد نکلی۔ لیکن فوجی بارک اور فوجی ڈیرے، جن کا بوجھ پہلے بھی کئی بار فرانسیسی سماج کے سر پر لادا گیا تاکہ اس کی سمجھ بوجھ پر دباؤ پڑے اور اسے نچلا بٹھا دیا جائے، وہ تلوار اور بندوق جسے کئی بار عدالت اور انتظام، سرپرست اور سنسر کی ذمہ‌داری ادا کرنے کا، پولیس‌والے اور رات کے چوکیدار کا کام انجام دینے کا موقع ملا، وہ مونچھیں اور فوجی وردی جنھوں نے ڈنکے بجادئے کہ

وهی سوسائٹی کی عقل کل اور اس کی مربی هیں ، — بهلا یه فوجی بارک اور ڈیرے ، یه تلوار اور بندوق ، یه مونچهیں اور وردی آخر میں خود اس نتیجے پر کیوں نه پہنچتیں که اچها هے که سوسائٹی کو ایک مرتبه همیشه کےلئے بچالیا جائے ، خود اپنے بندوبست کو سب سے اونچی حیثیت دےدی جائے ، اور بورژوا سماج کو اپنا انتظام چلانے کے درد سر سے بالکل هی نجات دےدی جائے - فوجی بارک اور ڈیرے ، تلوار اور بندوق ، مونچهوں اور وردی کو یه خیال یوں بهی زیاده آنا چاهئے تها که اگر وه ایسا کرنے پر آجائیں تو انهیں اپنی بیش‌قیمت خدمات کے بدلے نقد رقم بهی زیاده هاتھ لگےگی ، جب که وقتاً فوقتاً محاصرے کی حالت میں اور بورژوازی کے ایک یا دوسرے گروه کے حکم پر سوسائٹی کا عارضی بچاؤ کرنے کی صورت میں خود ان کے پلے بہت کم پڑتا تها ، سوائے اس کے که کچھ جوان مارے جاتے ، کچھ زخمی هوتے ، اور بورژوازی کی طرف سے انعام میں کچھ تیکهی مسکراهٹیں مل‌جاتیں - فوجی جوان اپنے حق اور اپنے مفاد میں خود هی کیوں نه محاصرے کی حالت کا اعلان کرکے دیکھ لیتے اور پهر اسی میں بورژوا کی تجوری کا بهی محاصره هوجاتا - جملهٔ معترضه کے طور پر ، اسی ضمن میں یه بهی نه بهولنا چاهئے که کرنل برنار ، جنگی کمیشنوں کا وهی نمائنده جس نے کوےنیاک حکومت کے دنوں میں ۱۵ هزار باغیوں کو مقدسه چلائے بغیر جلاوطن کیا تها ، پهر ان جنگی کمیشنوں کا سربراه بنا بیٹها هے جو پیرس میں کام کر رهے هیں -

پیرس کے محاصرے کی حالت کا اعلان کرکے اگر ” بااصول ،، اور خالص ریپبلکنوں نے ایسی نرسری جمائی جس میں آگے چل کر دوسری دسمبر ۱۸۵۱ ء کے پری‌ٹورین (۶۸) اگنےوالے تهے ، تو دوسری طرف سے بهی وه داد کے مستحق هیں که لوئی فلپ کے زمانے میں تو وه قومی جذبات کو خوب بهڑکایا کرتے تهے ، لیکن اب جبکه ساری قوم کے اختیارات ان کی مرضی پر منحصر هوگئے تو غیرملکی طاقتوں کے سامنے رینگنے لگے اور بجائے اس کے که اٹلی کو آزاد کرتے ، آسٹریا کو اور نیاپولٹن (۶۹) کو موقع دے رهے هیں که وه بڑھ کر پهر سے اٹلی پر قبضه کرلیں - ۱۰ دسمبر ۱۸۴۸ ء کو جب لوئی

بوناپارٹ کا پریسیڈنٹ کی جگہ چناؤ ہوا ، اسی چناؤ نے کوےنیاک کی ڈکٹیٹری اور آئین‌ساز اسمبلی ، دونوں کا خاتمہ کردیا ۔

آئین کی دفعہ ۴۴ میں کہاگیا ھے کہ ''فرانسیسی رپبلک کا پریسیڈنٹ ایسا شخص نہیں ھوسکتا جو کبھی کسی وقت فرانسیسی شہری کے حق سے محروم ھوچکا ھو ،،۔ اور پہلا ھی پریسیڈنٹ لوئی نپولین بوناپارٹ وہ شخص ھے جس نے نہ صرف یہ کہ اپنی فرانسیسی شہریت کھو دی تھی ، بلکہ انگلینڈ میں اسپیشل کانسٹبل رہ چکا ھے اور سوئٹزرلینڈ کے شہری کا حق رکھ چکا ھے (۷۰)۔

کسی اور جگہ میں دسویں دسمبر کے الکشن کی اھمیت بیان کر چکا ھوں *۔ یہاں اس کو نہیں دھراؤں‌گا۔ صرف اتنا کہدینا کافی ھے کہ وہ کسان ، جنھیں فروری کے انقلاب کا بھگتان کرنا پڑا تھا ، انھوں نے الکشن کے دوران قوم کے باقی طبقوں کے خلاف اپنا جذبہ ظاھر کیا ، یعنی دیہات نے شہر سے ناراضی کا اظہار کیا۔ فوج کو یہ الکشن دل سے پسند آئے کیوں‌کہ '' نیشنل ،، کے رپبلکنوں نے نہ تو فوج کی عزت بڑھائی تھی ، نہ تنخواہ ۔ بڑی حیثیت کی بورژوازی نے لوئی بوناپارٹ کو خوشامدید کہا کیوں‌کہ وہ اسے بادشاھت کی طرف پلٹنے کا عارضی مرحلہ سمجھے ، چھوٹی حیثیت کی بورژوازی اور پرولتاریہ نے بھی اس کا استقبال کیا کہ وہ اسے کوےنیاک کے جرم کی سزا سمجھ رھے تھے ۔ آئندہ کہیں مجھ کو موقع ملےگا کہ فرانسیسی انقلاب سے کسان کے تعلق پر زیادہ نزدیک سے بحث کرسکوں ۔

۲۰ دسمبر ۱۸۴۸ ء سے آئین ساز اسمبلی کے توڑےجانے کی تاریخ مئی ۱۸۴۹ ء تک کا زمانہ بورژوائی رپبلکنوں کے زوال کی تاریخ پیش کرتا ھے ۔ بورژوازی کےلئے رپبلک قائم کرکے انھوں نے انقلابی پرولتاریہ کو میدان سے نکال‌دیا اور جمہوریت‌پسند چھوٹی بورژوازی کو تھوڑے عرصے کےلئے خاموش کردیا لیکن خود بھی بورژوازی کے بڑے ھجوم کے ھاتھوں ، جس‌نے سمجھا ھے کہ یہ رپبلک اسی کی

* مارکس کی ایک اور تصنیف ,, فرانس میں طبقاتی جدوجہد ۱۸۴۸ ء سے ۱۸۵۰ ء ،،۔ (ایڈیٹر)

جاگیر ہے ، بالکل بےدخل کردئے گئے ۔ بورژوازی کی یہ بڑی سے بڑی تعداد بہرحال تھی شاہ پرست ۔ اس کا ایک حصہ یعنی بڑے جاگیردار ''بحالی'' کے زمانے میں (دیکھئے نوٹ نمبر ۱۶) حکومت کر چکے تھے ، اس لئے وہ اب جائزوارث والے (Legitimists) تھے ۔ دوسرا حصہ یعنی مالیات پر چھائے ہوئے شرفا اور بڑے بڑے صنعت‌کار جولائی کی بادشاہت کے دنوں میں برسراقتدار رہ چکے تھے ، اس لئے اورلین‌والوں (۷۱) کے حامی ہوگئے ۔ فوج کے اعلا عہدہ‌دار ، یونی‌ورسٹی ، چرچ ، عدالت ، اکادیمی اور پریس کے بڑے لوگ دونوں فریقوں میں تھے ، کسی میں کم ، کسی میں زیادہ ۔ بورژوازی کے ان دونوں حصوں کو اس بورژوا ریپبلک میں ، جس کا نہ تو بوربوں نام تھا ، نہ اورلین ، بلکہ اس کا نام تھا کیپٹل ، ریاست کی ایسی شکل میسر آ گئی جس میں دونوں مل ملا کر حکومت کر سکتے تھے ۔ جون کی بغاوت انھیں ایک پارٹی میں تو جوڑ ہی چکی تھی ، جس کا نام تھا ''ضابطہ پارٹی'' (۷۲) ۔ اب وقت آیا کہ بورژوائی ریپبلکنوں کے اس گٹ کو بےدخل کیا جائے جو قومی اسمبلی کے اندر پوزیشن بنائے بیٹھا تھا ۔ یہ خالص ریپبلکن جسمانی طاقت کو عام لوگوں کے خلاف استعمال کرنے میں جتنے بےدرد تھے اتنے ہی وہ بزدل ، بےزبان ، کم ہمت ، بےبس اور مقابلے کے نا اہل نکلے جب انھیں پیچھے ہٹنا پڑا اور انتظامیہ طاقت اور شاہ‌پرستوں کے سامنے اپنے ریپبلکن‌ازم اور حق قانون‌سازی کا سنبھالنا مشکل ہوگیا ۔ یہاں کچھ ضروری نہیں کہ میں ان لوگوں کے بکھراؤ کی شرمناک تاریخ بیان کروں ۔ وہ ٹوٹے نہیں بلکہ صفحۂ ہستی سے مٹ گئے ۔ ان کا رول ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا ۔ اسمبلی کے اندر بھی اور باہر بھی بعد کے دنوں میں ان کا وجود صرف یادوں میں رہ گیا ، ایسی یادیں جو صرف تبھی تازہ ہوتی ہیں جب ریپبلک کا نام زبانوں پر آتا ہے اور جب بھی انقلابی تصادم پستی کی انتہا کو پہنچ جاتا ہے ۔ ضمناً یہ بھی کہتا چلوں کہ وہ اخبار — ''نیشنل'' ، جس نے پارٹی کو اپنا نام دیا تھا وہ آگے چل کر سوشلزم کا طرفدار ہو گیا ۔

اس دور کا ذکر تمام کرنے سے پہلے ہمیں پلٹ کر دو طاقتوں

پر نظر ڈالی ہے جن میں سے ایک نے دوسری طاقت کا کام ۲ دسمبر ۱۸۵۱ ء کو تمام کر دیا حالاں کہ ۲۰ دسمبر ۱۸۴۸ ء سے آئین‌ساز اسمبلی کے برخاست ہونے تک دونوں میں شادی کے تعلقات رہے تھے۔ دونوں پارٹیوں سے ہمارا مطلب ایک تو لوئی بوناپارٹ اور دوسری متحدہ شاہ‌پرستوں کی پارٹی ، جو ضابطہ پارٹی یعنی بڑی حیثیت کی بورژوازی کی پارٹی تھی۔ پریسیڈنٹ کی ذمہ‌داری سنبھالتے ہی لوئی بوناپارٹ نے فوراً ضابطہ پارٹی کی وزارت بنا ڈالی اور اس کا سربراہ مقرر کیا اودی‌لون بارو کو۔ نظر میں رکھنے کی بات ہے کہ یہ شخص پارلیمنٹری بورژوازی کے سب سے آزاد خیال گروہ کا ایک پرانا لیڈر تھا۔ مسٹر بارو کو آخر قلمدان وزارت ہاتھ آ گیا جس کی پرچھائیں ۱۸۳۰ ء سے ان کا پیچھا کر رہی تھی — بڑی بات یہ کہ ملی بھی تو وزیراعظم کی کرسی ، مگر وہ اس طرح نصیب نہ ہوئی جیسے انھوں نے لوئی فلپ کے زمانے میں آرزو کی ہوگی کہ پارلیمنٹ کے اندر حزب مخالف کے سب سے ترقی‌یافتہ لیڈر بن کر بیٹھیں بلکہ اس کے بجائے اپنے کٹر دشمنوں کے حلیف بن کر یسوعی پارٹی اور جائزوارث‌والوں (Jesuits and Legitimists) کا ساتھ دے کر ملی اور یہ ذمہ‌داری سونپی گئی کہ پارلیمنٹ کو قبر میں اتار دیں۔ وہ دلھن کو سہرے جلوے سے لے تو آئے لیکن وہ تب تک بےآبرو ہو چکی تھی۔ خود لوئی بوناپارٹ چلمن کی‌اوٹ میں تھا ، ضابطہ پارٹی نے اس کی طرف سے عمل کر دکھایا۔

وزارتی کونسل کے پہلے ہی جلسے میں قرار پایا کہ روم کو فوجی مہم بھیجی جائے اور اتفاق اس پر ہوا کہ قومی اسمبلی کے پس پشت یہ کارروائی ہو البتہ اسمبلی کے سامنے بہانہ بنا کر رقم کی منظوری حاصل کرلی جائے۔ اس طرح سے نئی وزارت نے قومی اسمبلی کو فریب دینے سے اور خفیہ سازش سے اپنا کام شروع کیا ، یہ سازش باہر کی مطلق العنان طاقتوں کے ساتھ کی گئی تھی روم کی انقلابی ریپبلک کے خلاف۔ ٹھیک اسی طرح اور اسی جوڑ توڑ سے بوناپارٹ نے دوسری دسمبروالے انقلاب حکومت کی تیاری کی ، جس کا رخ شاہ‌پرستوں کی قانون ساز اسمبلی اور ان کی آئینی ریپبلک کے خلاف تھا۔ یہ نہیں

بھولنا چاہئے کہ وہی پارٹی جس نے ۲۰ دسمبر ۱۸۴۸ء کو لوئی بوناپارٹ کی وزارت بنوائی تھی، دوسری دسمبر ۱۸۵۱ء کو قانون ساز قومی اسمبلی کے اندر اکثریت رکھتی تھی۔

اگست کے مہینے میں آئین‌ساز اسمبلی نے فیصلہ کیا کہ وہ ان ضمنی قوانین کا پورا سلسلہ تیار کرنے اور انھیں نافذ کر چکنے کے بعد ھی برخاست ہوگی جو آئین کی تکمیل یا ضمیمہ ہونے والے ھیں۔ ۶ جنوری ۱۸۴۹ء کو ضابطہ پارٹی نے اپنے ایک نمائندے راتو کی زبانی یہ تجویز رکھی کہ اسمبلی ان ضمنی قوانین کو اپنے حال پرچھوڑے اور خود اپنے برخاست ہونے کا فیصلہ منظور کر دے۔ صرف اودی‌لون بارو کی وزارت نے ھی نہیں بلکہ قومی اسمبلی کے تمام شاہ‌پرست ممبروں نے تحکمانہ لہجے میں جتایا کہ اسمبلی کا برخاست ھو جانا لازمی ھے تاکہ کریڈٹ (Credit) اپنے معمول پر آئے، ضابطے کی پابندیاں کی جائیں، عارضی انتظاموں کا جو اتھاہ سلسلہ چل رہا ھے، وہ ختم ھو، اور معاملات ایک یقینی صورت اختیار کریں۔ ان کا کہنا تھا کہ قومی اسمبلی نئی حکومت کی کارگزاری میں اڑچن بن گئی ھے اور خواہ مخواہ کی ضد سے اپنی عمر بڑھائے چلی جاتی ھے، ملک اس کے وجود سے اکتا چکا ھے۔ قانون‌ساز طاقت پر ایسے آوازے کسے گئے تو لوئی بوناپارٹ نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیا، انھیں زبانی یاد کر لیا اور ۲ دسمبر ۱۸۵۱ء کو پارلیمنٹری شاہ‌پرستوں کے سامنے ثابت کر دکھایا کہ انھی سے کچھ سیکھا ھے۔ جو نعرے وہ لگا رھے تھے، اس نے انھی کو خود ان کے خلاف موڑ دیا۔

بارو کی وزارت اور ضابطہ پارٹی اور آگے بڑھے۔ انھوں نے قومی اسمبلی کے نام فرانس کے کونے کونے سے اپیلیں کرائیں اور نرم لفظوں میں اس سے تقاضا کیا کہ وہ اپنی جگہ چھوڑ کر ھٹ جائے۔ اس ترکیب سے انھوں نے عوام کو جو منظم نہیں تھے ھموار کیا تاکہ خود قومی اسمبلی کے خلاف آگ میں کود پڑیں حالاں‌کہ یہ اسمبلی انھی عوام کی خواھش کا ایک منظم آئینی اظہار تھی۔ انھی لوگوں نے بوناپارٹ کو پارلیمنٹری اداروں کے خلاف عوام سے اپیل کرنا سکھایا تھا۔ آخر ۲۹ جنوری ۱۸۴۹ء کو وہ دن آ گیا جب آئین‌ساز اسمبلی

کو اپنے برخاست ہونے کا فیصلہ کرنا تھا۔ جس عمارت میں اس کے اجلاس ہو رہے تھے، دیکھا کہ اس پر فوج کا قبضہ ہے۔ ضابطہ پارٹی کے جنرل شنگارنیے جس کے ہاتھ میں اس روز نیشنل گارڈ اور مقامی چھاونی کی کمان تھی، پیرس میں فوج کی بڑی پریڈ کا معائنہ کر رہا تھا، گویا لام‌بندی ہو رہی ہے، ادھر متحدہ شاہ‌پرستوں نے قومی اسمبلی کو دھمکی دی کہ اگر وہ سیدھی طرح نہیں مانتی تو پھر طاقت سے کام لیا جائےگا۔ وہ راضی ہو گئی، البتہ یہ ہے کہ تھوڑی سی اپنی عمر بڑھالینے کا مول بھاؤ کر لیا۔ ۲۹ جنوری ۱۸۴۹ء کی یہ تاریخ تھی ھی کیا، سوائے اس کے کہ دوسری دسمبر ۱۸۵۱ء کا coup d'état (انقلاب‌حکومت)، جسے شاہ‌پرستوں نے لوئی بوناپارٹ سے مل کر رپبلکن قومی اسمبلی کے خلاف برپا کیا تھا؟ شاہ‌پرست حضرات نے یا تو دیکھا نہیں یا دیکھنا ھی نہیں چاہا کہ بوناپارٹ نے ۲۹ جنوری ۱۸۴۹ء کے واقعات کا فائدہ اٹھایا تاکہ فوج کا ایک حصہ اس کی نظروں کے سامنے پریڈ کرتا ہوا تویلری محل سے گزارا جائے اور پارلیمنٹ کی طاقت کے مقابل فوجی طاقت کے اس پہلے مظاہرے کو بڑی بےصبری سے گرہ باندھ لیا تاکہ رومن بادشاہ کلی‌گولا (۷۳) کی مثال تازہ کر دے لیکن شاہ‌پرست حضرات تو صرف اپنے جنرل شنگارنیے کو تک رہے تھے۔

ضابطہ پارٹی کو آئین‌ساز اسمبلی کی عمر کا رشتہ قطع کرنے کی جلدی اس لئے پڑی تھی کہ اسے آئین کے ضمیمے کے طور پر ضمنی قوانین سے غرض تھی، مثلاً تعلیم کے بارے میں، مذہب یا عقیدے کے بارے میں، وغیرہ۔ متحدہ شاہ‌پرست اس بات کو نہایت اہم سمجھتے تھے کہ یہ قانون خود انھی کے ہاتھوں بنیں، ان کے بنانے میں رپبلکنوں کا ہاتھ نہ ہو جنھیں کسی کا عتبار نہیں۔ انھی قانونوں میں ایک ایسا بھی تھا جس کے ذریعہ رپبلک کے پریسیڈنٹ کی ذمہ‌داریاں واضح کی گئی تھیں۔ ۱۸۵۱ء میں قانون‌ساز اسمبلی اسی قسم کے قانون کا مسودہ تیار کرنے میں لگی تھی کہ لوئی بوناپارٹ نے اس قطعی فیصلے کے ہونے سے پہلے ھی دوسری دسمبر کو تختہ الٹ دیا۔ متحدہ شاہ‌پرست ۱۸۵۱ء میں پارلیمنٹ کی اپنی سرمائی مہم کے وقت

کیا کچھ دینے کو تیار نہ تھے، صرف اتنے کے لئے کہ پریسیڈنٹ کی ذمہ‌داریوں کے بارے میں قانون بن کر تیار ہو جائے، اور وہ قانون انھی ریپبلکنوں کی اسمبلی کے ھاتھوں بنے جنھیں کسی کا اعتبار نہیں اور شاہ‌پرستوں سے عداوت رکھتے ھیں۔

۲۹ جنوری ۱۸۴۹ ء کو جیسے ھی آئین‌ساز اسمبلی نے اپنا آخری ھتھیار توڑا، مسٹر بارو کی وزارت اور قاعدہ قانون کے حامیوں نے اسے موت کے گھاٹ اتارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، اسے نیچا دکھانے کی ھر ممکن تدبیر کی اور مجبورولاچار اسمبلی کے ھاتھ سے وہ قانون بھی زبردستی بنوالئے جن کے کارن پبلک میں اس کی رھی سہی عزت بھی مٹ جائے۔ اور بوناپارٹ جو اپنے خاص نپولینی خیالات میں غرق تھا، بےشرمی سے اس پر اتر آیا کہ پارلیمنٹری طاقت کی اس رسوائی سے اپنا کام نکالے۔ چناں‌چہ ۸ مئی ۱۸۴۹ ء کو قومی اسمبلی نے تو وزارت پر سنسر کا ووٹ (تہدیدی اظہار) پاس کیا کہ جنرل اودینو نے چیوی‌تا وےکی کے مقام پر کس کی اجازت سے قبضہ کیا، اور حکم جاری کیا کہ روم سے فوجی مہم واپس بلا کر اسی مقررہ مطلب (۴۷) تک محدود رکھی جائے، لیکن بوناپارٹ نے اسی شام کو اخبار «Moniteur» (۵۷) میں اپنا وہ خط چھپوا دیا جس میں جنرل اودینو کو شاندار کارناموں کی مبارکباد دی گئی تھی۔ پارلیمنٹ‌والے تو بیٹھے کاغذی کارروائی ھی کرتے رھے، اور بوناپارٹ اتنے میں فوج کا عالی ظرف سرپرست بن بیٹھا۔ شاہ‌پرست اس پر بغلیں بجا رھے تھے۔ انھیں یقین تھا کہ وہ اس کو بےوقوف بنالیں گے۔ آخر جب مراست نے، آئین ساز اسمبلی کے صدر کی حیثیت سے لمحہ بھر کےلئے قومی اسمبلی کی سلامتی خطرے میں پڑتے دیکھی اور آئین کی قانونی اجازت سے، ایک کرنل کو اس کی رجمنٹ سمیت طلب کر لیا تو کرنل نے حکم کی تعمیل سے انکار کر دیا اور اپنی صفائی میں ڈسپلن کا حوالہ دے کر کہا کہ جنرل شنگارنیے سے رجوع کرنا چاھئے اور اس جنرل نے بھی مراست کی مرضی ٹھکرا دی اس طنزیہ جملے کے ساتھ کہ اسے عقل لڑانےوالی سنگینیں (baïonnettes intelligentes) پسند نہیں ھیں۔ نومبر ۱۸۵۱ ء میں متحدہ شاہ‌پرستوں نے بوناپارٹ سے فیصلہ کن

ٹکر لینے کے ارادے سے اپنے بدنام زمانہ مسودہ قانون «Questor's Bill» (۷۶) کے ذریعے یہ اصول پاس کرانا چاہا کہ قومی اسمبلی کے صدر کو براہ‌راست فوج طلب کرنے کا اختیار ہونا چاہئے۔ ان کے ایک جنرل لےفلو نے مسودہ قانون پر دستخط بھی کر دئے۔ جنرل شنگارنیے کا ووٹ بھی اس کے حق میں پڑ گیا، تیئر نے بھی پچھلی آئین‌ساز اسمبلی کی دوراندیشی کی خوب داد دے ڈالی — لیکن سب فضول۔ وزیر جنگ سین آرنو نے اسے وہی جواب دیا جو خود شنگارنیے مراست کو دے چکا تھا اور یہ جواب ''مونٹین،، والوں کی تالیوں کے شور میں دب گیا۔

اس صورت سے ضابطہ پارٹی نے، جب وہ قومی اسمبلی بھی نہیں تھی، صرف وزارت ھی سنبھالے تھی، پارلیمنٹری طرز حکومت کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگا دیا۔ پھر جب دوسری دسمبر ۱۸۵۱ء نے اس طرز حکومت کو فرانس سے جلاوطن کر دیا تو یہی پارٹی ہائے واویلا بھی کرتی ہے۔

اچھا، اب ہماری طرف سے پارلیمنٹری طرز حکومت کو سفر مبارک ہو!

۳

۲۸ مئی ۱۸۴۹ء کو قانون‌ساز قومی اسمبلی نے اپنا اجلاس شروع کیا، دوسری دسمبر ۱۸۵۱ء کو وہ برخاست کر دی گئی۔ یہ دور ہے جس میں آئینی یا پارلیمنٹری ریپبلک کا وجود رہا۔

پہلے فرانسیسی انقلاب کے وقت آئین‌پسندوں کی حکومت کے فوراً بعد ''ژیروندیستوں،، کا اقتدار قائم ہوا اور ان کے فوراً بعد جیکوبی گروہ نے باگ‌دوڑ سنبھالی (۷۷)۔ ان میں سے ہر ایک پارٹی کو اپنے سے زیادہ ترقی‌پسند پارٹی کی پشت‌پناہی حاصل رہی۔ جیسے ھی ایک پارٹی انقلاب کو اتنی آگے تک لےآتی کہ اس کا ساتھ نہ دے سکے یا اسے اور آگے نہ لے جاسکے، تو پشت پر کھڑی ہوئی زیادہ دلیر حلیف پارٹی اسے ایک طرف ہٹا کر خود آگے نکل آتی اور پھر اسے قتل‌گاہ کے حوالے کر دیتی۔ اس طرح سے انقلاب منزل بہ منزل اوپر چڑھتا رہا۔

۱۸۴۸ ء کے انقلاب میں اس کے برعکس ہوا ہے۔ یہاں پرولتاری پارٹی چھوٹی حیثیت کی بورژوا ڈیموکریٹک پارٹی کی دم‌چھلا نظر آتی ہے اور وہ اس پرولتاری پارٹی سے دغا کرتی ہے، اسے الگ کر دیتی ہے۔ پہلے یہ واقعہ ۱۶ اپریل (۴۸) کو ہوا، پھر ۱۵ مئی کو اور پھر جون کے دنوں میں۔ اور خود ڈیموکریٹک پارٹی بورژوا ریپبلکن پارٹی کے کاندھے کا سہارا لیتی ہے۔ بورژوا ریپبلکنوں کی حالت یہ کہ جہاں انھیں اپنی پوزیشن مضبوط ہونے کا اعتبار ہوا، انھوں نے اپنے کاندھے سے بلائے جان ساتھی کا بازو ہٹایا اور خود ضابطہ پارٹی کے بازو کا سہارا لے لیا۔ ضابطہ پارٹی کاندھے جھٹکتی ہے، بورژوا ریپبلکنوں سے دامن چھڑاتی ہے اور جھپٹتی ہے کہ مسلح فوج کے کاندھے پر سوار ہوجائے۔ اسے اپنی جگہ یہی گمان ہے کہ فوج کے کاندھے پر جمی بیٹھی ہے کہ اتنے میں آنکھ کھلی تو پتہ چلا کہ کاندھوں کی جگہ سنگینیں نکل آئیں۔ ہر ایک پارٹی اپنے پیچھے لگی ہوئی پارٹی کو لات مارتی ہے اور راستہ نکالنے کے لئے اگلی پارٹی کو دھکیلتی ہے، لیکن آگے والی اسے پیچھے دھکیل دیتی ہے۔ مسخرے پن کی اس دھکا پیل میں، وہ پارٹی خود کو سنبھال نہیں پاتی، گرتی ہے اور گرتے میں منھ بنانا بھی لازمی ہے اور عجیب طرح ہاتھ پاؤں چلانا بھی۔ اس صورت میں انقلاب نیچے اترتا چلا جاتا ہے۔ فروری میں جب سڑکوں سے آخری روک (بیری کیڈ) ہٹائی گئی اور پہلا انقلابی اقتدار قائم ہوا، اس سے پہلے ہی انقلاب الٹے پاؤں سیڑھیاں اتر رہا تھا۔

یہ دور جس سے ہم فی‌الحال بحث کر رہے ہیں، ایک عجیب قسم کا مجموعۂ اضداد دور ہے کہ ایک دوسرے کی کاٹ یہاں جمع ہو گئی ہے: ایسے آئین‌پسند ہیں جو کھلے خزانے آئین کے خلاف سازشیں کر رہے ہیں، ایسے انقلابی ہیں جنھیں آئینی کارروائی کے حمایتی ہونے کا اقرار ہے، قومی اسمبلی ہے جو چاہتی ہے کہ سب طاقت اسی کے ہاتھ میں رہے اور پارلیمنٹری حیثیت سے ہمیشہ چلتی رہے؛ ''سونٹین'' گروہ ہے جو سمجھتا ہے کہ اس کا کام ہے صبر شکر کرنا، اور اپنی آج کی شکستوں کو ان پیش گوئیوں سے ٹال جاتا ہے

که فتوحات کا وقت آنےوالا ہے۔ شاہ‌پرست ہیں جو رپبلک کی patres conscripti (سنیٹ کے ممبروں) کا رول ادا کرتے ہیں اور حالات سے مجبور ہیں کہ باہمی نفاق کے شکار شاہی خاندانوں کو، جن سے انہیں نسبت ہے، ملک سے باہر رکھیں اور رپبلک کو، جس سے انہیں نفرت ہے، فرانس میں رہنے دیں۔ انتظامیہ طاقت ہے جو کمزوری میں اپنی طاقت اور کمائی ہوئی نفرت‌وحقارت میں اپنی شان سمجھتی ہے۔ رپبلک ہے جو دو بادشاہیوں کے تاریک پہلوؤں کے جوڑ کے سوا کچھ نہیں، ایک تو ' بحالی، اور دوسرے، جولائی کے دنوں کی بادشاہت جن پر سلطنت کا لیبل لگا ہوا ہے۔ ایسے اتحاد ہیں جن کی تہہ میں اختلاف کا بھراؤ ہے۔ ایک جد و جہد ہے جس کا اصل اصول یہ ہے کہ معرکے کو انجام تک نہ پہنچایا جائے۔ بہنگم اور بےمعنی ایجی‌ٹیشن ہے جو امن‌وامان کے نام پر کیا جا رہا ہے۔ بڑی دھوم دھام سے امن‌واماں کی تبلیغ کی جا رہی ہے اور وہ بھی انقلاب کے نام پر۔ جوش بہت ہے لیکن اصلیت نا پید۔ اصلیت ہے مگر اس میں جوش کا پتہ نہیں۔ ہیرو ہیں جن کے کارنامے نہیں؛ تاریخ ہے جس میں بڑے واقعے نہیں؛ واقعات کی رفتار ہے جسے اگر کوئی طاقت حرکت میں رکھنےوالی ہے تو وہ بظاہر کیلنڈر، پھر وہ بھی باربار ایک ہی حالت کو یکسانی سے دھرائے جاتی ہے — وہی ہر بار تناتنی، وہی ڈھیل۔ ایک دوسرے کی ضدیں ہیں جو باربار انتہا کو پہنچنے لگتی ہیں، گویا ان کے زور پکڑنے کی غرض ہی یہ ہے کہ دھارکند ہو جائے اور پھر کچھ نہ ہو، کبھی معاملات سلجھنے نہ پائیں۔ بڑے دعووں کے ساتھ، طاقت کے، زورزبردستی کے اور کم ظرفانہ دہشت کے دکھاوے کئے جاتے ہیں کہ گویا قیامت ٹوٹ پڑےگی لیکن اتنے میں دنیا کو تباہی سے بچالینے والے نہایت گھٹیا جوڑ توڑ میں اور شاہی محل کے اندر کی ایسی دل لگی میں لگ جاتے ہیں جس کی بےفکری اور بےنیازی دیکھ کر ہنگامۂ‌قیامت کے بجائے فروندے کی تحریک (۷۹) یاد آ جاتی ہے۔ پورے فرانس کی باضابطہ مجموعی ذہانت ایک فرد واحد کی چال‌بازانہ بےعقلی کے ہاتھوں صفر ہوکر رہ جاتی ہے۔ پوری قوم کی مجموعی

قوت‌ارادی جب اپنے مناسب اظہار کے لئے خود کو عام‌رائے‌دھندگی میں ظاہر کرتی ہے تو عوام کے مفاد کے جانی دشمنوں کے سر جادو چڑھ کر بولتا ہے، لیکن وہی بالآخر ایک شعبدہ باز کی مرضی بن کر رہ جاتی ہے۔ اگر تاریخ کا کوئی صفحہ کبھی مٹیالی روشنائی سے لکھا گیا ہے تو بس وہ یہی ہے۔ لوگ اور واقعات سبھی اندر کو دھنسے ہوئے نقش معلوم ہوتے ہیں، بے جسم کے سائے نظر آتے ہیں۔ انقلاب نے انھی کو اپاھج کر دیا ہے جو اسے اٹھائے ہوئے چلے تھے، اور جوش اور حوصلے کی طاقت صرف اپنے دشمنوں میں بھر دی ہے۔ اگر وہ ''سرخ آسیب،، جسے انقلاب کے دشمن بدروح کی طرح ہمیشہ منڈلاتا ہوا دیکھا کرتے تھے اور اس پر لاحول پڑھا کرتے تھے، کہیں منظر عام پر ابھرا بھی تو دیکھا کہ اس کے سر پر نراج کی فریگین ٹوپی (۸۰) نہیں تھی بلکہ ضابطے کی وردی تھی، اس نے لال برجس ڈانٹ رکھی تھی۔

ہم نے دیکھ لیا کہ بوناپارٹ نے ۲۰ دسمبر ۱۸۴۸ء کو جو اپنے سر اٹھائے کے دن وزارت مقرر کی وہ ضابطہ پارٹی کی وزارت تھی، جائزوارث‌والوں (Legitimists) اور اورلین‌والوں (Orleanists) کی ملی جلی وزارت تھی۔ بارو — فالو کی اس وزارت نے کم‌وبیش طاقت کے زور سے ریپبلکنوں کی آئین ساز اسمبلی کی عمر کوتاہ کی، خود اس سے زیادہ عمر پائی اور اسمبلی کے خاتمے کے بعد بھی اختیارات سنبھالے رہی۔ شنگارنیے، متحدہ شاہ پرستوں کا جنرل تب بھی اپنے ہاتھ میں پہلی آرمی ڈویژن اور پیرس کے نیشنل گارڈ دونوں کی اعلا کمان تھامے رہا۔ آخر عام الکشن ہوئے اور ضابطہ پارٹی بھاری اکثریت سے قانون‌ساز قومی اسمبلی میں آپہنچی۔ یہاں پہنچ کر لوئی فلپ کے زمانے کے ممبروں اور اعلا خطاب یافتہ لوگوں کا اس جائزوارث (Legitimist) گروہ کے مقدس دستے سے سامنا ہوا جس کے حق میں قوم کے ووٹوں کی بےشمار پرچیاں سیاسی اکھاڑے میں اترنے کا پاس بن گئی تھیں۔ لوگوں کے وہ نمائندے جو بوناپارٹ کے حامی تھے اتنی کم تعداد میں چن کر آئے کہ ایک آزاد پارلیمنٹری پارٹی نہیں بنا سکتے تھے۔ وہ ضابطہ پارٹی کے mauvaise queue

(گلے میں پڑا ہوا ڈھول) معلوم ہوتے تھے۔ اس صورت میں ضابطہ پارٹی سرکاری اختیارات بھی سنبھال کر بیٹھ گئی، فوج بھی اور قانون ساز ادارے بھی، مختصر یہ کہ پورے سرکاری اختیارات پر اسی کا قبضہ ہوگیا۔ عام انتخابات نے اسے اخلاقی طور سے مضبوط کر دیا تھا، جن کی بدولت حکومت گویا عوام کی مرضی کی تعمیل بن گئی — اور عین اسی زمانے میں سارے براعظم یورپ پر انقلاب کے مخالفین حاوی ہو گئے۔

پہلے کبھی ایسا نہ ہوا تھا کہ کسی پارٹی نے اپنی سہم کا آغاز اس سے زیادہ طاقتور ذرائع کے ساتھ اور اس سے زیادہ مبارک شگون کے ساتھ کیا ہو۔

ہلاکت کے غار میں پھنسے ہوئے خالص ریپبلکنوں نے دیکھا کہ قانون‌ساز قومی اسمبلی میں وہ پچاس ممبروں کا چھوٹا سا گٹھ ہوکر رہ گئے جن کے سربراہ افریقی جنرل کوے‌نیاک، لموری‌سیئر اور بیدو ہیں۔ تاہم ایک بڑی حزب مخالف (اپوزیشن) "مونٹین" بن کر تیار ہوئی — اس پارلیمنٹری نام کے ساتھ سوشل ڈیموکریٹوں کی پارٹی نے اپنی نام رکھائی کی رسم ادا کی۔ قومی اسمبلی کے ساڑھے سات سو ممبروں میں اس پارٹی کے دو سو سے زیادہ آدمی تھے۔ اور ان کی طاقت کم از کم اتنی ضرور ہو جاتی تھی جتنی ضابطہ پارٹی کی تینوں ٹکڑیوں میں سے کسی ایک کی ہو سکتی تھی۔ شاہ‌پرستوں کی ملی جلی طاقت کے سامنے "مونٹین" پارٹی میں جو تعداد کی کمی کا نقص تھا وہ بھی ظاہرا بعض دوسرے حالات کی بدولت دور ہو جاتا تھا۔ ڈپارٹمنٹوں کے انتخابات سے تو خیر یہ ثابت ہوا کہ دیہاتی ووٹروں میں اس نے اپنے حامیوں کی تعداد کافی بڑھائی ہے، پیرس سے جتنے نمائندے چن کر آئے ان میں بھی قریب قریب سب اسی پارٹی کے تھے۔ فوج نے بھی انتخاب کے ذریعے اپنے جمہوری عقیدے کا اقرار کر لیا تھا کیوں کہ تین "بے کمیشن افسر" چنے گئے اور "مونٹین" پارٹی کے لیڈر لیدرو رولیں کو، ضابطہ پارٹی کے تمام نمائندوں سے ہٹ کر، پانچ ڈپارٹمنٹوں کی طرف سے، جنھوں نے

اپنے ووٹ اس کے حق میں ملا لئے تھے، پارلیمنٹ کی مستقل ممبری کی عزت پیش کردی گئی۔ شاہ‌پرستوں کے آپس میں تو ناچاقی اور ٹکراؤ ہونا ہی تھا، اس کے علاوہ ضابطہ پارٹی اور بوناپارٹ‌والوں کی بھی ٹکر ضرور ہوتی، ایسی حالت میں ۲۸ مئی ۱۸۴۹ء کے دن نظر آتا تھا کہ ''مونٹین،، پارٹی کو میدان مار لینے کے سارے موقعے ہاتھ آ گئے ہیں۔ ابھی دو ہفتے گزرے تھے کہ یہ سارے موقعے بھی نکل گئے اور عزت آبرو بھی گئی۔

پارلیمنٹری تاریخ پر آگے بحث کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ چند نکتے واضح کردئے جائیں تاکہ ہمارے سامنے جو دور ہے اس کے کردار کے متعلق عام غلط‌فہمی پھیلنے کا اندیشہ نہ رہے۔ ڈیموکریٹوں کی نظر سے دیکھا جائے تو قانون‌ساز قومی اسمبلی کے زمانے میں بھی وہی کام پیش نظر تھا جو آئین ساز اسمبلی کے زمانے میں رہ چکا تھا، یعنی ریپبلکنوں اور شاہ پرستوں کے درمیان عام سی کش‌مکش۔ وہ خود اس تحریک کو ایک لفظ میں سمو دیتے ہیں، لفظ ہے ''ری‌ایکشن،،— مطلب ایسی رات جب ساری بلیاں بھوری نظر آتی ہیں اور رات کے چوکیدار کی طرح ڈیموکریٹوں کو بے‌روک ٹوک سب طرح کی آوازیں نکالنے کا موقع ہوتا ہے۔ واقعی پہلی نظر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ضابطہ پارٹی مختلف قسم کے شاہ‌پرست گٹوں کی ایک معجون مرکب ہے، جو نہ صرف ایک دوسرے کے خلاف جوڑ توڑ میں لگے رہتے ہیں تاکہ خاص اپنے مہرے کو بساط پر جمادیں اور حریف کی گوٹ ایک طرف سرکا دیں، بلکہ ان سب کو ایک ساتھ جوڑنے کی وجہ بھی مشترک ہے، وجہ ہے ''ریپبلک،، سے نفرت اور اس کے خلاف جدوجہد۔ ان شاہ‌پرست گٹ‌بندوں اور ساز شیوں کے برخلاف ''مونٹین،، پارٹی ہر پہلو سے ایسی نظر آتی ہے کہ ''ریپبلک،، کی حفاظت کےلئے کھڑی ہے۔ ضابطہ پارٹی ہمیشہ ''ری‌ایکشن،، کی حرکتوں میں لگی ہوئی معلوم ہوتی ہے جس کا رخ پریس کے خلاف، انجمنوں وغیرہ کے خلاف لفظ بلفظ وہی ہے جو پروشیا میں تھا اور پروشیا ہی کی طرح یہ عمل محض اندھی طاقت کے زور سے کئے جا رہے ہیں۔ سرکاری کل پرزے، پولیس کی

طاقت ، سیاسی پولیس (ژندارمی) اور عدالتوں کے زور سے پریس اور انجمنوں کو دبا رہے ہیں۔ ”مونٹین“ پارٹی اپنی طرف سے مستقل اس کوشش میں لگی رہی کہ ”انسان کے ابدی حقوق“ پر جو حملے ہوتے ہیں ان کا توڑ کرے اور اتنی ہی کوشش کی جتنی پچھلے ڈیڑھ سو سال کے دوران عوامی پارٹی کہلائی جانےوالی کسی بھی جماعت نے کم‌وبیش کی ہوگی۔ تاہم اگر صورت حال اور پارٹیوں کے عمل کو اندر تک چھانا جائے تو ظاہر کا وہ پردہ اٹھ جاتا ہے جس میں طبقاتی کش‌مکش چھپی ہوئی ہے اور اس دور کا عجیب رنگ روپ غائب ہو جاتا ہے۔

جیسا کہ کہا جا چکا ہے جائزوارث والے اور اورلین‌والے ضابطہ پارٹی کے دو جداگانہ گروہ ہیں۔ وہ کیا چیز تھی جو دونوں گروہوں کو اپنے اپنے دعووں سے باندھے ہوئے تھی اور ایک کو دوسرے سے الگ کئے ہوئے تھی؟ کیا وہ صرف نیلوفر (۸۱) اور ترنگے جھنڈے کے نشان تھے؟ اورلین کا گھرانا اور بوربوں کا گھرانا جو شاہ‌پرستی کے دو رنگ تھے ، کیا وہ عموماً شاہ‌پرستی کے عقیدے کی ہی تبلیغ کرتے تھے؟ بوربوں کے تحت بڑے جاگیرداروں نے اپنے پادریوں اور جی حضوریوں کو لے کر حکومت کی تھی۔ اورلین کے تحت اوپر کے سیٹھوں ساھوکاروں ، بڑے پیمانے کی صنعت ،تجارت ، یعنی سرمائے کی حکومت رہی تھی اور اس کے حاضر باش وکیل ، پروفیسر اور چرب زبان مقرر تھے۔ جائزوارث‌والی بادشاہت محض ایک سیاسی اظہار تھا زمین کے مالکوں کے موروثی اختیار کا۔ جولائی ۱۸۳۰ء میں جو بادشاہت قائم ہوئی وہ سیاسی اظہار تھی نودولتیے بورژوائیوں کی غاصبانہ حکومت کا۔ دونوں گروہوں کو الگ رکھنےوالا سوال کچھ اصول نہیں بلکہ ان کی زندگی کے مادی حالات تھے ، دونوں کی ملکیت الگ قسم کی تھی ، یہ وہی پرانا ٹکراؤ تھا شہر اور دیہات کا ، وہی رقابت تھی سرمائے اور جاگیر کی۔ کون ہے جو انکار کر سکے کہ اختلاف کے اصل سبب کے ساتھ پھر پرانی یادیں ، ذاتی عداوتیں ، خوف اور امیدیں ، تعصبات اور خوش‌فہمیاں ، ہمدردیاں اور بیزاریاں ، پکی رائیں اور عقیدے یا ایمان اور اصول بھی ان کو

دونوں میں سے کسی ایک شاہی خاندان سے وابستہ کئے ہوئے تھے۔ ملکیت یا جائداد کی الگ قسموں، زندگی کی سماجی حالتوں کی بنیاد پر ایک پوری عمارت کھڑی ہوتی ہے، ایک دوسرے سے مختلف اور اپنی اپنی وضع کے جذبات، خوش‌فہمیاں، سوچ کے ڈھنگ، اور زندگی کے بارے میں خیالات یہ اوپر کی عمارت ہیں۔ ایک پورا طبقہ اپنی زندگی کی مادی بنیادوں پر، باہمی سماجی تعلقات کے مطابق اس عمارت کو اٹھاتا ہے، اسے شکل صورت دیتا ہے۔ فرد واحد جو اوپر اپنے بزرگوں سے اور اپنی اٹھان سے ان تمام خیالات‌وعادات کو حاصل کرتا ہے، وہ ممکن ہے یہی سمجھتا ہو کہ اس کے عمل کی اصل تحریک اور شروعات انھی سے ہوتی ہے۔ اورلین‌والے اپنی جگہ اور جائزوارث‌والے اپنی جگہ، خود کو اور دوسروں کو یہ یقین دلانے کی کوشش کر رہے تھے کہ دو علاحدہ شاہی خاندانوں کی وفاداری نے انھیں الگ کر رکھا ہے لیکن بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ ان گروہوں کے مفادوں نے ایک دوسرے سے کٹ کر دونوں شاہی خاندانوں کو متحد ہونے سے روک رکھا تھا۔ جس طرح زندگی میں یہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنے بارے میں جو سوچے اور دعوے کرے وہ ایک طرف اور اس کی اصلیت یا عمل دوسری طرف دونوں میں فرق کیا جاتا ہے، اسی طرح تاریخی معرکوں میں ہمیں اور زیادہ فرق کرنا چاہئے اور دیکھنا چاہئے کہ پارٹیاں اپنے متعلق جو لفظی دعوے کرتی ہیں، جو ڈون کی لیتی ہیں اس کو ان کی اندرونی ساخت سے، ان کے اصل مفاد سے کیا نسبت ہے، جو رائے وہ اپنے بارے میں رکھتی ہیں اس کو حقیقت سے کیا علاقہ ہے۔ اورلین‌والے اور جائزوارث‌والے ایک سے دعووں کے ساتھ ریپبلک میں پہلو بہ پہلو جمے ہوتے تھے۔ اگر ان میں سے ہر ایک فریق خود اپنی طرف کے شاہی خاندان کو بحال کرنے اور دوسرے کو جھٹلانے کے درپے تھا تو اس کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ بورژوازی جن دو بڑے گروہوں میں بٹی ہوئی تھی — زمین جائداد اور سرمایہ، ان دونوں میں سے ہرایک اس فکر میں تھا کہ خود ان کا فریق زبردست رہے اور دوسرا زیردست۔ ہم نے بورژوازی کے دو بڑے گروہوں

کا ذکر کیا ، کیونکہ ان میں وہ جو بڑی جاگیروں کا مالک تھا ، جاگیردارانہ چونچلوں اور نسلی غرور کے باوجود موجودہ سوسائٹی کی تبدیلیوں نے اس کو سر سے پاؤں تک بورژوائی بنا دیا تھا ۔ بالکل یہی حال انگلینڈ کے ٹوریوں (۸۲) کا ہوا کہ ایک زمانے تک وہ اسی گمان میں مبتلا رہے کہ انھیں بادشاہت ، کلیسا اور پرانے انگریزی آئین کی خوبیوں کا جوش اٹھتا ہے ، یہاں تک کہ جب کانٹے کا وقت آ کر پڑا تو انھوں نے خود اقرار کر لیا کہ اگر کسی بات کا زیادہ جوش ہے تو بس ، لگان یا زمینی کرائے کا ۔

متحدہ شاہ‌پرستوں نے پارلیمنٹ کے باہر ، اخبارات میں ، ایمس اور کلیرمونت میں (۸۳) ایک دوسرے کے خلاف جوڑتوڑ کا بازار گرم کر رکھا تھا ۔ منظر عام سے ہٹ کر یہ دونوں گروہ اپنی اورلین اور جائزوارث والی پرانے وقتوں کی پوشاک سجتے اور اسی زمانے کا ٹورنامنٹ تازہ کیا کرتے ۔ لیکن جب منظر عام پر جلوہ گر ہوتے اور بڑی پارلیمنٹری پارٹی کی شان دکھانے پر آتے تو اپنے اپنے شاہی خاندانوں کو تعظیم کے ساتھ ایک طرف رکھ دیتے اور بادشاہت کی بحالی کا سوال in infinitum (کھٹائی میں) ڈال دیتے تھے ۔ جو کام اصل میں انھیں کرنے تھے وہ ضابطہ پارٹی کی حیثیت سے کیا کرتے تھے — یعنی سیاسی نہیں ، سماجی جھنڈے تلے ۔ وہ بورژوائی عالمی نظام کے نمائندوں کی حیثیت سے اپنا کام کرتے تھے ، نہ کہ ہوائی دیدہ شہزادیوں کے کارندوں کی طرح ، ریپبلکنوں کے خلاف شاہ‌پرستوں کی طرح نہیں بلکہ اور طبقوں کے خلاف ایک بورژوائی طبقے کی حیثیت سے مصروف تھے ۔ ضابطہ پارٹی کی حیثیت میں انھیں سماج کے دوسرے طبقوں پر کہیں زیادہ بےلگام اور کڑی حکمرانی کی چھوٹ مل گئی تھی ، اس سے پہلے ”بحالی“ کے دنوں یا جولائی کی بادشاہت کے زمانے میں اتنی کھلی چھوٹ نہیں ملی تھی ۔ یہ غلبہ انھیں صرف پارلیمنٹری ریپبلک میں ہی نصیب ہو سکتا تھا کیوں کہ ایک یہی صورت ہے جس میں فرانسیسی بورژوازی کے دو بڑے ٹولے مل کر کام کر سکتے تھے اور اپنی صرف ایک ٹکڑی کے چلتے ہوئے سکے کی جگہ پورے طبقے کی حکومت کا سکہ چلا سکتے تھے ۔ پھر بھی اگر

انھوں نے ضابطہ پارٹی کی حیثیت سے ریپبلک کو نظروں سے گرایا اور اس کے وجود پر اپنی ناگواری کو نہیں چھپایا تو اس سے ان کی محض شاہ‌پرستانہ ذہنیت ہی ظاہر نہیں ہوتی۔ دل نے گواہی دے دی تھی کہ ریپبلک اگرچہ ان کے سیاسی غلبے کے سر سہرا باندھ رہی ہے، تاہم سماجی بنیاد کو اندر سے کھوکھلا بھی کرتی ہے کیوں کہ اب انھیں دبے ہوئے طبقوں کا برابر سے سامنا کرنا ہے اور خود ہی نمٹنا ہے، تاج‌وتخت کے پردے کی گنجائش نہیں رہی اور نہ اب ثانوی حیثیت کی باہمی کش‌مکش اور شاہی اختیارات سے زورآزمائی کی اوٹ میں قوم کی توجہ بٹائی جا سکتی ہے۔ کمزوری کے احساس نے انھیں اس بات پر مجبور کیا کہ تنہا اپنے طبقے کی مکمل حکمرانی سے باز آئیں اور وہی پہلے کی فرماں‌روائی‌والی صورت اختیار کریں جو اگرچہ ناسکمل ہوگی، اتنی ترقی‌یافتہ بھی نہ ہوگی، تاہم اسی صفت کی بدولت اس طرزحکومت میں عافیت زیادہ رہےگی۔ پلٹ کر دیکھئے تو ہر بار، جب بھی متحدہ شاہ‌پرستوں کو اپنے مدمقابل سے، کینہ‌ور حریف، بوناپارٹ سے ٹکر لینی پڑتی ہے، ہر بار جب وہ انتظامیہ اختیارات کی طرف سے اپنے پارلیمنٹری طمطراق پر آنچ آتے دیکھتے ہیں، ہر بار جب آخرکار انھیں اپنی حاکمانہ حیثیت کی سیاسی سند پیش کرنی پڑتی ہے تو وہ شاہ‌پرست کی نہیں، ریپبلکن کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں، اورلین‌والے تیئر سے لےکر، جو قومی اسمبلی پر یہ رعب جماتے ہیں کہ ریپبلک کے سوال پر ان کے درمیان کوئی خاص اختلاف نہیں پایا جاتا، جائزوارث پارٹی کے بیرئے تک، جس نے دوسری دسمبر ۱۸۵۱ء کو ترنگا مفلر لپیٹ کر نقیب کی طرح ڈنکے کی چوٹ ان لوگوں کے سامنے جو دسویں حلقے کے ٹاؤن ہال پر جمع ہوئے تھے، ریپبلک کی طرف سے خطاب کیا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ تقریر کر رہا تھا اور لوگ "ہنری پنجم! ہنری پنجم!" پکار کر مذاق اڑا رہے تھے۔

بورژوازی کی مخلوط پارٹی کے مقابل چھوٹی حیثیت کی بورژوازی اور مزدوروں کی مخلوط صف آرائی ہوئی جس کا نام تھا سوشل ڈیموکریٹک پارٹی۔ ۱۸۴۸ء میں جون کے دنوں کے بعد چھوٹی بورژوازی نے دیکھا

که وہ پیچھے رہ گئی اور اس کے مادی مفاد کو چوٹ پہنچی، وہ جمہوری ضمانتیں جن سے یہ امکان ہوتا تھا کہ چھوٹی بورژوازی کے مفاد بچے رہیں گے، اب انقلاب کی مخالف طاقتیں ان پر بھی انگلی اٹھا رہی ہیں۔ لہازا وہ مزدوروں سے نزدیک آ گئی۔ دوسری طرف پارلیمنٹ میں جو لوگ اس کی نمائندگی کے لئے کھڑے تھے، ''مونٹین'' والے، جنھیں بورژوا ریپبلکنوں کی ڈکٹیٹری کے زمانے میں پیچھے ہٹا دیا گیا تھا، اب آئین‌ساز اسمبلی کی بقیہ آدھی زندگی میں انھوں نے بوناپارٹ سے اور شاہ‌پرست وزیروں سے مقابلے کرکے اپنی کھوئی ہوئی مقبولیت پھر حاصل کر لی تھی۔ ''مونٹین'' نے اشتراکی لیڈروں سے ہاتھ ملا لئے۔ فروری ۱۸۴۹ء میں اس صلح صفائی پر جی کھول کر دعوتیں کی گئیں۔ مشترکہ پروگرام طے ہوا، مشترکہ الکشن کمیٹیاں بنائی گئیں اور مل کر انتخابی امیدوار کھڑے کئے گئے۔ پرولتاریہ کی سماجی مانگوں میں سے انقلابی دھاری نکال دی گئی اور اس کے بجائے جمہوری مطالبوں کا رنگ چڑھا دیا گیا۔ چھوٹی بورژوازی کے جمہوری مطالبوں میں سے خالص سیاسی شکل ہٹا دی گئی اور ان پر اشتراکی قلعی ہو گئی۔ اس طرح سوشل ڈیموکریٹک پارٹی نمودار ہوئی۔ اس سمجھوتے سے جو ''نئی مونٹین'' بنی، اگر اس میں مزدور طبقے کے گنتی کے آدمیوں کو، اور کچھ اشتراکی گروہ بندوں کو شمار نہ کیا جائے، تو اس میں بھی وہی پہلی والی ''مونٹین'' کے لوگ بھرے تھے، فرق یہ کہ اب ان کی تعداد زیادہ تھی۔ لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، اس میں تبدیلی آتی گئی اس طبقے کے ساتھ جس کی وہ نمائندگی کر رہا تھا۔ سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کا اپنا کردار اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ڈیموکریٹک ریپبلکن اداروں کا مطالبہ کرنے لگی، اس غرض سے نہیں کہ دونوں انتہاؤں یعنی سرمایہ اور مزدوری کا صفایا کر دیا جائے بلکہ اس غرض سے کہ سرمایہ اور مزدوری میں جو ٹکراؤ موجود ہے، اس کا زور توڑ کر باہمی تال میل پیدا کر دیا جائے۔ اس غرض کے حصول کے لئے چاہے کتنے ہی مختلف ذریعے تجویز کئے جائیں، کم‌وبیش انقلابی نیت سے اس میں چاہے کتنے ہی بناؤسنگار کئے جائیں، بہر حال اندرونی

حقیقت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اندرونی حقیقت یہ کہ جمہوری طریقے سے سماج کی کایاکلپ کی جائے — لیکن چھوٹی حیثیت کی بورژوائی حدوں کے اندر رہ کر۔ اس سے تنگ‌نظری کا یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہئے کہ چھوٹی بورژوازی اصولی طور پر ایک خودغرضانہ طبقاتی مفاد ہی لاگو کرنا چاہتی ہے۔ نہیں۔ وہ تو یہاں تک مانتی ہے کہ ہمارے طبقے کی خیریت کے جو خاص حالات یا شرائط ہیں وہی عام حالات یا شرائط ہیں جن کی پابندی کر کے آج کی سوسائٹی کو سلامت رکھا جا سکتا ہے اور طبقاتی کش مکش سے نجات پائی جا سکتی ہے۔ اسی طرح یہ بھی نہ سوچنا چاہئے کہ ڈیموکریسی کے جتنے نمائندے ہوتے ہیں وہ سبھی دوکاندار ہوتے ہیں یا دوکانداروں کے حوالی موالی۔ اپنی تعلیم اور انفرادی حیثیت کے لحاظ سے ان لوگوں میں بھی زمین آسمان کا فرق ہو سکتا ہے۔ وہ صورت‌حال جو انھیں چھوٹی بورژوازی کا نمائندہ بنا دیتی ہے وہ یہ ہے کہ اپنے ذہن میں وہ ان حدوں کو پار نہیں کر سکے جن کو چھوٹی بورژوازی کی زندگی پار نہیں کرتی، اس لئے نظریاتی لحاظ سے وہی الجھنیں اور وہی سلجھاؤ انھیں بھی درپیش ہوتے ہیں جن پر چھوٹی بورژوازی کا مادی مفاد اور سماجی حالت مل کر اسے پہنچا دیتے ہیں۔ عام طور سے یہی رشتہ ہوتا ہے کسی طبقے کے سیاسی اور ادبی نمائندوں کے اور اس طبقے کے درمیان جس کی وہ نمائندگی کرتے ہیں۔

اتنا کہہ دینے کے بعد یہ بات خود صاف ہوجاتی ہے کہ ضابطہ پارٹی کے مقابلے میں "مونٹین" پارٹی نے جو ریپبلک کی خاطر اور نام‌نہاد انسانی حقوق کی خاطر مستقل زورآزمائی کی ہے، اس کی اصل غرض‌وغایت نہ ریپبلک تھی، نہ انسانی حقوق۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی فوج سے ہتھیار رکھوا لینے کی کوشش کی جائے تو وہ فوج لڑنے مرنے پر اتر آئے‌گی، لیکن اس کی اصل غرض یہ نہیں ہوتی کہ اپنے ہتھیار بچا لئے جائیں۔

جیسے ہی نیشنل اسمبلی کا اجلاس شروع ہوا، ضابطہ پارٹی نے "مونٹین" کو مشتعل کرنا شروع کر دیا۔ بورژوازی نے محسوس کیا کہ اب جمہوریت‌پسند چھوٹی بورژوازی کا کام تمام کرنا ضروری ہو

گیا ہے ، ٹھیک اسی طرح جیسے سال بھر پہلے انقلابی پرولتاریہ کا خاتمہ اس کے خیال سے ضروری ہو گیا تھا۔ مگر اس بار فریق مخالف کی حالت کچھ اور تھی۔ پرولتاری پارٹی کی طاقت سڑکوں پر تھی لیکن چھوٹی بورژوازی کی طاقت قومی اسمبلی کے اندر۔ مطلب یہ کہ اب اس فریق کو اسمبلی سے باہر کرکے سڑک پر نکالنا اور اس نوبت کو پہنچانا تھا کہ وہ خود اپنی پارلیمنٹری طاقت توڑ لے اس سے پہلے کہ وقت اور حالات اسکو مضبوط کر دیں۔ ”سونٹین،، پارٹی آنکھ بند کر کے اس جال میں آپھنسی۔

جال میں پھنسانے کےلئے چارے کا کام کیا اس واقعے نے کہ روم پر فرانسیسی فوجوں نے بمباری کر دی۔ آئین کی دفعہ ٥ میں اس بات کی ممانعت کی گئی تھی کہ فرانسیسی ریپبلک اپنی فوجی طاقت کو کسی اور قوم کی آزادی کے خلاف استعمال کرے۔ پھر دفعہ ٥٤ میں یہ پابندی بھی رکھی گئی تھی کہ انتظامیہ طاقت قومی اسمبلی کی مرضی حاصل کئے بغیر اعلان‌جنگ کا اختیار نہیں رکھتی۔ ٨ مئی کو جب یہ سوال پیش ہوا تو آئین ساز اسمبلی نے روم پر فوج بھیجنا نامنظور کر دیا۔ اس بنا پر لیدرو رولین نے ١١ جون ١٨٤٩ء کو بوناپارٹ اور اس کی وزارت کے خلاف سرکشی کے الزام میں مقدمہ چلانے کا مسودہ قانون پیش کر دیا۔ تیئر کے بار بار کے کچوکوں سے جھنجھلا کر اس نے کھلے عام یہاں تک دھمکی دے ڈالی کہ آئین کی عزت بچانے کےلئے سارے ذریعے استعمال کئے جائیں گے ، بلکہ ھتھیار سنبھال کر بھی آئین کی عزت بچائی جائےگی۔ ”مونٹین،، پارٹی ایک ساتھ اٹھی اور اس نے ھتھیار اٹھانے کی پکار دھرا دی۔ ١٢ جون کو قومی اسمبلی نے سرکشی والے مسودہ قانون کو نامنظور کر دیا اور ”مونٹین،، پارٹی اس پر پارلیمنٹ سے باہر نکل آئی۔ ١٣ جون کے واقعات ھمارے سامنے ھیں۔ اس پارٹی کے ایک حصے نے اس مفہوم کا اعلان شائع کیا کہ بوناپارٹ اور اس کے وزیر ”آئین‌باہر،، ہو چکے ھیں۔ ڈیموکریٹک نیشنل گارڈ نے سڑکوں پر جلوس نکالا تو وہ نہتے تھے ھی ، جنرل شنگارنیے کے فوجی دستوں کا سامنا ہوتے ھی بکھر گئے ، وغیرہ وغیرہ۔ ”مونٹین،، کا ایک حصہ

ملک چھوڑ کر بھاگا، دوسرا پکڑ کر بورژے ہائی کورٹ کے حوالے کر دیا گیا۔ جو باقی بچے انہیں اسکولی لڑکوں کی طرح قومی اسمبلی کے صدر کی گھٹیا نگرانی میں پارلیمنٹری قاعدے قانون کا پابند کر دیا گیا۔ پیرس میں پھر محاصرے کی حالت کا اعلان ہو گیا اور شہر میں نیشنل گارڈ کا جو ڈیمو کریٹک حصہ تھا وہ توڑ دیا گیا۔ اس طرح سے پارلیمنٹ میں ''مونٹین،، کا اثر اور پیرس شہر میں چھوٹی بورژوازی کی طاقت، دونوں کا صفایا ہو گیا۔

لیون کا علاقہ، جہاں ۱۳ جون کے واقعات نے مزدوروں کی خونی بغاوت کا سگنل دے دیا تھا، آس پاس کے پانچ ڈپارٹمنٹوں (حلقوں) سمیت اس کے محاصرے کی حالت مشتہر کر دی گئی اور جب یہ مضمون لکھا جا رہا ہے، محاصرے کی حالت برقرار ہے۔

''مونٹین،، کی اکثریت نے اپنے ہراول کا ساتھ چھوڑ دیا اور اس کے اعلان پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ پریس بھی ساتھ دینے سے کترا گیا؛ صرف دو اخباروں نے ہمت کر کے یہ pronunciamento (اعلان عام) چھاپا۔ چھوٹی بورژوازی نے اپنے نمائندوں کو دغا دی: چناں‌چہ نیشنل گارڈ یا تو غائب رہا یا کہیں سامنے آیا بھی تو بیری کیڈ کھڑے کرنے سے روکنے کے لئے۔ پارٹی کے نمائندوں نے بھی چھوٹی بورژوازی کو دھوکے میں رکھا تھا کہ فوج کی صفوں میں جو اپنے حامی بتائے گئے تھے، وہ کہیں نظر نہ آئے۔ آخرکار، بجائے اس کے کہ ڈیمو کریٹک پارٹی پرولتاریہ کی شرکت سے اور طاقت حاصل کرتی اس میں بھی اپنی کمزوری پھیلا گئی۔ اور جیسا کہ ڈیمو کریٹوں کے بڑے واقعات میں ہوا کرتا ہے، لیڈروں کی تسلی کے لئے یہ کہنا کافی تھا کہ ''عام لوگ،، اپنے عہد سے پھر گئے اور عام لوگوں نے یہ سوچ کر دل ٹھنڈا کر لیا کہ لیڈروں نے انہیں بےوقوف بنایا۔

شاید ہی کسی کارروائی کا اتنا ڈھنڈورا پیٹا گیا ہو جتنا اس کا کہ ''مونٹین،، والے کچھ کر گزریں گے؛ شاید ہی کسی واقعے کو اتنے یقین کے ساتھ اور اس قدر قبل از وقت اچھالا گیا ہو جتنا اس کو کہ جمہوریت کی جیت ہوکر رہےگی۔ اس میں شک نہیں کہ

ڈیموکریٹوں کو ڈھول کی طاقت پر بہت بھروسہ ہے جس کے دھونسے میں یری‌ہون کی دیواریں (۸۴) بیٹھ گئی تھیں۔ ہر بار جب وہ اندھی طاقت کی فصیل کے سامنے پہنچتے ہیں اسی معجزے کی نقل کرنا چاہتے ہیں۔ ’’ مونٹین ،، پارٹی کو اگر پارلیمنٹ میں معرکہ سر کرنا تھا تو ہتھیار اٹھانے کی صدا نہیں لگانی چاہئے تھی۔ اور اگر پارلیمنٹ میں یہ آواز بلند کی تھی تو پھر سڑکوں پر پارلیمنٹ کے انداز سے نہیں نکلنا چاہئے تھا۔ اگر پرامن جلوس کے بارے میں سنجیدگی سے سوچا تھا، تو پہلے سے یہ اندازہ نہ کرنا حماقت تھی کہ اس جلوس کا جنگی مقابلہ کیا جائے گا۔ اگر واقعی ٹکر لینی ہی تھی تو یہ کونسی دانائی ہوئی کہ وہ ہتھیار ہی رکھ دئے گئے جن سے کام پڑنےوالا تھا۔ چھوٹی بورژوازی اور اس کے ڈیموکریٹک نمائندوں کی انقلابی دھمکیاں محض فریق مخالف پر رعب جمانے کے لئے ہوتی ہیں۔ مگر جب وہ اندھی گلی میں پہنچتے ہیں، جب وہ اپنی پوزیشن اتنی نازک کر چکے ہوتے ہیں کہ دھمکی کو قول سے فعل میں لانا ضروری ہو جائے تو پھر ایسے دو غلےپن سے قدم اٹھاتے ہیں کہ منزل تک پہنچنے کے جو ذریعے ہیں، انھی سے کترا جائیں اور کوئی بہانہ ہاتھ لگے جو اپنی شکست کے سر منڈھ دیا جائے۔ کانوں کے پردے پھاڑنےوالی الاپ، اصل مقابلے کا بلند بانگ اعلان کرتے کرتے جہاں مقابلے کی نوبت آئی کہ دبی آواز کے شکووں میں بدل جاتی ہے، ایکٹر سنجیدگی سے اپنا رول کرنا چھوڑ دیتے ہیں اور ایکٹ یوں دم توڑنے لگتا ہے جیسے سوئی چبھا غبارہ۔

کوئی پارٹی اپنے ذرائع کو اتنا بڑھا چڑھا کر بیان نہیں کرتی اور پیش آنےوالی صورت حال کو اس قدر بےخیالی سے نہیں دیکھتی جتنا ڈیموکریٹک پارٹی۔ چوں کہ فوج کے ایک حصے نے اس پارٹی کے حق میں ووٹ دے دئے تھے، لہازا ’’ مونٹین ،، اس خوش‌فہمی میں مبتلا ہو گئی کہ فوج اس کی طرف سے اٹھ کھڑی ہوگی۔ وہ بھی کس موقع پر ؟ ایسے موقع پر جب فوج کی نظر میں اس کا صرف ایک ہی مطلب ہو سکتا تھا کہ انقلابیوں نے روم کے سپاہیوں کی حمایت میں اب فرانسیسی فوج کے مقابل ہتھیار اٹھا لئے۔ پھر یہ بھی ہے کہ

جون ۱۸۴۸ء کے واقعات ابھی ذہنوں میں اتنے تازہ تھے کہ پرولتاریہ کے دلوں سے نیشنل گارڈ کی نفرت مٹی نہ تھی اور ڈیموکریٹک لیڈروں سے خفیہ سوسائٹیوں کے لیڈروں کی بےاعتباری گئی نہ تھی۔ ان اختلافات کو ہموار کرنے کے لئے یہ ہونا چاہئے تھا کہ ایسے سنجیدہ مقاصد یکجا کئے جاتے جنھیں خطرہ ہو سکتا تھا۔ آئین کے کسی ایک چلتے ہوئے پیراگراف کی خلاف‌ورزی ایسا سبب نہیں بن سکتی تھی، جو مشترک مفاد کو جگا دیتی۔ کیا اس سے پہلے خود ڈیموکریٹوں کے علم میں آئین کی بار بار خلاف‌ورزی نہیں ہو چکی تھی؟ کیا سب سے ہر دل‌عزیز اخباروں نے اسی آئین پر یہ پھبتی نہیں کسی تھی کہ یہ انقلاب کے مخالفین کی دستکاری ہے؟ لیکن ڈیموکریٹ جو چھوٹی بورژوازی کی نمائندگی کرتا ہے، یعنی ایک ایسے عبوری طبقے کی، جس کے اندر دو طبقوں کے مفاد رل مل کر اپنی دھار کھو بیٹھتے ہیں، خود کو عام طور سے طبقاتی ٹکراؤ سے بلندوبرتر شمار کرتا ہے۔ ڈیموکریٹ یہ تو مانتے ہیں کہ ان کا سامنا ایسے طبقے سے ہے جسے خاص حقوق حاصل ہیں، لیکن قوم کے باقی سب درجوں کے لوگ ملا کر وہ خود قوم بن جاتے ہیں۔ چناں‌چہ وہ کسی طبقے کی نہیں بلکہ پوری قوم کے حق کی ترجمانی کرتے ہیں، وہ قوم کے مفاد کی طرف سے کھڑے ہوتے ہیں۔ لہازا جب مقابلے کی نوبت آنےوالی ہو، تو ڈیموکریٹوں کو اس کی ضرورت نہیں کہ مختلف طبقوں کے منشا اور ان کی حالت کی چھان‌بین کر لیں۔ خود اپنے سروسامان کی پہلے سے جانچ پرتال بھی ضروری نہیں سمجھتے۔ انھیں تو بس سگنل دینا ہے اور پوری قوم اپنے بےپناہ تام جھام کے ساتھ ظالم پر ٹوٹ پڑےگی۔ اب اگر ان کے مفاد اپنی کشش کھوبیٹھیں، ان کی طاقت بےجان ہو جائے، تو قصوروار ہیں یا تو وہ موذی sophists جو ایک قوم کو مخالف کیمپوں میں بانٹ کر رکھ دیتے ہیں، یا وہ فوج جس کی درندگی اور بےبصری اس قدر بڑھ گئی ہے کہ اتنا بھی نہیں سمجھ سکتی کہ ڈیموکریسی کے اصل اصول خود اسی کے حق میں جاتے ہیں، یا پھر تعمیل کا کوئی ایک آدھ نکتہ ہونے سے رہ گیا جس کے کارن کھنڈت پڑگئی، یا آخر میں قصور یہ رہا کہ

واقعات کیا رخ اختیار کریں گے ، اس پر نظر نہ گئی اور اس بار سارا کھیل بگڑ گیا۔ بہرحال شکست چاہے کتنی ہی شرمناک ہو ، ڈیموکریٹ اتنا ہی بےداغ نکل آتا ہے ، جتنا وہ اس طرف بڑھتے وقت بے قصور تھا۔ اب وہ اور پختہ یقین لے کر نکلتا ہے کہ فتح بہرحال اسی کی ہوگی ، خود اسے یا اس کی پارٹی کو اپنا نقطۂ نظر بدلنے کی ضرورت نہیں ، بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ حالات پختہ ہو جائیں اور اس کے مطابق بنیں۔

بہرحال یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہئے کہ اگر ''سونٹین'' نے سخت چوٹ کھائی ہے ، وہ ٹوٹی ہے اور پارلیمنٹ کے نئے قوانین نے اس کی تذلیل کی ہے ، تو یہ پارٹی بہت مصیبت میں ہوگی۔ کیا ہوا اگر ۱۳ جون کے واقعات نے اس کے لیڈر ہٹا دئے ، ان کی جگہ دوسرے درجے کے ''دماغوں'' نے بھردی جو نیا مرتبہ پاکر اکڑ رہے ہیں۔ اگر اب ان کی پارلیمنٹری بے بسی پر شبہ کی گنجائش نہیں رہی ، تو انہیں یہ حق پہنچتا ہے کہ اپنی کارگزاری کو اخلاقی ملامتوں کی بوچھار تک اور چٹختی ہوئی ادائگی الفاظ تک محدود رکھیں۔ اگر ضابطہ پارٹی کو ان میں اب بھی انقلاب کے رہے سہے سرکاری نمائندے اور نراج کے سارے دھماکوں کے آثار نظر آتے ہیں تو وہ اور بھی سعادت‌مندی اور اعتدال سے کام لیں گے۔ ۱۳ جون کی شکست پر انہوں نے خود کو اس گہری باسعنی للکار سے تشفی دے لی ہے : ''اچھا ، زرا عام‌رائے‌دہندگی کے حق کو چھیڑ کر دیکھو ، تب ہم دکھا دیں گے کہ کیا ہوتا ہے ! زمانہ دیکھ لے گا کہ ہم کیا ہیں! * Nous verrons ! ''

''مونٹین'' والوں کے جو لیڈر ملک سے باہر بھاگ لئے ، ان کے بارے میں اتنا بتا دینا کافی ہے کہ لیدرو رولین ، جس نے دو ہفتے کے اندر اس زبردست پارٹی کو بالکل تباہ کرا دیا جس کی رہنمائی سنبھال رکھی تھی، اب جلاوطنی کی فرانسیسی حکومت قائم کرنے کی دعوت وصول کرتا ہے اور یہ کہ عمل کے میدان سے دورپار اس کی شخصیت

* ہم دیکھ لیں گے! (ایڈیٹر)

کا ڈیل ڈول اسی نسبت سے بڑھتا دکھائی دیتا ہے جتنا انقلاب کا معیار گرا ہے، اور جس نسبت سے سرکاری فرانس کی سرکاری ہستیوں کا وجود پستہ‌قاست ہو گیا ہے، اور یہ کہ ۱۸۵۲ء کے الکشن میں وہ رپبلکن دعویدار کی حیثیت سے کھڑا ہوگا، اور یہ کہ وقتاً فوقتاً ولاخیوں کو اور دوسری قوموں کو سرکلر بھیجتا رہتا ہے، ان سرکلروں کے ذریعے یورپ کے ظالموں کو اپنے اور اپنے ساتھیوں کے کارناموں کی دھمکیاں دیا کرتا ہے۔ کیا مفکر پرودھوں نے بہت بے جا کیا تھا جب اس قسم کے لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے یہ لفظ کہے تھے: «Vous n'êtes que des blagueurs!» ('' آپ صرف باتیں بنانے کے ہیں، اور کچھ نہیں! '') ؟

۱۳ جون کو ضابطہ پارٹی نے نہ صرف یہ کہ '' مونٹین '' کی طاقت توڑ کر رکھ دی، بلکہ آئین کو قومی اسمبلی کی اکثریت رائے کا پابند بھی کر دیا۔ اس نے رپبلک کے یہ معنی لئے: رپبلک میں حکومت بورژوازی کی ہے، پارلیمنٹری صورت لئے ہوئے۔ اس پر بادشاہت کے زمانے کا زور نہیں چلتا: نہ انتظامیہ طاقت کو اس کے فیصلے رد کرنے کا اختیار رہا، نہ پارلیمنٹ توڑنے کا۔ تیئر نے پارلیمنٹری رپبلک کی جو تعریف کی، وہ یہی ہے۔ اب اگر ۱۳ جون کو بورژوازی نے پارلیمنٹ کی چاردیواری کے اندر اپنے لئے لامحدود اختیار حاصل کر لیا تو کیا اس نے ایوان کے سب سے ہر دل‌عزیز ممبروں کو باہر نکال کر خود پارلیمنٹ پر کاری ضرب نہیں لگائی، اسے انتظامیہ طاقت اور عوام کی نظروں میں حددرجہ گرا نہیں دیا؟ پارلیمنٹ کے اتنے‌سارے ممبروں کو، بے تکلف، عدالت کے حوالے کرکے اس نے اپنے اس پارلیمنٹری مرتبے سے بھی تو ہاتھ دھو لئے کہ پارلیمنٹ کے ممبروں کے خلاف کارروائی نہ کی جائے۔ '' مونٹین '' پارٹی‌والوں کو ذلت کے جن قوانین کا پابند کیا گیا، ان کی بدولت رپبلک کے پریسیڈنٹ کی شان اتنی ہی اونچی ہو گئی جتنی عوام کے نمائندوں کی انفرادی حیثیت گر گئی۔ آئینی حقوق کی حمایت میں جو بغاوت اٹھی تھی، اس کو بورژوازی نے ایسی نراجی کارروائی کا الزام دیا جو سماج کی جڑ کھودنے کے لئے کی گئی تھی، اور یہ الزام لگا کر آئندہ کو

اپنے واسطے بھی یہ راہ بند کرلی کہ اگر انتظامیہ طاقت کبھی بورژوازی کے خلاف آئین سے ہٹ کر کارروائی کرے تو وہ خود بھی بغاوت کی صدا نہیں لگا سکتی۔ تاریخ نے بھی کیا مذاق کیا! دوسری دسمبر ۱۸۵۱ء کو ضابطہ پارٹی نے آنکھوں میں آنسو بھر کر مگر لا حاصل کوشش کی کہ بوناپارٹ کے مقابلے پر جنرل اودینو کو آئین کے محافظ کی حیثیت سے عوام کے سامنے کھڑا کر دے حالانکہ یہی جنرل تھا جس نے بوناپارٹ کے حکم سے روم پر بمباری کر کے ایسا سبب پیدا کر دیا تھا جس سے ۱۳ جون ۱۸۴۹ء کا آئینی ہنگامہ برپا ہو گیا۔ ۱۳ جون کا ایک اور ہیرو ہے ویئرا، اسے قومی اسمبلی کے پلیٹ‌فارم سے بانس پر چڑھایا گیا تھا کہ جمہوریت‌پسند اخباروں کے دفتروں میں، نیشنل گارڈ کی ایک ٹولی لے جا کر، جس کا اوپر کے مالیاتی شرفا سے تعلق تھا، اس نے آفت مچا دی تھی، اب وہی ویئرا بوناپارٹ کی سازش میں شریک ہوا اور بڑی حد تک اسی نے یہ اہتمام کیا کہ قومی اسمبلی جب موت کے منہ میں ہو تو نیشنل گارڈ کی طرف سے کوئی مدد نہ پہنچنے پائے۔

۱۳ جون کے واقعے کا ایک مطلب اور بھی ہے۔ ''مونٹین'' کی کوشش تھی کہ بوناپارٹ پر مقدمہ چلے۔ پارٹی کو شکست ہوئی تو آپ سے آپ یہ بوناپارٹ کی فتح ہوئی۔ جمہوریت‌والے دشمنوں پر اسے ذاتی فتح نصیب ہوئی۔ ضابطہ پارٹی نے میدان مار لیا۔ بوناپارٹ کے لئے بس یہی کرنا رہ گیا کہ اس فتح کو بھنالے۔ اس نے بھنالی۔ ۱۴ جون کو پیرس کی دیواروں پر اس مفہوم کا سرکاری اعلان لگا ہوا تھا کہ پریسیڈنٹ نے، گویا بلاارادہ، بجبرو اکراہ حالات کے دباؤ میں، اعتکاف کی حالت سے نکل کر، اگرچہ لوگوں پر اس کی خوبیاں آشکار نہیں ہیں، اور مخالف اس پر تہمت تراشتے ہیں، تاہم ضابطے کی خاطر ایسا فیصلہ کیا۔ ظاہرا تو یہ کہ اپنے وجود کو ضابطے میں ضم کردیا، لیکن درحقیقت نکلتا یہ ہے کہ ضابطے کو اپنے وجود میں ضم کر لیا۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ بعد کی کسی تاریخ میں قومی اسمبلی نے روم پر فوجی مہم بھیجنے کی منظوری دے دی، لیکن بوناپارٹ اس مہم کی پہل کر چکا تھا۔ ویٹکن میں اسقف اعظم حضرت سیموئیل

کو قبضہ دلا کر بوناپارٹ کو یہ خوش‌فہمی ہوگی کہ تویلری کے شاہی محل میں حضرت داؤد کی شان سے داخل ہوگا (۸۵) - پادریوں کو اس نے اپنا طرفدار بنا لیا تھا۔

۱۳ جون کا طوفان ، جیسا کہ معلوم ہوا ، ایک پرامن جلوس بن کر رہ گیا۔ یعنی اب اس کے مقابلے پر فتح کے ہار پھول کا سوال ہی نہ رہا۔ حالاں‌کہ اس وقت میں واقعات اور سورماؤں کا قحط تھا ، پھر بھی ضابطہ پارٹی نے اس سوکھے معرکے کو دوسرے آسٹرلٹز (۸۶) کا مرتبہ دے‌دیا۔ جلسوں اور اخباروں میں فوج کی خوب تعریف کی گئی کہ وہی ضابطہ قائم رکھنے‌والی طاقت ہے ، اس کے برخلاف عوام کا انبوہ محض بے‌ضابطگی یا افراتفری کی بے‌بسی ظاہر کرتا ہے۔ جنرل شنگارنیے کو بانس پر چڑھایا گیا کہ وہ ”سماج کی شیرازہ‌بندی“ کا نام ہے ، اور بالآخر وہ بھی اسی خودفریبی میں مبتلا ہوگیا۔ اس عرصے میں فوج کے وہ حصے جن پر شک‌وشبہ کیا جا سکتا تھا ، چپ‌چاپ پیرس سے باہر روانہ کردئے گئے۔ وہ پلٹنیں ، جنھوں نے الکشن کے زمانے میں جمہوری جذبہ کچھ زیادہ ہی دکھا دیا تھا ، ان کا تبادلہ فرانس سے الجیریا کردیا گیا ، جن فوجیوں میں بے‌اطمینانی دیکھی ، انھیں تعزیری بٹالینوں کے حوالے کیا گیا۔ اور آخر یہ کہ ایک قاعدے کے تحت ، فوجی بارکوں سے اخباروں کا ، اور شہری سوسائٹی سے فوجی بارکوں کا سلسلہ بالکل کاٹ دیا گیا۔

اب ہم فرانس کے نیشنل گارڈ کی تاریخ میں فیصلہ‌کن موڑ پر آگئے ہیں۔ ۱۸۳۰ء میں نیشنل گارڈ نے بادشاہت کی بحالی کی تقدیر کا فیصلہ کردیا تھا (۸۷) ۔لوئی فلپ کے زمانے میں اگر نیشنل گارڈ نے فوجیوں کا ساتھ دیا ہوتا تو ہر ایک بغاوت ناکامی پر تمام ہوتی۔ فروری ۱۸۴۸ء کے دنوں میں وہ بغاوت کا منہ دیکھتا رہا اور لوئی فلپ کے ساتھ مشتبہ سلوک رکھا ، تو لوئی فلپ نے سوچ لیا کہ وہ اب ڈوب گیا اور بالآخر یہی ہوا بھی۔ چناں‌چہ یہ عقیدہ جڑ پکڑ گیا کہ انقلاب نیشنل گارڈ کے بغیر کامیاب نہیں ہوسکتا اور فوج اس کے مقابلے پر فتح نہیں پا سکتی۔ فوج میں شہری آبادی کی ہمہ‌گیر طاقت کے بارے میں یہ وہم عام ہو گیا تھا۔ جون ۱۸۴۸ء کے دنوں

میں جب پورے نیشنل گارڈ نے چھاونی کی فوج سے مل کر بغاوت کو کچل ڈالا تو یہ وہم اور بھی گہرا ہوگیا۔ جب بوناپارٹ نے اختیارات سنبھالے تو نیشنل گارڈ کی پوزیشن کسی قدر کمزور پڑگئی کیونکہ جنرل شنگارنیے کے ہاتھ میں ایک ساتھ اس کی بھی کمان آگئی اور پہلی آرمی ڈویژن کی بھی۔

جس طرح نیشنل گارڈ کی کمان، ایسا معلوم ہونے لگا کہ فوجی کمانڈر انچیف کے اختیارات کا ایک ضمنی حصہ ہے، اسی طرح خود نیشنل گارڈ بھی چھاونی کی فوج کا ایک دم‌چھلا نظر آنے لگا۔ آخر اس کی طاقت ۱۳ جون کو توڑدی گئی۔ نہ صرف یہ کہ اس روز سے رفتہ رفتہ اس کے دستے سارے فرانس میں توڑے جانے لگے اور یہ سلسلہ اس وقت تک چلا جب تک نیشنل گارڈ ٹکڑے ہوکر بکھر نہیں گیا بلکہ ۱۳ جون کا جلوس اصل میں تو نیشنل گارڈ کے جمہوری حصے کا ہی مظاهرہ تھا۔ اس نے فوج کے مقابلے میں اپنے ہتھیار نہیں سجیے تھے، صرف وردی سجی تھی، مگر اسی وردی میں جادو کا اثر سمجھا جا رہا تھا۔ فوج نے آخر دیکھ لیا کہ یہ وردی بھی ایسے ہی اونی کپڑے کی ہے جیسے اور وردیاں ہوا کرتی ہیں۔ جادو کا اثر غارت ہوگیا۔ جون ۱۸۴۸ء کے دنوں میں بورژوازی اور چھوٹی بورژوازی نے نیشنل گارڈ کے روپ میں پرولتاریہ کے مقابلے پر فوج کا ساتھ دیا تھا۔ ۱۳ جون ۱۸۴۹ء کو بورژوازی نے یہ چال کی کہ چھوٹی بورژوازی کے نیشنل گارڈ کو فوج کی مدد سے تڑوا دیا۔ دوسری دسمبر ۱۸۵۱ء کو خود بورژوازی کے نیشنل گارڈ کا وجود بھی ختم ہوگیا اور بوناپارٹ نے جب بعد میں اسے توڑ دینے کا فرمان جاری کیا تو اسی حقیقت پر اپنی مہر لگادی۔ اس طرح سے خود بورژوازی نے ہی فوج کے مقابل کام آنےوالا اپنا آخری ہتھیار توڑلیا۔ مگر وہ تو اسی وقت توڑنا تھا جب چھوٹی بورژوازی نے اس کی پشت پر کمک بننا چھوڑا اور باغی کی طرح آستین چڑھا کر سامنے آ گئی۔ یوں بھی بورژوازی اس پر مجبور تھی کہ بےلگام طاقت کے سامنے اپنے بچاؤ کا تمام سامان توڑ پھینکے کیوں کہ اب تو وہ خود ہی بےلگام طاقت بن گئی تھی۔

بہت وقت نہ گزرا ہوگا کہ ضابطہ پارٹی نے ان اختیارات کو پھر سے پالینے کا جشن منایا جو ۱۸۴۸ء میں اس کے ھاتھ سے نکل گئے تھے، گویا اسی لئے نکلے تھے کہ ۱۸۴۹ء میں ہر قسم کی روک ٹوک سے پاک ہوکر پھر اس کے ھاتھ آجائیں۔ اب جو پھر ھاتھ آئے تو رپبلک اور آئین دونوں کی توھین کرکے، اگلے، پچھلے اور حالیہ تمام‌انقلابوں پر لعنت بھیج کر، اور اس انقلاب پر بھی جو خود اسی پارٹی کے لیڈروں نے برپا کرایا تھا، اور آخر ایسے قانون پاس کرکے جو پریس کی زبان‌بندی کریں، یونینوں کی آزادی مٹا کر اور محاصرے کی حالت کو ایک مستقل اور معمول کی سی قانونی صورت دے کر طاقت کی بازیافت کا جشن منایا۔ اس کے بعد قومی اسمبلی نے وسط اگست سے وسط اکتوبر تک کےلئے اپنا اجلاس ملتوی کردیا۔ اور اپنی غیرحاضری کے زمانے کا کام چلانے کےلئے ایک مستقل کمیشن بٹھادیا۔ رخصت کے ان دنوں میں، جائزوارث‌والوں نے ایمس‌والوں سے جوڑ توڑ کیا، اورلین‌والوں نے کلیرمونت سے، بوناپارٹ نے شاھانہ دوروں کے ذریعے جوڑتوڑ کی گنجائش نکالی اور ڈپارٹمنٹل کونسلوں نے آئین پر نظرثانی کے جلسوں میں یہی کیا۔ یہ حقیقتیں ھیں جو مستقل دھرائی جارھی ھیں، ان دنوں میں جب قومی اسمبلی کے اجلاس کی چھٹیاں ھو جاتی ھیں۔ جب ان میں واقعات کی کیفیت ابھرےگی تب میں تفصیل سے بحث کروں‌گا۔ فی‌الحال صرف اتنا اضافہ کرنا ھے کہ قومی اسمبلی نے منظرعام سے ایک عرصے تک کےلئے غائب ھوکر اور اپنی جگہ رپبلک کے سر پر ایک آدمی کو بٹھا کر جو ھلکی شخصیت کا آدمی، لوئی بوناپارٹ ھے، کوئی شرافت نہیں برتی۔ رھی ضابطہ پارٹی سو اس نے پبلک کو عجب چکر میں ڈالا ھے کہ اس پارٹی میں لگے ھوئے شاہ‌پرستی کے کل پرزے بکھر گئے اور اب بادشاھت کی بحالی کی حمایت اور مخالفت میں ایک دوسرے سے دست‌وگریباں ھیں۔ ھر بار جب اسمبلی کے اجلاس کی چھٹی ھوتی ھے اور پارلیمنٹ کا زبردست شور تھم جاتا ھے اور اس کے ممبر قوم کے اندر گھل مل جاتے ھیں تو صرف اتنا آنکھوں کے سامنے آجاتا ھے کہ اس رپبلک کی موجودہ حالت میں محض ایک بات کی

کسر رہ گئی ہے اور وہ یہ کہ پارلیمنٹ کی چھٹیاں مستقل کردی جائیں اور جھنڈے پر جہاں اب یہ چڑھا ہے : Liberté, Égalité, Fraternité (آزادی ، مساوات ، بھائی چارہ) ، وہاں اس طرح کر دیا جائے : Infanterie, Cavalerie, Artillerie! (پیدل ، سوار ، توپخانہ!)

۴

اکتوبر ۱۸۴۹ء کے وسط میں قومی اسمبلی نے پھر اجلاس بلایا۔ پہلی نومبر کو بوناپارٹ نے اسمبلی کو ایک پیغام سے حیرت میں ڈال دیا۔ پیغام میں بارو — فالو کی وزارت کو برطرف اور نئی وزارت مقرر کرنے کا اعلان تھا۔ کوئی اپنے حوالی موالی اس بے‌تکلفی سے برخاست نہیں کرتا جیسے بوناپارٹ نے اپنے وزیروں کو نکالا۔ جو ٹھوکر قومی اسمبلی کے لگانی مقصود تھی وہ فی‌الحال بارو اینڈ کو کے حصے میں آئی۔

بارو کی مجلس‌وزارت ، جیسا کہ معلوم ہے ، اورلین اور جائز وارث کے آدمیوں سے بنی تھی ، یہ ضابطہ پارٹی کی وزارت تھی۔ بوناپارٹ کو اس قسم کی وزارت چاہئے تھی تاکہ ریپبلکنوں کی آئین ساز اسمبلی کو برخاست کیا جائے ، روم پر فوجی مہم بھیجی جائے اور ڈیموکریٹک پارٹی کو توڑ دیا جائے۔ تب اس وزارت کو آگے کرکے بوناپارٹ بظاہر خود اوٹ میں ہوگیا ، سرکاری اختیارات کی کنجیاں ضابطہ پارٹی کے حوالے کردیں اور خود ادنا حیثیت کا نقاب ڈال لیا ، جیسے لوئی فلپ کے زمانے میں پیرس کے اخباروں کے ذمہ‌دار اڈیٹروں نے کیا تھا کہ خاکسار (homme de paille) بن کر بیٹھ رہے۔ اب اس نے وہ نقاب اتار پھینکا جو باریک سا پردہ بن کر اس کے اصلی خدوخال چھپانے کے کام کا نہیں رہ گیا تھا بلکہ آہنی نقاب بن چکا تھا اور اصلی چہرہ دکھانے سے روک رہا تھا۔ بوناپارٹ نے بارو کی وزارت اس غرض سے قائم کی تھی کہ ریپبلکنوں کی قومی اسمبلی کو ضابطہ پارٹی کی طرف سے تڑوایا جائے ، اب وہ غرض پوری ہوگئی تو وزارت برطرف کردی تاکہ اپنی ہستی کو منظرعام پر لایا جائے اس حیثیت سے کہ وہ ضابطہ پارٹی کی قومی اسمبلی سے آزاد ہے۔

وزارت کو برطرف کرنے کےلئے معقول بہانوں کی بھی کچھ کمی نہ تھی۔ بارو وزارت نے پریسیڈنٹ کے ساتھ وہ رکھ رکھاؤ بھی نہیں برتا جس کی ضرورت تھی اس خیال سے کہ رپبلک کا پریسیڈنٹ قومی اسمبلی کے برابر کا بااختیار عہدہ‌دار معلوم ہو۔ قومی اسمبلی کی تعطیل کے دنوں میں بوناپارٹ نے ایک خط ایڈگر نیئی کے نام شائع کرایا جس میں بظاہر پوپ اعظم نہم کے بےمروتی کے سخت برتاؤ پر اپنی ناگواری ظاہر کی تھی، ٹھیک اسی طرح آئین ساز اسمبلی کی مرضی کےخلاف ایک خط چھپوا دیا جس میں سپہ‌سالار اودینو کو رومن رپبلک پر چڑھائی کرنے کی داد دی گئی تھی۔ جب قومی اسمبلی نے روم پر فوج کشی کے خرچ کا بجٹ پاس کردیا تو وکٹر هیوگو نے اپنے لبرل‌ازم کا بھرم رکھنے کو بوناپارٹ کے اس خط کا سوال زیربحث لانا چاہا۔ ضابطہ پارٹی نے تحقیرآمیز بےاعتباری کی شورپکار میں اس خیال کو ہی دفن کردیا کہ بوناپارٹ کے زبانی جمع خرچ سے کوئی سیاسی مطلب نکلتا ہے۔ وزیروں میں سے کسی نے بھی بوناپارٹ کے چیلنج کا جواب نہیں دیا۔ ایک اور موقع پر وزیراعظم بارو نے اپنے خاص کھوکھلے طمطراق میں پلیٹ‌فارم سے جھڑک کر کہہ ڈالا کہ بقول خود، پریسیڈنٹ کے بہت نزدیکی حلقے میں ”گندی سازشیں“ چل رہی ہیں۔ آخر میں یہ ہوا کہ جب وزارت نے قومی اسمبلی میں اورلین کی شہزادی کی بیوگی کی پنشن منظور کرائی تو پریسیڈنٹ کے اسٹاف کا خرچ بڑھانے کی کسی تجویز پر غور کرنے سے انکار کردیا۔ اور بوناپارٹ کی ہستی میں شاہی کے دعویدار کی حیثیت کے ساتھ ایک جانبہار کی حیثیت بھی لپٹی ہوئی تھی جو اس کے دماغ میں ایک کے بعد ایک شاندار خیال ڈال رہی تھی کہ وہی ہے جسے سلطنت کے اکھڑے ہوئے قدم جمانے کو پکارا گیا، اور اب فرانسیسی قوم کی باری ہے کہ وہ اس کا قرضہ چکائے۔

بارو — فالو کی وزارت پہلی اور آخری پارلیمنٹری وزارت تھی جو بوناپارٹ نے بنائی۔ چناں‌چہ اس وزارت کا برطرف کیا جانا ایک فیصلہ کن موڑ ہے۔ اسی کے ساتھ ضابطہ پارٹی کے ہاتھ سے پارلیمنٹری حکومت بنائے رکھنے کا جو اصل سہارا تھا یعنی انتظامیہ طاقت کی

باگ‌ڈور، وہ ایسی گئی کہ پھر کبھی ہاتھ نہ آئی ۔ فرانس ایسا ملک ہے جہاں انتظامیہ طاقت کے تحت پانچ لاکھ سے زیادہ سرکاری ملازمین کی فوج رہتی ہے ، یعنی مستقل طور پر آبادی کی ایک بڑی تعداد اور اس کے مفاد قطعی انتظامیہ کی مرضی پر منحصر رہتے ہیں ، جہاں شہری سوسائٹی کو اسٹیٹ اپنے جال میں ، کنٹرول میں، ہدایت، نگرانی اور سرپرستی میں یہاں تک رکھتی ہے کہ اس کی زندگی کے خاص خاص مظاہر سے لےکر نہایت معمولی معاملات تک ، زندگی بسر کرنے کی عام اور مشترک صورتوں سے لےکر افراد کی ذاتی گزر اوقات تک سبھی کچھ اسٹیٹ کے ہاتھ میں رہتا ہے ، جہاں غیرمعمولی مرکزیت کے اثر سے اسٹیٹ کا مفت‌خورا انجر پنجر ایسا پھیل پڑا ہے کہ ہر جگہ وہی کارفرما ہے ، اسی کا سکہ چلتا ہے اور ایسی غضب کی لچک اور پھرتی آگئی ہے جس کی مثال اگر کہیں ملےگی تو صرف بے بسی کے ساتھ دوسروں کی محتاجی میں ملےگی ، جب اندر کا اصلی سماجی وجود بے ڈول اور ڈھیلا ڈھالا ہوکر رہ جائے — اس جیسے ملک فرانس میں یہ بات صاف ہے کہ قومی اسمبلی کے ہاتھ سے اگر قلمدان وزارت تقسیم کرنے کا اختیار جاتا رہے تو پھر ہر قسم کا اثر کافور ہو جاتا ہے ، بشرطیکہ وہ سرکاری انتظامی محکموں کو سادہ نہ بنا چکی ہو ، سرکاری ملازمین کی پلٹن زیادہ سے زیادہ نہ چھانٹ چکی ہو ، اور شہری سوسائٹی کو ، رائےعامہ کو اس پر آمادہ نہ کر چکی ہو کہ وہ گورنمنٹ کے حکم احکام سے بےنیاز ہوکر اپنے معاملات کی دیکھ بھال خود اپنے اداروں کے ذریعے سنبھال لیں ۔ لیکن اسی لمبی چوڑی سرکاری مشینری کو اس کے تمام بےشمار کل پرزوں کے ساتھ باقی اور قائم رکھنا ہی وہ تدبیر ہے جس سے فرانسیسی بورژوازی کے مادی مفاد اندر تک ایک دوسرے میں سٹے ہوئے ہوتے ہیں ۔ بورژوازی کی فالتو آبادی کو یہیں سے نوکریاں دی جاتی ہیں اور جس رقم کو وہ منافع ، سود ، لگان اور الاؤنسوں وغیرہ کی شکل میں ہضم نہیں کر سکتی ، اس کو وہ سرکاری تنخواہوں کی صورت میں وصول کر لیتی ہے ۔ پھر یہ بھی کہ سیاسی مصلحتوں نے اسے مجبور کیا کہ روز بروز زیادہ سختی اور دباؤ سے کام لے ، جس کی خاطر

سرکاری اختیارات کے ذرائع اور کارکن دونوں کی تعداد بڑھانا لازم تھا ، ساتھ ساتھ یہ ہوا کہ اسے لگاتار رائے عامہ سے لڑنا پڑا اور جہاں سماجی سرگرمی کے آزاد اداروں کا صفایا نہیں کر سکی وہاں ان کو بدگمانی کے ساتھ کچل ڈالا اور مفلوج کر کے رکھ دیا۔ اس طرح سے فرانسیسی بورژوازی کی طبقاتی پوزیشن نے ایک طرف تو ان حالات کو ہی مٹانے کی ٹھانی جو ہر قسم کی، یہاں تک کہ خود اسی طبقے کی پارلیمنٹری حکمرانی قائم رکھتے، اور دوسری طرف پارلیمنٹری اختیار کی دشمن انتظامیہ طاقت کو اٹوٹ حیثیت دے دی۔

جو نئی وزارت بنی اس کا نام تھادی اپول وزارت۔ مطلب یہ نہیں کہ جنرل دی اپول وزیر اعظم بن گیا۔ اصلیت یہ ہے کہ بارو کی وزارت سے استعفا لیتے ہی بوناپارٹ نے اس عہدے کا وقار ختم کر دیا، جو ریپبلک کے پریسیڈنٹ کو آئینی بادشاہ کے مقام پر بغیر کسی قانونی حیثیت کے رکھے ہوئے تھا ، وہ بھی ایسے آئینی بادشاہ کی حیثیت میں جس کے پاس نہ تخت و تاج تھا ، نہ نشان وشمشیر ، نہ وہ مرتبہ کہ کوئی آنچ نہ آسکے ، نہ یہ حق کہ ریاست کے سب سے بلند مرتبے کو اپنی اولاد میں منتقل کر سکے ، اور پھر سب سے بری بات یہ کہ شاہانہ الاؤنس تک سے محروم۔ دی اپول کی وزارت میں صرف ایک شخص تھا جسے پارلیمنٹری حیثیت حاصل تھی۔ یہ تھا ساھوکار فولد، اوپر کے مالیاتی شرفا میں جو بہت بدنام تھے ان میں سے ایک۔ اسے مالیات کا محکمہ ھی سپرد بھی ہوا۔ پیرس کے شیئر اکسچینج مارکٹ کے بلیٹین دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی نومبر ۱۸۴۹ء کے بعد سے سرکاری تمسکات (سکیوریٹیز) کی قیمت بوناپارٹ کے اسٹاک بڑھنے اور گھٹنے کے ساتھ چڑھنے اترنے لگی۔ اس طرح سے شیئر بازار میں بوناپارٹ نے اپنے شریک کار بنالئے اور اسی کے ساتھ کارلے کو پیرس کا پولیس پریفیکٹ مقرر کر کے پولیس کی باگ ڈور بھی اپنے ہاتھ میں لے لی۔

وزارت کی تبدیلی کا اثر تبھی ظاھر ہو سکتا تھا جب حالات آگے بڑھتے۔ فی الحال تو بوناپارٹ نے صرف ایک قدم آگے بڑھایا تھا تاکہ اس کا پیچھے ہٹنا زیادہ نظر میں آئے۔ اپنے چبھتے ہوئے پیغام کے فوراً

بعد انتہائی ملائم اعلان کیا کہ وہ قومی اسمبلی کے سامنے سر جھکاتا ہے۔ ہر بار جب بھی وزیروں نے یہ ہمت کی کہ بوناپارٹ کے اپنے ڈھکوسلوں کو قانونی شکل دینے کی ڈھکی چھپی کوشش کریں، تبھی یہ معلوم ہوا کہ وہ اپنی مرضی کے بغیر، صرف پوزیشن کی مجبوری سے مسخرے پن کے حکم بجا لانے کی ایسی حرکت کر رہے ہیں جس کی ناکامی کا انہیں پہلے سے یقین ہے۔ ہر بار جب بوناپارٹ نے وزیروں کی پیٹھ پیچھے اپنے نیت کے پٹ کھولے، اور «Idées napoléoniennes» (نپولینی نکات) (۸۸) بگھارنے شروع کئے، اس کے وزیروں نے قومی اسمبلی کے پلیٹ‌فارم سے اسے پیٹھ دکھا دی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی غاصبانہ تمناؤں کا اظہار ہی اس لئے کرتا ہے تاکہ مخالفین اپنا زہر خند ضبط نہ کر سکیں۔ وہ ایسے چھپے رستم کی طرح پیش آ رہا تھا جس کے کمال ذہانت کو لوگوں نے پہچانا نہیں اور دنیا ایک سادہ‌لوح سمجھی۔ سارے طبقوں نے کبھی اس کو ایسی گری ہوئی نظر سے نہیں دیکھا تھا جیسے اس دور میں۔ بورژوازی نے کبھی ایسی من مانی نہیں کی تھی؛ اس نے کبھی اتنی بےشرمی سے اپنی طاقت یا غلبے کی نمائش نہیں کی تھی۔

میرا یہ فرض نہیں ہے کہ بورژوازی کی قانون سازی کی تاریخ بیان کروں جو اس دور میں دو قانونوں کے اندر سمٹ آئی ہے: ایک قانون جس سے شراب پر آبکاری ٹیکس پھر لگایا گیا، دوسرا قانون‌تعلیم جس کے ذریعے بے عقیدگی کا حق مٹا دیا گیا۔ اگر شراب کے ٹیکس نے فرانسیسیوں کی مشکلات بڑھادیں تو بورژوازی نے فراخ دلی سے پاکیزہ زندگی کے دریا بھی بہا دئے۔ اگر شراب پر ٹیکس لگا کر بورژوازی نے یہ جتایا کہ فرانس کا پرانا نفرت‌انگیز ٹیکس سسٹم اٹوٹ ہے تو ساتھ میں تعلیم کے قانون سے یہ بھی کوشش کی کہ عوام میں وہی پرانی ذہنی حالت باقی رکھی جائے جو انہیں یہ سسٹم برداشت کرنے کی تعلیم دیتی ہے۔ تعجب کی بات ہے کہ اورلین‌والے جو آزاد خیال بورژوا ہیں، والتیر اور eclectic فلسفے کے پرانے سجادہ‌نشین ہیں، وہ اپنے موروثی دشمنوں، یسوعیوں کو فرانسیسیوں کی روحانی ہدایت کا کام کیسے سپرد کر سکتے ہیں۔ لیکن دیکھا

جائے تو اورلین اور جائزوارث والے دونوں ، اگرچہ تخت کی دعویداری میں ایک دوسرے سے بڑا اختلاف رکھتے ہیں ، تاہم اتنا ضرور سمجھتے ہیں کہ ان کے مشترکہ غلبے کے لئے دباؤ کے وہ سب ذریعے سلانے ضروری ہیں جو دونوں دوروں میں استعمال ہوئے ، جولائی کی بادشاہت کے دور میں لوگوں کو قابو میں رکھنے کی جو تدبیریں اختیار کی گئیں ، ان میں وہ تدبیریں ، وہ صورتیں بھی ملانی اور دوآتشہ کرنی ہوں گی جن سے ''بحالی کے دور،، میں کام لیا گیا تھا۔

کسانوں کی ساری امیدوں پر پانی پھر گیا۔ ایک تو اناج کے بھاؤ پہلے سے کہیں زیادہ گرے ، دوسرے لگان بڑھا ، رهن رکھی ہوئی زمینوں پر قرضے کا بوجھ بڑھا ، تو مختلف دیہی حلقوں (ڈپارٹمنٹوں) میں بےچینی کے آثار نظر آنے لگے۔ ان کو جواب یہ ملا کہ اسکول ماسٹروں کو تو مذہبی اداروں کا پابند کر دیا گیا ، حلقے کے چیرمین کو پولیس پریفیکٹ کا ، اور جاسوسی کا نظام آخر اتنا پھیلایا کہ سبھی اس کی زد میں آ گئے۔ پیرس اور دوسرے بڑے شہروں میں رجعت‌پرستی اپنے دور کی چھاپ لگاتی پھرتی ہے اور لوگوں کو دبانے سے زیادہ ان پر اپنا رعب‌داب قائم کر رہی ہے۔ دیہات میں اس نے مکروہ ، نیچ ، گھٹیا، گھناونی، مختصر یہ کہ ژنداریی (سیاسی پولیس) کی شکل اختیار کر لی ہے۔ سمجھ میں آتا ہے کہ تین سال تک پولیس کی لاٹھی ڈنڈے کا بندوبست ، جس میں پادریوں کا مقدس حکم بھی چلتا ہے ، ادھ کچرے عوام کے حوصلے پست کرنے میں کس قدر کامیاب ہوا ہوگا۔

ضابطہ پارٹی ایک اقلیت کے سامنے چاہے قومی اسمبلی کے پلیٹ‌فارم سے کتنا ہی جوش‌وخروش دکھائے ، ہاتھ پاؤں پٹکے ، لیکن اس کے منہ سے صرف دو بول نکلتے ہیں ، جس طرح مسیحی کی زبان سے : ہاں ، ہاں اور نہیں نہیں ! اسٹیج سے بھی یہی دو بول زبان پر آتے ہیں اور اخبار میں بھی، بالکل اس پہیلی جیسے بےلطف بول ، جس کا جواب پہلے سے معلوم ہوتا ہے۔ چاہے عدالت میں اپیل کرنے کے حق کی گفتگو ہو، یا شراب پر ٹیکس کی، پریس کی آزادی کا سوال ہو ، یا تجارت کی آزادی کا ، کلب کے حق کا معاملہ ہو یا میونسپلٹی

کے اختیار کا، ذاتی آزادی کا ہو، یا سرکاری بجٹ کی باقاعدگی کا، ہمیشہ سب کے جواب میں ایک ہی ہلول (شنا ختی لفظ) زبان پر چڑھا ہے، موضوع وہی ایک رہتا ہے، سب کو ایک ہی فیصلے کی لاٹھی سے ہانکا جاتا ہے اور یہ لاٹھی پہلے سے تیار ہے کہ "سوشلزم!"۔ بورژوائی لبرل ازم (آزاد خیالی) تک کو سوشلزم کہہ دیا جاتا ہے، بورژوائی روشن خیالی ہے تو اس کو سوشلزم کا نام اور بورژوائی مالیاتی اصلاح ہے تو اس پر سوشلزم کا الزام۔ یہ بھی سوشلزم ہوا کہ جہاں نہر موجود ہے، وہاں ریلوے لائن بنائی جائے، اور یہ بھی سوشلزم کہ جب تلوار سے حملہ ہو تو آدمی لاٹھی سے اپنا بچاؤ کرے۔

یہاں نہ تو محض لفاظی تھی، نہ فیشن، نہ پارٹی بازی کا داؤپیچ۔ بورژوازی خوب سمجھ رہی تھی کہ قسم قسم کے وہ ہتھیار جو اس نے جاگیرداری کے مقابلے میں ڈھالے تھے، اپنی دھار سمیت خود اسی پر پلٹ پڑے ہیں، روشن خیالی کے جتنے ذریعے اس نے ایجاد کئے تھے، وہ خود اسی کی تہذیب سے پھر گئے ہیں، جتنے دیوتا سجائے تھے، وہ اسی سے منہ موڑ چکے ہیں۔ بورژوازی نے سمجھ لیا تھا کہ وہ جنھیں شہری آزادی اور ترقی کے اداروں کا نام دیا گیا تھا وہی اس کے طبقاتی غلبے کی جان کے لاگو ہوگئے تھے، سماجی بنیادوں کی طرف سے بھی اور سیاسی چوٹی کی طرف سے بھی خطرہ بن گئے تھے۔ اور اسی لئے ان میں "اشتراکیت کی بو" آ گئی تھی۔ اس خطرے میں اور مصیبت کی حالت میں بورژوازی نے سوشلزم کا راز پالیا، وہ اس کے باطن اور اس کے مزاج کو زیادہ صحیح سمجھی بہ‌نسبت اس نام نہاد سوشلزم کے جو اپنا ٹھیک اندازہ نہیں کر پاتا اور اسی وجہ سے یہ نہیں سمجھ پاتا کہ اگرچہ وہ انسانی مصائب کی نوحہ خوانی بھی کرتا ہے، ہزار سالہ دور حکومت کی مسیحی پیش گوئی اور برادرانہ محبت کرنے کی مسیحی تعلیم بھی یاد دلاتا ہے، انسانی روح، تعلیم، آزادی کی انسانیت بھری باتیں بھی بگھارتا ہے اور سارے طبقوں کے میل ملاپ اور فلاح‌وبہبود کے خیالی نظاموں کی تبلیغ بھی کئے جاتا ہے — پھر بھی بورژوازی جب دیکھتی ہے، اسے دشمن کی نظر سے دیکھتی ہے۔ ایک بات جو بورژوازی نہیں سمجھی،

وہ تھا منطقی انجام کہ اب اس کی اپنی پارلیمنٹری حکومت پر اور عام طور سے اس کے سیاسی اختیارات پر بھی وہی سزا کا فرمان جاری ہوگا کہ ان سے ’’ سوشلزم کی بو ،، آتی ہے۔ جب تک کہ بورژوا طبقے کی حکومت نے پوری طرح پاؤں نہیں جمائے تھے ، جب تک اس نے اپنا سیاسی رنگ روپ نہیں نکالا تھا ، اس وقت تک بورژوازی سے دوسرے طبقوں کی کاٹ بھی کھل کر سامنے نہیں آسکتی تھی ، اور جہاں یہ لاگ ڈانٹ سامنے آئی بھی ، وہاں ایسے خطرناک موڑ تک نہیں پہنچ سکی جہاں سرکاری طاقت کے مقابلے پر ہر ایک جدوجہد بالآخر سرمائے کے خلاف جدوجہد بن جاتی ہے۔ اگر سماج میں زندگی کی ہر ایک لہر کو اس نے ’’ امن سکون ،، کےلئے خطرہ سمجھا تھا تو اب وہ کس منہ سے یہ چاہتی تھی کہ سماج کے سر پر بےچینی کی حکومت قائم رہے ، اس کا اپنا سرکاری بندوبست ، یعنی پارلیمنٹری حکومت ، جس کے بارے میں بورژوازی کے ہی ایک مقرر کا قول ہے کہ وہ کش‌مکش میں جیتی ہے اور کش‌مکش کے دم سے اس کی زندگی قائم رہتی ہے۔ پارلیمنٹری حکومت بحث مباحثے کے دم سے ہے تو بحث مباحثے کی ممانعت کیسے کرے ؟ ہر مصلحت ، ہر مفاد ، ہر ایک سماجی تدبیر یہاں ایک عام خیال کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور یہ خیال زیربحث آتا ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ مصلحت ، مفاد یا تدبیر خیال کی سطح سے اوپر اٹھ کر عقیدے یا ایمان کا جزو بن جائے۔ اسٹیج سے جو تقریری مقابلے ہوتے ہیں ، وہ اخباری کالم نگاروں کے درمیان رسہ‌کشی کا سامان کرتے ہیں ، پارلیمنٹ کے مباحثہ کلب سے بیٹھکوں اور شراب‌خانوں کے مباحثہ کلب جڑے ہوئے ہیں ؛ وہ نمائندے جو رائے عامہ سے مستقل اپیل کیا کرتے ہیں ، رائےعامہ کو یہ حق بھی دیتے ہیں کہ وہ عدالتی اپیلوں میں خود کو جوں کا توں ظاہر کرے۔ پارلیمنٹری طرز حکومت ہر فیصلے کو اکثریت پر چھوڑتا ہے — پھر وہ زبردست اکثریت جو پارلیمنٹ سے باہر موجود ہے ، فیصلہ صادر کرنا کیوں نہ چاہے ؟ اگر آپ راج پاٹ کی چوٹی پر سے بانسری بجا رہے ہیں تو پھر کیا تعجب اگر نیچے کھڑے ہوئے لوگ بانسری کی لے پر ناچنا شروع کر دیں ؟

چناں‌چہ وہی چیز جسے بورژوازی کبھی "لبرل‌ازم" یا آزاد خیالی کہہ کر سراہتی تھی، اب اسے "سوشلزم" کا نام دھر کر دراصل اس بات کا اقرار کرتی ہے کہ ذاتی مصلحت کا تقاضا ہے کہ اسے خود اپنے ہی پرچھانوے سے بچایا جائے؛ یہ کہ ملک میں امن‌چین بحال کرنے کی خاطر سب سے مقدم ہے کہ اس کی بورژوا پارلیمنٹ کو چین سے بٹھایا جائے؛ یہ کہ اس کی سماجی حکمرانی کو صحیح سالم رکھنے کے لئے لازم ہے کہ اس کی سیاسی حکمرانی توڑی جائے؛ الگ الگ بورژوا دوسرے طبقوں کا استحصال کرتے رہیں اور اپنی نجی ملکیت، خاندان، مذہب اور قاعدہ قانون میں بغیر کسی خرخشے کے مگن رہیں صرف اس شرط پر کہ دوسرے طبقوں کے ساتھ طبقے کی حیثیت میں خود بورژوازی کو بھی سیاسی طور پر صفر کر دیا جائے؛ یہ کہ اپنی تجوری بچانے کی خاطر اس سے تاج چھین لیا جائے اور جو تلوار اپنی حفاظت کےلئے تھی وہی اب اس کے سر پر ڈیموکلس کی تلوار کی طرح لٹکتی رہے۔

عام شہریوں کے مشترکہ معاملات میں قومی اسمبلی نے اس قدر بےعملی کا ثبوت دیا کہ مثلاً ایک سوال درپیش تھا پیرس اور اوی‌نیون کے درمیان ریلوے لائن بچھانے کا، ۱۸۵۰ء کی سردیوں میں اس پر غور شروع ہوا اور دوسری دسمبر ۱۸۵۱ء تک کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ جہاں اسمبلی کو جبر سے، رجعت‌پرستی سے کام نہیں لینا تھا وہاں اس کا بانجھ‌پن ناقابل علاج بن گیا۔

اس وقت جب بوناپارٹ کی وزارت کچھ تو ضابطہ پارٹی کے منشا سے قانون بنانے میں پہل کر رہی تھی اور کچھ ان قانونوں کی تعمیل میں اور بھی زیادہ سخت گیری سے کام لے رہی تھی، خود بوناپارٹ اس کوشش میں تھا کہ بچکانہ تجویزوں کے ذریعے ہر دل‌عزیزی حاصل کرے اور قومی اسمبلی سے اپنے عناد کو ابھار کر وہ یہ اشارے کئے جا رہا تھا کہ کوئی پوشیدہ خزانہ موجود ہے، صرف حالات اجازت نہیں دے رہے کہ اس پوشیدہ خزانے کی مہر توڑ کر فرانسیسی قوم پر لٹا دے۔ یہ اشارہ اس طرف ہے کہ بوناپارٹ نے تجویز رکھی تھی بے‌کمیشن افسروں کی تنخواہ میں چار sou (سکہ) روزانہ بڑھانے

کی اور مزدوروں کے لئے ایسے بینک کھولنے کی جو صرف اعتبار پر قرضہ دیا کریں۔ تحفے میں روپیہ اور قرضے میں نقدی یہ تھے وہ سبز باغ، جنھیں دکھا کر وہ عام لوگوں کو للچانے کی سوچ رہا تھا۔ تحفے میں دو، قرضے میں دو، آوارہ گرد لوگوں (lumpenproletariat) کا سارا مالیاتی ہنر اسی میں ہے، چاہے وہ عام ہوں یا خاص۔ بوناپارٹ کو اسی قسم کے دریا بہانے کا ہنر آتا تھا۔ حکومت کے کسی دعویدار نے ہجوم عام کے گھٹیاپن سے کبھی اتنا گھٹیا سودا کیا ہو، ایسی کوئی مثال نہیں ملتی۔

قومی اسمبلی کو کئی بار جلال آیا کہ بوناپارٹ اسے نظروں سے گرا کر اپنی مقبولیت بنانے کی پکی کوششیں کر رہا ہے۔ اور یہ خطرہ بڑھتا جارہا ہے کہ اس جیسا داؤ پر سب کچھ لگا دینےوالا، جسے اپنے قرضے چکانے کی فکر ہے اور پہلے کی کوئی ایسی ساکھ نہیں جن کا لحاظ کر جائے، اسے کیا دیر لگتی ہے کہ آنکھ بند کرکے کوئی بڑا فتنہ اٹھا دے۔ ضابطہ پارٹی اور پریسیڈنٹ کے درمیان یہ چپقلش خطرے کی حدوں کو چھو رہی تھی کہ اتنے میں ایک اچانک واقعہ ہو گیا جس سے وہ مجبوراً لپک کر پھر اسی پارٹی کی بانہوں میں پہنچا۔ یہ واقعہ تھا — ۱۰ مارچ ۱۸۵۰ء کے ضمنی الکشن۔

۱۳ جون کے بعد پارلیمنٹ کے جو ممبر جیل میں گئے یا جلاوطن ہو گئے، ان کی خالی جگہوں کو بھرنے کےلئے یہ الکشن ہوئے تھے۔ پیرس نے صرف سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کے امیدوار چنے۔ اس کے علاوہ شہر کے زیادہ تر ووٹ جون ۱۸۴۸ء کی بغاوت کے خاص آدمی دفلوت کو ملے۔ اس طرح سے پرولتاریہ سے مل کر پیرس کی چھوٹی بورژوازی نے ۱۳ جون ۱۸۴۹ء کی شکست کا بدلہ لے لیا۔ یوں نظر آیا جیسے چھوٹے کاروباری لوگ خطرے کے وقت مقابلے کے میدان سے غائب ہو گئے تھے صرف اس غرض سے کہ جب حالات سازگار ہوں تو وہ پھر اور زیادہ جنگی طاقت کے ساتھ، زیادہ بامعنی جنگی نعروں کے ساتھ میدان میں اتر آئیں۔ ایک اور پہلو ایسا تھا جس نے الکشن کے نتیجے کی یہ خطرناک حیثیت اور بھی شدید کر دی: وہ یہ کہ پیرس میں فوج نے جون کے باغی کے حق میں اور بوناپارٹ کے

منسٹر لاھیت کے خلاف ووٹ دئیے۔ دیہاتی حلقوں (ڈپارٹمنٹوں) میں جو ووٹ پڑے ان میں بھی، اگرچہ پیرس کی طرح بہت بڑے فرق سے نہیں، تاھم ''مونٹین،، پارٹی کے امیدواروں کو، فریق مخالف کے سامنے اکثریت حاصل ہوئی۔

اچانک بوناپارٹ نے دیکھا کہ اسے پھر انقلاب کا سامنا ھے۔ ۲۹ جنوری ۱۸۴۹ء کی اور ۱۳ جون ۱۸۴۹ء کی طرح ۱۰ مارچ ۱۸۵۰ء کو بھی وہ ضابطہ پارٹی کی اوٹ میں ھو گیا۔ ٹھنڈا پڑ گیا، دبک کر معذرت کرنے لگا اور اس پر آمادگی ظاھر کی کہ پارلیمنٹ کی اکثریت جیسی کہے، ویسی وزارت بنادی جائے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ اورلین اور جائزوارث دونوں گروھوں کے لیڈروں سے، جن میں تیئر، بیریئے، برولی اور سولے قسم کے لوگ تھے جنھیں بورگ گراف (چودھری) (۸۹) کہنا چاھئیے، اس نے التجا کی کہ وہ خود ریاست کا سارا کاروبار سنبھال لیں۔ ضابطہ پارٹی اس اچھوتے موقع کا فائدہ اٹھانے میں ناکام رھی۔ بجائے اس کے کہ وہ ھمت کر کے طاقت اپنے ھاتھ میں لے لیتی، اس سے یہ بھی نہ ھو پایا کہ بوناپارٹ سے پہلی نومبر کو برخاست کی ھوئی وزارت پھر بحال کرا دیتی۔ وہ اتنے میں ھی راضی ھو گئی کہ معافی دے کر اس کی گردن نیچی کر دی اور دی اپول کی وزارت میں جنرل بروش کو بھی لگا دیا۔ یہ بروش وھی شخص تھا جس نے وکیل سرکار کی حیثیت میں پہلے تو ۱۵ مئی کے انقلابیوں پر، بعد میں ۱۳ جون کے ڈیموکریٹوں پر یہ الزام لگایا کہ وہ قومی اسمبلی کی جان کے دشمن ھیں اور بورژے ھائی کورٹ کے سامنے بہت زور بیان دکھایا تھا۔ بعد میں بوناپارٹ کی وزارت کے کسی ایک منسٹر نے بھی قومی اسمبلی کو اتنا نہیں گرایا جتنا بروش نے۔ دوسری دسمبر ۱۸۵۱ء کی تاریخ کے بعد جب ھمیں نظر آتا ھے تو وہ سنیٹ کے نائب صدر کی اونچی کرسی پر، اونچی تنخواہ کے ساتھ برا جمان ھے۔ اس نے انقلابیوں کے شوربے میں تھوک دیا تاکہ ان سے بچے اور بوناپارٹ چٹ کر جائے۔

سوشل ڈیموکریٹک پارٹی گویا اپنی طرف سے برابر اس موقع کی تلاش میں رھی کہ اپنی جیت کو پھر شبہ میں ڈالے اور اس کی

معنویت پھر کم کرے۔ پیرس میں سے جو ممبر چن کر آئے ان میں ایک ویدل نام کا شخص تھا جو استراسبورگ کے حلقے سے بھی چنا گیا۔ اسے کہہ سن کر راضی کیا گیا کہ پیرس کی جیتی ہوئی سیٹ چھوڑ کر استراسبورگ کی سیٹ چن لے۔ یوں، بجائے اس کے کہ الکشن میں جو فتح نصیب ہوئی تھی اسے قطعی حیثیت بناکر ضابطہ پارٹی کو پارلیمنٹ میں مقابلے پر للکارا جاتا، بجائے اس کے کہ فریق مخالف کو ایسے وقت جب اس کی کور دبی ہوئی تھی، لوگوں میں ہمدردانہ جوش اور فوج میں خوشگوار موڈ تھا، ٹکر لینے پر مجبور کیا جاتا، سوشل ڈیموکریٹک پارٹی نے پیرس کو مارچ اپریل کے مہینوں میں پھر نئی الکشنی سرگرمی سے تھکا مارا۔ لوگوں میں جو جذبہ ابھار پر تھا اسے دو دو بار کے عارضی انتخابات کے ہنگامے میں لگاکر سرد کر دیا، انقلابی طاقت کو آئینی فتح سے اکتا دیا، چھوٹی تکڑموں میں، کھوکھلی تقریربازی میں اور دکھاوے کی تحریک میں اسے خارج کر دیا، بورژوازی کو مہلت دے دی کہ وہ پھر سے صف‌بندی کرکے تیار ہو جائے اور آخری بات یہ کہ آیژین‌سیو حلقے میں اپریل کے ضمنی انتخاب کراکے جذباتی رائےزنی سے مارچ کے انتخابات کی اہمیت کو ضائع کر دیا۔ یوں کہنا چاہئے کہ دسویں مارچ کو ہی اس پارٹی نے اپریل فول منا لیا۔

پارلیمنٹ کی اکثریت نے فریق مخالف کی اس کمزوری کو بھانپ لیا۔ ضابطہ پارٹی کے سترہ بورگ‌گراف (چودھریوں) نے ایک نیا انتخابی قانون تیار کیا۔ بوناپارٹ نے اسی پارٹی کو حملہ کرنے کا رخ اور اختیار سونپا تھا۔ اس نئے قانون کا مسودہ پیش کرنے کی ذمہ‌داری مسٹر فوشے کے سپرد ہوئی جو اپنے سر یہ سہرا بندھوانا چاہتا تھا۔ ۸ مئی کو فوشے نے قانون پیش کیا جس کی رو سے عام رائے دھندگی کا حق ختم ہونا تھا، ہر ایک ووٹر کو اپنے حلقۂ انتخاب میں کم سے کم تین سال کی رہائش ثابت کرنی تھی اور مزدوروں کے معاملے میں ثبوت مہیا کرنے کی یہ شرط رکھی گئی کہ ملازمت دینےوالا اس بات کی سند دے۔

وہی ڈیموکریٹ جو آئینی انتخابات کی رسہ‌کشی کے وقت بڑا

انقلابی جوش‌وخروش دکھا رہے تھے ، اب جب کہ اپنی انتخابی جیت کو سنجیدگی کا وزن دینے کے لئے هتهیار اٹھانے کا موقع آیا ، آئینی تبلیغ میں لگ گئے ، باوقار صبر و سکون کی (calme majestueux) تاقین کرنے لگے ، قانونی کارروائی وغیرہ کہنے لگے — یعنی انقلاب کے دشمنوں کی مرضی کے آگے ، جو قانون بن بیٹھی تھی ، آنکھیں موند کر گردن جھکا دی جائے ۔ بحث کے دوران ” سونٹین ،،والوں نے ضابطه پارٹی کو بہت غیرت دلائی اور کہا کہ ایسے انقلابی جوش‌وجذبه کے مقابلے میں تو ان آسائش‌پسندوں کی تن‌آسانی هی بهتر هے جو قانونی دائرے میں رہتے هیں اور اسے ان طعنوں سے مار ڈالا کہ یه پارٹی خواه‌مخواه انقلابی رنگ سے اٹھتی هے ۔ نئے منتخبه ممبروں تک نے کوشش کی که سنبھل کر ، قاعدے قرینے کو ملحوظ رکھ کر چلیں تاکہ ان پر یه الزام ثابت نه هو که وه انارکسٹ هیں اور ان کی جیت میں انقلاب کی فتح هے ۔ ۳۱ مئی کو نیا انتخابی قانون پاس هو گیا ۔ ” مونٹین ،، والوں نے اپنی تسلی کرلی که پریسیڈنٹ کی جیب میں صدائے احتجاج کے پرچے ڈال دئے هیں ۔ انتخابی قانون کے فوراً بعد پریس کا نیا قانون بھی آ گیا ، جس سے انقلابی اخبارات کا بالکل صفایا هوتا تها (۹۰) ۔ وه اس سزا کا مستحق بھی تها ۔ اس غرقابی کے بعد انقلاب کی صرف دو ناکه چوکیاں ره گئیں ، بورژوازی کے دو ترجمان — ایک ” نیشنل ،، ، دوسرا «La Presse» (۹۱) ۔

هم نے دیکھ لیا که مارچ اور اپریل میں ڈیموکریٹک لیڈروں نے کیا کچھ نهیں کیا که پیرس‌والوں کو جهوٹ موٹ کے مقابلے میں الجھائے رکھیں ، اور یهی حرکت انهوں نے ۸ مئی کے بعد کی که لوگوں کو اصلی مقابلے تک جانے سے روکے رکھا ۔ اس کے علاوه یه نه بھولنا چاهئے که ۱۸۵۰ ء صنعتی اور کاروباری خوش‌حالی کا شاندار سال تها ، لهاذا پیرس کا پرولتاریه تمام کا تمام برسر روزگار هو گیا ۔ لیکن ۳۱ مئی ۱۸۵۰ ء کے انتخابی قانون نے اسے سیاسی طاقت میں شریک هونے سے محروم رکھا ، اسے اکھاڑے میں اترنا هی نصیب نه هوا ۔ اس قانون نے مزدوروں کو پھر اسی انقلاب فروری سے پہلے کا اچھوت (pariah) بنا ڈالا ۔ اتنا بڑا واقعه مزدوروں کے سامنے هو گیا لیکن

ڈیموکریٹک لیڈروں کے ہاتھ رہنمائی تھی تو وہ اپنے طبقے کے انقلابی تقاضے کو وقتی آسائش کی خاطر بھلا بیٹھے، ایک فاتح قوت بننے کے مرتبے سے پھر گئے، اپنی تقدیر پر صابروشاکر ہو گئے اور یہ ثابت کرنے لگے کہ جون ۱۸۴۸ ء کی شکست نے انھیں آئندہ کئی سال کے لئے ٹھنڈا کر دیا ہے اور اب کچھ عرصے تاریخی عمل ان کے پہلو سے گزرتا رہے گا۔ جہاں تک چھوٹی حیثیت کی بورژوا جمہوریت پسندی کا تعلق ہے جو ۱۳ جون کو گلا پھاڑ کر کہتی تھی: ''زرا عام رائے دھندگی کے حق کو چھیڑ کر دیکھو، تب ہم دکھا دیں گے کہ کیا ہوتا ہے!،، اب اس پر راضی ہو گئی کہ یہ چوٹ جو انقلاب کے مخالفین نے لگائی ہے یہ کوئی چوٹ نہیں، ۳۱ مئی کا قانون کوئی قانون نہیں۔ مئی ۱۸۵۲ ء کا دوسرا اتوار آتے ہی ہر ایک فرانسیسی اپنے اپنے ووٹ کے ٹھکانے پر پہنچ جائے گا، ایک ہاتھ میں ووٹ کی پرچی، دوسرے میں تلوار۔ اس پیغمبرانہ پیش گوئی پر تکیہ کرکے وہ بیٹھ گئی۔ جس طرح ۲۸ مئی ۱۸۴۹ ء کے الکشن پر ہو چکا تھا، مارچ اور اپریل ۱۸۵۰ ء کے الکشنوں کے بعد بھی افسروں کے ہاتھ سے فوج پر سخت گزری۔ مگر اس دفعہ فوج نے دل میں ٹھان لی: ''اچھا، تیسری بار ہم انقلاب کے بہکاوے میں نہیں آنے والے،،۔

۳۱ مئی ۱۸۵۰ ء کا قانون کیا تھا، بورژوازی نے اندر سے حکومت کا تختہ الٹا تھا۔ آج تک اسے انقلاب پر جتنی فتوحات ملی تھیں وہ سب عارضی حیثیت کی تھیں۔ جیسے ہی موجودہ قومی اسمبلی منظر سے اوجھل ہوتی، ان فتوحات کا وجود خطرے میں پڑ جاتا۔ صرف اس پر دارومدار رہ جاتا کہ اگلے عام الکشن کیا آفت مچاتے ہیں۔ اور ۱۸۴۸ ء سے ہی الکشنوں کی تاریخ دوٹوک ثبوت دیتی تھی کہ عام لوگوں پر بورژوازی کا اخلاقی اثر اتنا ہی کمزور ہوتا جا رہا ہے جتنا اس طبقے کا غلبہ اور اختیار بڑھتا جا رہا ہے۔ ۱۰ مارچ کو عام رائے دھندگی نے بورژوازی کی حکمرانی کے خلاف کھرا فیصلہ سنا دیا۔ بورژوازی نے اس کا توڑ یہ کیا کہ عام رائے دھندگی کا حق ہی قانون باہر کر دیا۔ چناں چہ ۳۱ مئی ۱۸۵۰ ء کا قانون طبقاتی

ٹکراؤ کا ایک لازمہ تھا۔ مگر دوسری طرف آئین میں یہ شرط بھی موجود تھی کہ کم از کم بیس لاکھ ووٹ ملیں تب ریبلک کے پریسیڈنٹ کا چناؤ مانا جائے گا۔ اگر امیدواروں میں سے کسی ایک کو ووٹوں کی یہ کم از کم تعداد نہ مل سکے تو قومی اسمبلی کا فرض ہے کہ جن پانچ امیدواروں نے سب سے زیادہ ووٹ حاصل کئے ہوں ان میں سے کسی ایک کو پریسیڈنٹ چن لے۔ جس وقت آئین ساز اسمبلی نے یہ قانون وضع کیا ووٹروں کی فہرست پر ایک کروڑ نام درج تھے۔ آئین ساز اسمبلی نے خیال کیا کہ ووٹ کا حق رکھنےوالوں میں سے بیس فیصدی کی تائید پریسیڈنٹ کے چناؤ کو حق بجانب کرنے کے لئے کافی ہے۔ ۳۱ مئی کے قانون نے کم از کم تیس لاکھ کو ووٹروں کی فہرست سے خارج کر دیا۔ اب ووٹ دینےوالے صرف ستر لاکھ رہ گئے۔ پھر بھی پریسیڈنٹ کے چناؤ کے لئے وہی بیس لاکھ ووٹ کی قانونی شرط باقی رکھی گئی۔ اس حساب سے، پڑنےوالے ووٹوں کے پانچویں حصے کی شرط کے بجائے اب پورے ایک تہائی کی قانونی شرط لگ گئی۔ یعنی اس قانون نے سب جتن کر لئے کہ پریسیڈنٹ کا انتخاب عوام کے قبضۂ قدرت سے نکل کر قومی اسمبلی کی مٹھی میں آجائے۔ اس طرح یہ نظر آیا کہ ضابطہ پارٹی نے ۳۱ مئی کے انتخابی قانون کے ذریعہ اپنی گرفت دوگنی مضبوط کرلی کہ اسمبلی کے ممبروں اور ریبلک کے پریسیڈنٹ، دونوں کے انتخاب کا اختیار سماج کے ایک جگہ اٹکے ہوئے حصے کو بخش دیا۔

۵

ابھی انقلابی بحران گزرا ہی تھا، عام رائے دہندگی کا حق ابھی واپس ہی لیا گیا تھا کہ اتنے میں قومی اسمبلی اور بوناپارٹ کے درمیان کشمکش پھر زور پکڑ گئی۔

آئین نے بوناپارٹ کی تنخواہ چھ لاکھ فرانک منظور کی تھی۔ مسندصدارت پر آئے ہوئے چھ مہینے گزرے ہوں گے کہ اس نے تنخواہ دو گنی کرا لی۔ کیوں کہ اودی‌لوں بارو نے آئین ساز اسمبلی سے یہ منظوری حاصل کر لی کہ چھ لاکھ فرانک سالانہ نمائندگی کے

خرچ کے نام پر بڑھا دیا جائے۔ ۱۳ جون کے بعد سے بوناپارٹ اس قسم کی منظوری طلب کئے جا رہا تھا لیکن اس دفعہ بارو نے کچھ چوں چرا نہیں کی۔ اب ۳۱ مئی کے بعد اس نے فوراً مناسب موقع سے فائدہ اٹھایا اور اپنے وزیروں سے کہا کہ قومی اسمبلی میں تیس لاکھ کی رقم اسٹاف کے خرچ کے لئے تجویز کریں۔ ایک زمانے تک قسمت آزمائی کے لئے بھٹکتے پھرنے سے اس کی وہ حس تیز ہو گئی تھی جو کمزور لمحہ سونگھ کر بتادے کہ اب بورژوازی سے روپیہ اینٹھا جا سکتا ہے۔ بار بار اس نے دباؤ ڈال کر کام نکالا۔ قومی اسمبلی نے بوناپارٹ کی مدد سے اس مجرمانہ شرکت سے ہی عوام کے اقتدار اعلا پر ہاتھ ڈالا تھا۔ اس لئے اب وہ دھمکی دیتا تھا کہ یا تو تجوری کھول کر تیس لاکھ فرانک سالانہ میں میری خاموشی خریدو، ورنہ میں عوام کی عدالت میں اس جرم کا بھانڈا پھوڑتا ہوں۔ اسمبلی نے تیس لاکھ فرانسیسیوں کا حق رائے دھندگی مار لیا تھا، لہازا اب اس کی دھمکی یہ تھی کہ الکشن کے دائرے سے باہر نکلنے والے ہر ایک فرانسیسی کے بدلے دائرے (گردش) میں رہنے والے ایک فرانک کا سودا کیا جائے، اس طرح تیس لاکھ بنتے ہیں۔ وہ شخص جسے ساٹھ لاکھ آدمی نے چنا تھا اب ان ووٹوں کا ہرجانہ طلب کر رہا تھا جو ملنے تھے مگر نہیں ملے۔ قومی اسمبلی کے کمیشن نے اس گستاخ کا ہاتھ جھٹک دیا۔ بوناپارٹ کے حامی اخبار دھمکیوں پر اتر آئے۔ قومی اسمبلی کو اتنی ہمت کہاں تھی کہ رپبلک کے پریسیڈنٹ سے ایسے وقت میں رشتہ توڑ لیتی جب وہ اصولی طور پر قوم کے عام لوگوں سے بھی رشتہ توڑ بیٹھی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ اس نے سالانہ خرچ میں اضافہ نامنظور کر دیا لیکن ساتھ ہی اس بار کے لئے ۲۱ لاکھ ۶۰ ہزار الاؤنس کی منظوری بھی دے دی۔ چناں چہ ایک ہی ہاتھ میں اس نے دو دو کمزوریاں ظاہر کر دیں، ایک تو رقم کی منظوری دی، دوسرے اپنی ناگواری سے ظاہر کیا کہ مرضی کے خلاف یہ منظوری دی ہے۔ آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ بوناپارٹ کو یہ رقم کس غرض سے درکار تھی۔ عام رائے دھندگی کا حق چھینے جانے کے فوراً بعد جو یہ بدمزگی کا تماشا ہو گیا، جس میں بوناپارٹ نے

مارچ اپریل کے سنکٹ کے وقت اپنے مصالحت‌آمیز رویے کے بدلے اب ووٹروں کا حق مارنےوالی پارلیمنٹ سے دھاندلی برتی، قومی اسمبلی نے اپنا اجلاس ۱۱ اگست سے ۱۱ نومبر تک تین مہینے کےلئے ملتوی کر دیا۔ اپنی جگہ کام کرنے کو ۲۸ ممبروں کا ایک مستقل کمیشن بٹھا دیا جس میں بوناپارٹ کا ایک بھی حامی نہیں تھا بلکہ چند اعتدال پسند رپبلکن شامل تھے۔ ۱۸۴۹ء میں جب مستقل کمیشن بٹھایا گیا تھا تو اس میں ضابطہ پارٹی‌والے بھی تھے اور بوناپارٹ کے حامی بھی۔ تب تو ضابطہ پارٹی نے خود کو انقلاب کا مستقل مخالف قرار دیا تھا۔ اس بار پارلیمنٹری رپبلک نے پریسیڈنٹ سے اپنی مستقل مخالفت ظاہر کر دی۔ ۳۱ مئی کے قانون کے بعد ضابطہ پارٹی کے سامنے بس یہی ایک حریف رہ گیا تھا۔

جب قومی اسمبلی کا اجلاس نومبر ۱۸۵۰ء میں پھر شروع ہوا تو یہ معلوم ہونے لگا کہ اس معمولی چپقلش کے بجائے، جو پریسیڈنٹ اور اسمبلی میں رہ چکی ہے، اب بڑے معرکے کا وقت آ گیا ہے اور دونوں طاقتوں میں وہ جی توڑ مقابلہ ہو کر رہےگا جس کا خاتمہ موت پر ہوتا ہے۔

۱۸۴۹ء کی طرح اس بار بھی یہی ہوا کہ پارلیمنٹ کی سالانہ تعطیل کے زمانے میں ضابطہ پارٹی الگ الگ ٹکڑیوں میں بٹ گئی، ہر ایک اپنے بادشاہ کی بحالی کے لئے جوڑ توڑ کرنے لگی۔ لوئی فلپ کی موت نے جانشینی کے دعووں میں اور جان ڈال دی تھی۔ جائزوارث (Legitimist) والے بادشاہ ہنری پنجم نے تو ایک وزارت بھی نامزد کر دی جو پیرس میں مقیم تھی اور اس میں مستقل کمیشن کے ممبروں کے لئے بھی جگہ رکھی گئی۔ بوناپارٹ کو یہ حق تھا کہ وہ دیہی حلقوں (ڈپارٹمنٹوں) کے دورے کرے، اور جس شہر کو وہ اپنی آمد کا شرف بخشے اس کے تیور دیکھتے ہوئے ڈھکے چھپے یا صاف لفظوں میں خود اپنی بحالی کے منصوبے، خود اپنے حق میں رائے حاصل کرنے کے مشورے زبان پر لائے۔ ان دوروں کے موقع پر، جنھیں سرکاری نقیب قسم کے اخبار «Moniteur» ("مونیتر") نے اور بوناپارٹ کے چھوٹے موٹے ذاتی اعلانچیوں نے شاندار شاہی جلوس کا لقب دے رکھا تھا، ہمیشہ "۱۰ دسمبری سوسائٹی" کے ممبر سائے کی طرح

ساتھ چلتے تھے۔ یہ سوسائٹی ۱۸۴۹ء میں ابھری تھی۔ سماج کی بھلائی کرنے کے نام سے پیرس کے آوارہ گردوں کو اکٹھا کیا گیا تھا، ان خفیہ سوسائٹیوں کے سرغنہ بوناپارٹ کے ایجنٹ ہوتے تھے اور ان سب کا بڑا سالار بوناپارٹ کا ایک جنرل مقرر ہوا تھا۔ ایسے تھکے ہوئے شرابیوں کے ساتھ، جن کا نہ کوئی مستقل ٹھکانا ہوتا ہے، نہ اتہ پتہ، نہ آمدنی کا مستقل ذریعہ، بورژوازی کے گرے پڑے لوگوں کے ساتھ جو منچلے یا بگڑے دل ہو جاتے ہیں، اس سوسائٹی میں شہر کے آوادہ گرد، فوج سے نکلے ہوئے، پکے سزا یافتہ، بھاگے ہوئے تڑی‌پار، چورا چکے، جعل ساز، lazzaroni (سوالی) (۹۲) جیب کترے، مداری، جواری، ڈیرہ‌دار، قحبہ خانے چلانےوالے، سامان ڈھونےوالے، قلم گھسیٹ، شعبدہ‌باز، کباڑی، دھار رکھنےوالے، قلعی‌ساز، بھک منگے، غرض کہ وہ بہت سارے فالتو، بے سروپا لوگ جو حالات کے دھکے کھاتے پھرتے تھے اور جنھیں فرانسیسی لوگ la bohéme (اوٹ‌پٹانگ آبادی) کہتے ہیں، وہ بھی اکٹھے ہو گئے۔ اپنے ان عزیزوں رشتہ‌داروں کو جوڑ کر بوناپارٹ نے ''۱۰ دسمبری سوسائٹی،، کی گٹھلی بنائی جو ''سماج کی بھلائی،، کی خدمت انجام دینےوالی تھی۔ خود بوناپارٹ کے نمونے پر اس سوسائٹی کے سارے ممبر اسی فکر میں تھے کہ قوم کے محنت کشوں پر چاہے کیسی بھی گزرے اپنا بھلا کر لیں۔ یہی بوناپارٹ اصلی بوناپارٹ تھا جو آوارہ‌گردوں کا سرغنہ بنا، جس نے اپنی تمناؤں اور مصلحتوں کو صرف یہیں پر عوامی شکل میں ابھرتا پایا، جس نے سارے طبقوں کی ان کترنوں اور چیتھڑوں میں وہ طبقہ تلاش کر لیا جو بے‌حیل حجت اس کا سہارا بنے، یہ تھا وہ بوناپارٹ اپنے اصلی روپ میں۔ وہ پرانا چال‌باز جسے پینے کی لت ہے، وہ قوموں کی تاریخی زندگی کو اور تاریخ کے شاندار نشیب‌وفراز کو بھی مسخرے‌پن کا کھیل سمجھا، بہت ہی گھٹیا سا کھیل۔ اس نے سوچا کہ وہ بھی ایک بہروپیا تماشا ہے جس میں زرق برق لباس، لفظوں اور سج دھج کا طمطراق ادنا درجے کی حرکتوں کے لئے ایک نقاب بن جاتے ہیں۔ چناں‌چہ استراسبورگ کو اس کی سواری چلی تو سوئٹزرلینڈ کا یہ پالتو گدھ نپولین کے

شاہی کی شان سے نکلا۔ بولون میں شان نزول یہ تھی کہ لندن کے کچھ حواریوں پر فرانسیسی وردی منڈھ دی گئی – یہ ہوئے فوج کی جگہ (۹۳)۔ "۱۰ دسمبری سوسائٹی" میں اس نے کوئی دس ہزار پڑے پھرتے لوگ جوڑ رکھے تھے، جنھوں نے عوام کی خانہ پری کر دی، جیسے شکسپیئر کے ڈرامے "گرمیوں کی آدھی رات کا خواب" میں نک بوٹم شیر بن بیٹھتا ہے۔ ایسے وقت جب کہ بورژوازی خود ہی کامیڈی دکھانے چلی تھی، البتہ وہ اس کھیل میں تھی نہایت سنجیدہ، کیوں کہ اس نے فرانسیسی ڈرامے کے سارے آداب ملحوظ رکھے، کوئی قاعدہ نہیں توڑا، کچھ تو اسے دھوکا ہوا اور کچھ خود کو اس دھوکے میں رکھا کہ وہ اپنا پارٹ بڑی شان سے ادا کر رہی ہے، – ایسے میں ایک منچلا، جو کامیڈی کو محض کھیل تماشا سمجھ رہا تھا، ظاہر ہے کہ وہی فتحیاب ہوتا۔ دون کی لینےوالے اپنے حریفوں کو ٹھکانے لگا لینے کے بعد، جب اس نے شاہنشاہی کا جامہ سنجیدگی سے پہن لیا اور نپولین کا روپ دھار کر خود کو اصلی نپولین شمار کر لیا، تب جاکر وہ موقع آیا کہ اس نے دنیا کا جو تصور بنا رکھا تھا، خود اس تصور کا شکار ہو جائے اور اچھا خاصا مسخرا نظر آئے جو پوری دنیا کی تاریخ کو بھولے سے کامیڈی نہیں سمجھے بیٹھا تھا بلکہ اپنی کامیڈی کو پوری دنیا کی تاریخ سمجھنے لگا تھا۔ اشتراکی مزدوروں کےلئے جو حیثیت نیشنل مستری خانوں کی تھی، بورژوائی ریپبلکنوں کے لئے جو حیثیت گشتی گارڈ کی تھی، وہی بوناپارٹ کےلئے "۱۰ دسمبری سوسائٹی" کی تھی جسے اس نے اپنے ڈھب سے پارٹی کی جنگی طاقت شمار کیا تھا۔ جب وہ سفر پر نکلتا تو اس سوسائٹی کے دستے ریلوے اسٹیشنوں پر چلتی پھرتی استقبالیہ پبلک کام دیتے، عوام کا سا جوش‌وخروش ظاہر کرتے، "شہنشاہ زندہ باد!" کے نعرے لگاتے، ریپبلکنوں کے ساتھ بدتمیزی اور مارپیٹ کرتے۔ ظاہر ہے کہ یہ حرکتیں پولیس کے سائے میں کی جاتی تھیں۔ جب پیرس کو واپسی ہوتی تو اسی سوسائٹی کے لوگ پہلے سے ہراول دستے کا کام دیتے، اہتمام کرتے کہ کوئی مخالفانہ مظاہرہ نہ ہونے پائے اور اگر ہو تو اسے توڑ دیا جائے۔ "۱۰ دسمبری سوسائٹی"

اس کی جیب میں پڑی تھی ، اس کی اپنی کرامات تھی ، اس کے اپنے خیال کی ایجاد۔ باقی جس چیز پر بھی اس نے ہاتھ صاف کیا یا اس کے ہاتھ آیا وہ سب حالات کی دین تھی ؛ باقی جو کچھ کیا وہ سب ماحول یا حالات نے کر کے دیا ؛ یا پھر وہ بھی دوسروں کو کرتے دیکھ کر صرف نقل کرنے سے مطمئن ہو گیا۔ بہر حال اس نے برسر عام سرکاری لب‌ولہجہ میں نظم‌وضبط کے متعلق ، مذہب ، خاندان ، نجی ملکیت کے متعلق زبان کھولی اور اندر سے ڈاکوؤں کی اس ٹولی پر تکیہ کیا ، جو بےضابطگی ، چوری اور چھنال پن کی سوسائٹی تھی۔ یہاں بوناپارٹ کا جواب نہیں تھا اور ”۱۰ دسمبری سوسائٹی ،، کی تاریخ خود اس بوناپارٹ کی اپنی تاریخ تھی۔ انہونی بات یہاں تک پہنچی کہ ”۱۰ دسمبری سوسائٹی ،، کی لاٹھیاں برسیں اور ضابطہ پارٹی کے کئی پارلیمنٹری ممبر چوٹ کھا کر گرے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ : پولیس کمشنر یون جسے قومی اسمبلی کی حفاظت کی ذمہ‌داری سپرد تھی ، مستقل کمیشن تک آلے نام کے کسی شخص کی پہنچائی ہوئی اطلاع پر یہ خبر لے کر پہنچا کہ ”۱۰ دسمبری سوسائٹی ،، کے ایک جتھے نے جنرل شنگارنیے اور قومی اسمبلی کے صدر دوپن کو جان سے مار ڈالنے کا فیصلہ کیا ھے اور اس منصوبے کو عمل میں لانے کے لئے آدمی بھی لگا دئے ھیں۔ تصور کیا جا سکتا ھے کہ دوپن کتنا سہم گیا ھوگا۔ ”۱۰ دسمبری سوسائٹی ،، کی پارلیمنٹری تحقیقات ، یا یوں کہئے کہ بوناپارٹ کی خفیہ دنیا کو بےنقاب کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رھا۔ ابھی قومی اسمبلی کا اجلاس کھلنے والا تھا کہ بوناپارٹ نے احتیاط کے مدنظر اپنی یہ سوسائٹی توڑ دی۔ اگرچہ ظاھر ھے کہ یہ کاغذی کارروائی ھوگی کیوں کہ ایک زمانے بعد ۱۸۵۱ء کے آخر میں پولیس پریفیکٹ کارلے نے اپنی تحریری یادداشت میں اسے پھر آمادہ کرنے کی ناکام کوشش کی کہ وہ ”۱۰ دسمبری سوسائٹی ،، کو واقعی توڑ دے۔

”۱۰ دسمبری سوسائٹی ،، بوناپارٹ کی ذاتی فوج کا کام اس وقت تک دیتی رھی جب تک وہ سرکاری فوج کو ”۱۰ دسمبری سوسائٹی ،، بنا دینے میں کامیاب نہیں ھو گیا۔ بوناپارٹ نے پہلی کوشش تو قومی

اسمبلی کا اجلاس ملتوی ہوتے ہی کی اور وہ بھی اس رقم سے جو اسمبلی سے وصول کی گئی تھی۔ جبری عقیدےوالوں کی طرح اسے بھی یہ اعتقاد ہے کہ بعض ایسی اوپر کی طاقتوں کا وجود ہے جن کے سامنے ٹھیرنا انسان، خاص کر فوج کے بس کی بات نہیں۔ ان طاقتوں میں اول تو اس کے نزدیک سگار اور شمپیئن ہے، پھر ٹھنڈی مرغی اور لہسن کے ساتھ سوکھا گوشت۔ لہاذا اس نے شروعات یہاں سے کی کہ فوج کے افسروں اور بے کمیشن افسروں کو یلی سےئی شاہی محل میں دعوتیں دےکر سگار، شمپیئن، ٹھنڈی مرغی اور لہسن کے ساتھ سوکھے گوشت سے نوازنے لگا۔ تیسری اکتوبر کو سین مورے کی معائنہ پریڈ کے وقت فوجیوں پر دعوت کی یہ ترکیب آزمائی اور پھر دسویں اکتوبر کو اور بھی بڑے پیمانے پر ستوری کے معائنے کے موقع پر دعوت دےڈالی۔ چچا جان (نپولین بوناپارٹ) کو ایشیا میں سکندراعظم کی یلغار کی یاد ستاتی تھی، بھتیجے کو اسی ملک کے اندر واکھ (Bacchus) کا فاتحانہ جلوس یاد آیا۔ سکندر اعظم تو، واقعہ یہ ہے کہ، آدھا ہی خدا تھا لیکن واکھ پورم‌پور خدا نکلا، اوپر سے "۱۰ دسمبری سوسائٹی" کا خداوند کریم بھی۔

جب تیسری اکتوبر کی پریڈ ختم ہوئی تو مستقل کمیشن نے وزیرجنگ دی‌اپول سے جواب طلب کیا۔ اس نے وعدہ کیا کہ آئندہ ایسی ضابطہ شکنی نہیں ہونے پائےگی۔ سب جانتے ہیں کہ دی‌اپول کے اس وعدے کو بوناپارٹ نے ۱۰ اکتوبر کو کیسے پورا کیا۔ دونوں معائنوں پر پیرس چھاونی کے کمانڈر انچیف کی حیثیت سے جنرل شگارنیے کمان کر رہا تھا۔ وہ بذات خود مستقل کمیشن کا ممبر بھی تھا، نیشنل گارڈ کا افسراعلا بھی، ۲۹ جنوری اور ۱۳ جون کی آفت سے "بچانےوالا"، بھی، "سماج کا مضبوط پشتہ"، ریپبلک کی صدارت کےلئے ضابطہ پارٹی کا امیدوار، دو بادشاہیوں کا راج گورو سمجھا جانےوالا، جس نے ابھی تک خود کو وزیرجنگ کا ماتحت نہیں مانا تھا، ہمیشہ کھلے عام ریپبلکن آئین کا مذاق اڑایا کرتا، بوناپارٹ کے ساتھ لگا رہتا تھا کچھ اس شان سے، گویا اسے اپنی سرپرستی میں لئے ہوئے ہے۔ اب وہ ایک دم بھڑک اٹھا کہ وزیرجنگ کے مقابلے

پر ڈسپلن کی اور بوناپارٹ کے مقابلے پر آئین کی حفاظت کرے گا۔ جب ۱۰ اکتوبر کو سواروں کے ایک حصے سے نعرے بلند ہوئے : ” نپولین زندہ‌باد ! سوکھا گوشت زندہ باد ! “ تو جنرل شنگارنیے نے ایسا بندوبست کیا کہ کم‌ازکم پیدل فوج جو اس کے دوست نیے‌میئر کی کمان میں پریڈ کرتی ہوئی نکلے، وہ اپنے ہونٹوں پر مہر خاموشی لگائے ہوئے گزرے۔ وزیرجنگ نے بوناپارٹ کے ایما سے سزا کے طور پر، جنرل نیے‌میئر کو پیرس کی کمان سے ہٹا دیا اور عذر یہ کیا کہ اسے چودھویں اور پندرھویں فوجی ڈویژن کا کمانڈر بناکر بھیجنا ہے۔ جنرل نیے‌میئر نے اس تبادلے کو قبول کرنے سے انکار کردیا اور اسی کارن استعفا دینا پڑا۔ شنگارنیے نے اپنی طرف سے دوسری نومبر کو حکم جاری کیا کہ صف‌بندی کی حالت میں فوج کی طرف سے کسی قسم کے سیاسی نعرے نہ لگائے جائیں اور مظاہرے نہ کئے جائیں۔ ایلی‌سے‌ئی کے اخباروں (۹۴) نے شنگارنیے پر حملہ کیا، ضابطہ پارٹی کے اخباروں نے بوناپارٹ کو نشانہ بنایا۔ مستقل کمیشن نے باربار بند نشستیں کیں جن میں کئی دفعہ یہ تجویز آئی کہ ملک میں خطرے کی حالت کا اعلان کردیا جائے۔ نظر آرہا تھا کہ فوج دو مخالف کیمپوں میں بٹی ہوئی ہے، اور ان دونوں کے جنرل اسٹاف بھی آمنے سامنے کھڑے ہیں، ایک کی بیٹھک بوناپارٹ کی قیامگاہ ایلی‌سے‌ئی محل میں ہوتی ہے اور دوسرے کی تویلری میں، جہاں شنگارنیے رہتا ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ قومی اسمبلی کا اجلاس شروع ہوتے ہی جنگی کارروائی کا بگل بجے گا۔ فرانسیسی پبلک بوناپارٹ اور شنگارنیے کے درمیان اس تناتنی کو ٹھیک اسی طرح دیکھ رہی تھی جیسے ایک انگریز اخبارنویس نے صورت‌حال کا ان لفظوں میں جائزہ لیا تھا :

> فرانس کی سیاسی ماماٗئیں انقلاب کے دہکتے ہوئے لاوے
> کو پرانی جھاڑوؤں سے صاف کر رہی ہیں اور صفائی کرتے
> میں ایک دوسرے کو گالی کوسنے بھی دیتی جاتی ہیں۔

اتنے میں بوناپارٹ نے لگے ہاتھوں وزیرجنگ سے استعفا لےلیا اور اسے الجیریا چلتا کردیا۔ اس کی جگہ جنرل شرام کو وزیرجنگ مقرر

کردیا۔ ۱۲ نومبر کو اس نے قومی اسمبلی کے نام ایک پیغام بھیجا جس میں امریکی انداز کا طول کلام، چھوٹی تفصیلوں پر بےضرورت زور، ضابطے کی خوشبو، صلح صفائی کی تمنا، آئین کی فرماں‌برداری کی لہر، اور بہت سی باتوں کے بارے میں قطعی دو ٹوک باتیں، سبھی کچھ بھرا تھا، صرف ایک کسر تھی کہ موجودہ لمحے کے کڑے سوالوں کا کہیں ذکر نہ تھا۔ بظاہر جملہ معترضہ کے طور پر یہ جتایا گیا کہ آئین کے لفظ‌ومعنی کے مطابق فوج کے بندو بست کا معاملہ تنہا پریسیڈنٹ کے اختیارات میں آتا ہے۔ پیغام ان عالی‌شان پرتکلف الفاظ پر آ کر ختم ہوا:

''فرانس کو سب سے مقدم امن‌وسکون کی ضرورت ہے... میں بذات‌خود حلف کا پابند رہ کر انھی تنگ حدود میں رہوں‌گا جو حلف‌نامے نے مقرر کی ہیں... جہاں تک میرا تعلق ہے، لوگوں نے مجھ کو منتخب کیا ہے اور میرے اختیارات محض انھی کی دین ہیں۔ وہ اپنے منشا کا جو بھی قانونی اظہار کریں‌گے، میں ہمیشہ اس کی تعمیل کروں‌گا۔ اگر آپ اس اجلاس میں آئین پر نظرثانی کا فیصلہ کریں تو اس صورت میں آئین ساز اسمبلی انتظامیہ کے معاملات کو بھی معمول پر لے آئےگی۔ اگر آپ یہ فیصلہ نہ کریں تو ۱۸۵۲ء میں لوگ خود آن‌بان کے ساتھ اپنے فیصلے کا اعلان کردیں‌گے۔ بہر حال مستقبل میں جو بھی حل نکلنا ہو، آئیے، فی‌الحال اس پر مہر توثیق ثبت کریں کہ جوش جذبات میں، بےخبری میں اور زبردستی سے ایک عظیم قوم کی قسمت کا فیصلہ نہیں کیا جائےگا... میری نظر سب سے مقدم اس امر پر نہیں کہ ۱۸۵۲ء میں فرانس کی حکومت کس کے ہاتھ میں ہوگی، بلکہ اس امر پر مرکوز ہے کہ جو مہلت مجھے میسر ہے اس کو یوں استعمال کروں کہ یہ عبوری مدت اضطراب اور ہنگامہ خیزی سے پاک رہے۔ میں نے نہایت خلوص کے ساتھ آپ کے روبرو اپنا دل کھول کر رکھ دیا ہے۔ آپ

میری صاف گوئی کا جواب اپنے اعتماد سے اور خیراندیشی کا جواب اپنے تعاون سے دیجئے، باقی امور ہم خدا کے سپرد کردیں۔"

بورژوازی کی شریفانہ، مصلحت آمیز، اور بدنیتی کےساتھ سپاٹ زبان اپنی گھری معنویت کو ایک ایسے شخص کی زبانی ظاہر کر رہی ہے جو "۱۰ دسمبری سوسائٹی" کا مختار کل ہے اور سین‌مورے اور ستوری کے تفریحی پروگراموں کا ہیرو۔

ضابطہ پارٹی کے چودھری دم بھر کےلئے بھی نہیں چکرائے کہ یہ دل کھول کر رکھنا کس قسم کے اعتبار کا مستحق ہے۔ حلف اور حلف‌نامے کی حقیقت بھی ان پر ایک زمانے سے آشکار تھی۔ خود انھی کے درمیان ایسے ایسے جغادری پڑے ہوئے تھے جو سیاسی توبہ شکنی میں نام کما چکے تھے۔ البتہ فوج کے بارے میں جو ذکر تھا وہ ان کی نظر سے نہیں چوکا۔ انھوں نے ناپسندیدگی کے ساتھ یہ بات نوٹ کی کہ یہ پیغام جس میں تھوڑے دنوں پہلے کےپاس کئے ہوئے قانونوں کا تفصیلی تذکرہ ہے، جان‌بوجھ کر ان میں سب سے اہم قانون، انتخابی قانون کا ذکر کترا گیا۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہ اگر آئین پر نظرثانی سے انکار ہوا تو ۱۸۵۲ء میں پریسیڈنٹ کے انتخاب کا معاملہ لوگوں کے ہاتھ میں رہنے دیا گیا ہے۔ انتخابی قانون سیسے کا گولا تھا جو ضابطہ پارٹی کے پیروں میں بندھ گیا، اب چلنا تو دشوار تھا ہی، تیزی سے جھپٹنے میں اور بھی مشکل ہو گئی۔ پھر یہ بھی کہ "۱۰ دسمبری سوسائٹی" کو سرکاری طور پر توڑ کر اور وزیرجنگ دی‌اپول کو برطرف کرکے بوناپارٹ نے ملک کی قربان‌گاہ پر اپنے ہاتھ سے قربانی کے بکرے چڑھا دئے تھے۔ آنےوالے مقابلے کی دھار اس نے خود ہی کند کر دی تھی۔ ادھر ضابطہ پارٹی کو بھی فکر تھی کہ انتظامیہ طاقت سے فیصلہ کن ٹکراؤ حتی‌الامکان ٹالاجائے، نظرانداز کیا جائے، اس کی شدت کم کردی جائے۔ کہیں انقلاب پر پائی ہوئی فتح اس کے ہاتھ سے نکل نہ جائے، اس ڈر سے ضابطہ پارٹی نے اپنے فریق مخالف کو ہی پھل بٹورنے کا موقع دےدیا۔ "فرانس کو سب سے مقدم امن‌وسکون کی ضرورت ہے"

فروری (۱۸۴۸ء) کے بعد سے یہی بات ضابطہ پارٹی انقلاب کو پکار پکار کر سنا رہی تھی، اور اب یہی بات بوناپارٹ نے پکار کر اس پارٹی کو سنا دی۔ "فرانس کو سب سے مقدم امن وسکون کی ضرورت ہے"۔ بوناپارٹ نے ایسی حرکتیں کی تھیں جن کا مقصد تھا طاقت دبا بیٹھنا، اب اگر ضابطہ پارٹی ان حرکتوں پر چیخ پکار مچاتی اور ان کے بخیے ادھیڑتی تو وہ "بےچینی" پھیلانے کی مجرم شمار ہوتی۔ ستوری کی دعوت کا سوکھا گوشت مچھلیوں کی طرح چپ سادھے رہتا بشرطے کہ اس کا ذکر زبانوں پر نہ آتا۔ "فرانس کو سب سے مقدم امن وسکون کی ضرورت ہے"۔ اسی لئے بوناپارٹ نے تقاضا کیا کہ اسے خاموشی سے اپنا کام کرنے دیا جائے۔ پارلیمنٹ میں جو پارٹی بیٹھی تھی اسے دوہرے خوف نے سہما رکھا تھا — ایک تو یہ کہ اگر کچھ کیا تو انقلابی ہلچل پھیل جائےگی، دوسرے یہ کہ کل کو خود اپنا ہی طبقہ، بورژوا طبقہ اسے بےچینی پھیلانے کا قصوروار ٹھیرائےگا۔ فرانس کو چوں کہ سب سے مقدم ضرورت تھی امن وسکون کی، تو ضابطہ پارٹی میں اتنی جرات کہاں کہ بوناپارٹ کے پیغام کی "مصالحت" کا جواب "جنگ" سے دیتی۔ پبلک جو آس لگائے بیٹھی تھی کہ قومی اسمبلی کا اجلاس کھلتے ہی کوئی بڑا معرکہ پیش آنےوالا ہے، وہ دھوکا کھا گئی۔ حزب مخالف کے نمائندوں نے سوال اٹھایا کہ مستقل کمیشن اکتوبر کے واقعات کے سلسلے میں اپنی پوزیشن صاف کرے، تو ان کی تجویز اکثریت رائے سے پٹ گئی۔ قومی اسمبلی ان تمام بحث طلب معاملات سے دامن بچانے کا اصول برت رہی تھی جن سے شعلہ اٹھنے کا اندیشہ تھا۔ غرض یہ کہ نومبر دسمبر ۱۸۵۰ء میں قومی اسمبلی کے اجلاس کی کارروائی بالکل پھیکی رہ گئی۔

آخر، دسمبر کے ختم ہوتے ہوتے پارلیمنٹ کے کئی خصوصی اختیارات (prerogatives) پر ڈھکی چھپی لڑائی چلی۔ دونوں طاقتوں کے خصوصی اختیارات کے سلسلے میں یہ جھگڑا معمولی چپقلش تک آکر رہ گیا کیوں کہ بورژوازی نے عام رائےدھندگی کا حق مٹا کر طبقاتی جدوجہد کا مسئلہ پہلے ہی ٹھنڈا کردیا تھا۔

پارلیمنٹ کے ایک نمائندہ ممبر مثوگن پر قرض کے سلسلے میں مقدمہ چلا اور سزا سنا دی گئی۔ عدالت کے صدر کے سوال پر وزیرانصاف روئے (Ruher) نے کھلے لفظوں میں کہا کہ بغیر کسی رسمی تکلف کے مقروض کی گرفتاری کا حکم جاری ہونا چاہئے۔ اس پر مثوگن کو گرفتار کرکے قرضداروں کی جیل میں ڈال دیا گیا۔ قومی اسمبلی کو جب پتہ چلا کہ پارلیمنٹ کے ممبر کی محفوظ حیثیت پر یوں ھاتھ ڈالا گیا ہے تو وہ بھڑک اٹھی۔ اس نے نہ صرف یہ قرار دیا کہ گرفتارشدہ ممبر کو فوراً رہا کر دیا جائے بلکہ اسی شام اپنے کلرکی اسٹاف کی مدد سے اسے زبردستی کلیشی سے چھڑا بھی لیا۔ مگر دوسری طرف سے، نجی ملکیت کے تقدس پر اپنا اعتقاد جتانے کےلئے، اور دماغ میں پڑے ہوئے اس خیال سے کہ کیا خبر، ان شوریدہ سر ''مونٹین،، والوں کو ایک احاطے میں بند کرکے رکھنے کی ضرورت پڑجائے اس لئے یہ احاطہ بھی تیار رہنا چاھئے، اسمبلی نے قرضے چڑھنے کی صورت میں پارلیمنٹ کے ممبروں کی گرفتاری منظور کردی، بشرطے کہ پہلے سے اسمبلی کی منظوری حاصل کرلی گئی ہو۔ یہاں اسمبلی یہ فرمان نکالنا بھول گئی کہ ریپبلک کے پریسیڈنٹ کو بھی قرض کے قصور پر جیل میں بند کیا جا سکتا ہے۔ اسمبلی کے ممبروں پر ھاتھ نہ ڈالنے کی جو ھلکی سی روک باقی تھی، وہ بھی اسمبلی نے صاف کردی۔

جیسا کہ ذکر آچکا ہے پولیس کمشنر یون آلے نام کے کسی شخص کی اطلاع پر یہ خبر لایا کہ ''۱۰ دسمبری سوسائٹی،، کے ایک جتھے نے دوپن اور شنگارنیے کے قتل کی سوچی ہے۔ اس کو پیش‌نظر رکھتے ہوئے اسمبلی کے پہلے ھی اجلاس میں کوئسٹروں (دیکھئے نوٹ نمبر ۷۶) نے تجویز پیش کی کہ پارلیمنٹ کی ایک اسپیشل پولیس بنائی جائے، جس کا سارا خرچ قومی اسمبلی کے بجٹ سے دیا جائے اور جو پولیس پریفیکٹ کے قطعی ماتحت نہ ہو۔ وزیر داخلہ بروش نے احتجاج کیا کہ یہ اس کے اختیارات کی حدود میں دخل‌اندازی ہے۔ تب ایک مجہول سمجھوتے کی راہ نکالی گئی۔ سمجھوتے سے طے پایا کہ پارلیمنٹ کا پولیس کمشنر اگرچہ پارلیمنٹ کے بجٹ سے تنخواہ وغیرہ لےگا اور پارلیمنٹ کے کوئسٹروں کو ھی

اس کی تقرری اور برطرفی کا اختیار رہےگا، تاہم وزیر داخلہ کا مشورہ اور مرضی حاصل کرنا پہلے لازم ہوگا۔ اس عرصے میں آلے کے خلاف عدالتی چارہ جوئی کی گئی اور یہاں بغیر کسی دقت کے یہ بات بنا دی گئی کہ وہ اطلاع محض من گھڑت تھی، وکیل سرکار نے اطلاع کو من گھڑت دکھاتے ہوئے دوپن، شنگارنیے، یون اور پوری قومی اسمبلی کا خوب مذاق اڑایا۔ بعد میں ۲۹ دسمبر کو وزیر داخلہ بروش نے دوپن کو خط لکھا کہ پولیس کمشنر یون کو برطرف کیاجائے۔ قومی اسمبلی کے بیورو نے فیصلہ کیا کہ یون اپنے عہدے پر رہے۔ لیکن خود اسمبلی مئوگن کے معاملے میں جو زبردستی سے کام لےچکی تھی، اس سے ڈری ہوئی تھی کیوں کہ جب بھی اسمبلی نے انتظامیہ طاقت پر ایک چوٹ لگائی جواب میں دو چوٹیں کھائیں، اس ڈر سے اسمبلی نے اپنے بیورو کی تجویز پر تصدیق کی مہر نہیں لگائی۔ یون نے جی لگا کر جو خدمت انجام دی تھی، اس کے انعام میں اسمبلی نے اس کا استعفا طلب کرلیا اور خود کو پارلیمنٹ کے خصوصی اختیارات سے محروم کرلیا حالاں کہ یہ نہایت لازمی تھا ایسے وقت میں جب کام اس آدمی سے آپڑا ہو جو رات کو سوچنے اور دن کو تعمیل کرنےوالا نہیں تھا، بلکہ دن کو سوچتا اور رات کو اپنے منصوبے کی تعمیل کیا کرتا۔

ہم نے دیکھ لیا کہ قومی اسمبلی پورے نومبر دسمبر کے دوران انتظامیہ طاقت کےساتھ ٹکرلینے سے کیسے کتراتی رہی اور ہر ممکن حیلے سے احتیاط برتتی رہی، حالاں کہ اس کے گھرے، گمبھیر اور ٹھوس کارن موجود تھے۔ اب دیکھئے کہ بعد میں چھوٹے موٹے سوالوں پر اسے کس طرح انتظامیہ طاقت سے ٹکرلینی پڑی۔ مئوگن کے معاملے میں اسمبلی نے اصولی طور پر اجازت دےدی کہ قرضہ ادا نہ ہونے پر نمائندہ ممبروں کو گرفتار کیا جا سکتا ہے، البتہ اتنا حق اپنے ہاتھ میں رکھا کہ یہ اصول انھی ممبروں پر لاگو کیاجائے جو نظر میں چبھتے ہوں اور صرف اتنے سے شرمناک حق کو ہاتھ میں رکھنے کی خاطر وزیرعدالت سے بھی بیر مول لےلیا۔ بجائے اس کے کہ قاتلانہ حملے کی تیاریوں کی اطلاع سے فائدہ اٹھا کر

یہ مانگ کی جاتی کہ " ۱۰ دسمبری سوسائٹی ،، کی سرگرمیوں کی تحقیقات کی جائے اور بالآخر بوناپارٹ کو فرانس اور یورپ کی نظروں کے سامنے بے نقاب کردیا جائے ، اس کا اصلی روپ دکھا دیا جائے کہ یہی شخص پیرس کے آوارہ گردوں کی ٹولی کا سرغنہ ہے ، قومی اسمبلی وزیرداخلہ سے اس نکتے پر الجھ پڑی کہ پولیس کمشنر کی تقرری اور برطرفی کا اختیار کس کے ہاتھ میں رہے گا۔ اس طرح سے یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ ضابطہ پارٹی نے اس تمام مدت میں اپنی دوغلی پوزیشن سے مجبور ہو کر ، اس لڑائی کو جو انتظامیہ طاقت سے لڑنی تھی ، بے حیثیت کرلیا ، اور اسے معمولی عدالتی داؤپیچ میں بدل ڈالا ، گھٹیا قسم کے الجھاووں میں ، قانونی موشگافیوں میں ، اختیارات کے دائرے کی بحثوں میں پھنسا کر رکھ دیا اور اپنی سرگرمی کا مطلب لے دے کے یہ ظاہر کیا کہ خالی خولی لفظوں کی ہیر پھیر ہے اور کچھ نہیں۔ ضابطہ پارٹی کو اتنی ہمت نہیں کہ اس وقت میدان میں اترے جب کسی اصول کی خاطر جنگ ٹھنی ہو ، جب انتظامیہ طاقت مشکل میں پھنسی ہو اور جب قومی اسمبلی کا معاملہ پوری قوم کا معاملہ بنا ہوا ہو۔ ضابطہ پارٹی اگر قدم اٹھا لیتی تو پوری قوم کو قدم اٹھانے کا سگنل مل جاتا مگر وہ کسی بات سے اتنا نہیں ڈرتی جتنا قوم کو حرکت میں لانے سے۔ اسی لئے ایسے موقعوں پر وہ " مونٹین ،، پارٹی کی تجویزوں کو رد کرتی رہی ، اور صرف معمولی کی مصروفیتوں میں لگی رہی۔ جب ضابطہ پارٹی بڑے پیمانے کی جدوجہد سے انکار کر چکی تو انتظامیہ طاقت نے نہایت اطمینان سے اس آنے والے لمحے کا انتظار کیا کہ وہ پھر چھوٹے اور معمولی حیثیت کے سوال اٹھائے اور یوں کہنا چاہئے کہ کشمکش پارلیمنٹری یا محض مقامی دلچسپی کی ہوکر رہ جائے۔ تب پھر ضابطہ پارٹی کے دل کا غبار شدت سے اٹھے ، تب وہ اصلی منظر پر سے پردہ کھینچے ، پریسیڈنٹ کا بہروپ چاک کرے ، ریپبلک کے خطرے میں ہونے کا اعلان کرے ، مگر تب تک زور باندھنے کا کوئی حاصل نہ رہ جائے گا ، مقابلے کے لئے اٹھنے کی وجہ یا تو محض بہانہ نظر آئے گی یا یوں ہی اس قابل نہ ہوگی کہ اس کی خاطر مقابلہ کیا جائے۔ پارلیمنٹ کے اندر کا ہنگامہ

پیالے میں پانی کا طوفان ہوتا ہے، یہ مقابلہ صرف جوڑتوڑ، داؤپیچ اور الزام تراشی کا مقابلہ رہ جاتا ہے۔ اور ایسے وقت میں جب انقلابی طبقے قومی اسمبلی کی گراوٹ کو کڑوی ہنسی کے ساتھ تکا کرتے ہیں کیوں‌کہ وہ بھی اپنی باری کو پارلیمنٹ کے خصوصی اختیار اتنے ہی عزیز رکھتے ہیں جتنی عزیز قومی اسمبلی کو سماجی آزادیاں ہوتی ہیں، تب بورژوازی جو پارلیمنٹ کے باہر ہے اسے کیا معلوم کہ پارلیمنٹ کے اندر پہنچنےوالی بورژوازی کس طرح بہت چھوٹی موٹی پنجہ‌کشی پر وقت ضائع کرتی ہے اور پریسیڈنٹ سے رقابت کی معمولی چھین جھپٹ میں سارا امن‌وسکون خطرے میں ڈال دیتی ہے۔ وہ ایسی چال کے چکر میں آجاتی ہے جس کی غرض یہ ہے کہ امن کا عہدنامہ کیا جائے ایسے وقت جب جنگ چھڑنے کی سبھوں کو امید ہو اور حملہ شروع کیاجائے ایسے وقت جب ہر طرف لوگ سوچ رہے ہوں کہ امن کا عہدنامہ ہوگیا۔

۲۰ دسمبر کو پاسکل دوپرا نے وزیرداخلہ سے سونے کی سلاخوں کی لاٹری پر سوال جواب کیا۔ یہ لاٹری کیا تھی، دختر جنت (Daughter of Elysium) (۹۰)۔ بوناپارٹ نے اپنے حوالی‌موالی کی شرکت سے یہ تحفہ دنیا کو بخشا اور پولیس پریفیکٹ کارلے نے اسے خاص اپنی سرکاری سرپرستی میں لےلیا، حالاں‌کہ فرانس کے قوانین کسی قسم کی لاٹری کی اجازت نہیں دیتے، سوائے ایسی لاٹریوں کے جو خیراتی کاموں کے لئے جاری کی جائیں۔ ایک فرانک فی ٹکٹ کے حساب سے ستر لاکھ ٹکٹ جاری کئے گئے۔ اور ظاہر یہ کیاگیاکہ اس رقم سے پیرس کے سیلانی لوگوں کو کیلی‌فورنیا بھیجنے کا انتظام کیا جائےگا۔ ایک طرح سے غرض یہ تھی کہ سنہرے خواب دکھا کر پیرس کے پرولتاریہ کے دماغ سے اشتراکی خواب نکالے جائیں، محنت کے حق کا کلمہ پڑھنا بھول کر وہ بڑے انعام جیتنے کے چکر میں پڑ جائیں۔ ظاہر بات ہے کہ پیرس کے مزدور کیلی‌فورنیا کے سونے کی چمکتی ہوئی سلاخوں کے پھیر میں آئے تو ان معمولی فرانکوں کا ہوش نہیں رہا جو ان کی جیبوں سے کھسکا لئے گئے تھے۔ غرض کہ یہ سارا لاٹری کا دھندا محض چال‌بازی تھی۔ وہ سیلانی جو پیرس

سے باہر گئے بغیر کیلیفورنیا کی سونے کی کانیں کھودنے چلے تھے، وہ خود بوناپارٹ تھا اور قرضوں میں دبے ہوئے اس کے حواری۔ قومی اسمبلی کے ووٹ سے جو تیس لاکھ فرانک ملے تھے وہ سب اندادھند خرچ ہو چکے تھے اور اب ضرورت تھی کہ خالی تجوری بھرنے کی کوئی سبیل کی جائے۔ بوناپارٹ نے ایک ناکام کوشش کی کہ تعمیری کام اٹھایا جائے۔ نئی cités ouvrières (مزدور بستیوں) کی تعمیر کے نام سے اس نے قومی فنڈ کھولا اور بڑی رقم کا چندہ دینے کےلئے سرفہرست اپنا نام لکھوایا۔ سنگدل پیسےوالوں نے بےاعتباری سے اس دن کا انتظار کیا جب وہ اپنے چندے کی رقم ادا کردے، مگر وہ رقم کہاں آنی تھی، نتیجہ یہ کہ اشتراکی ہوائی قلعے بنانے کا جو ڈول ڈالا تھا وہ غبارے کی طرح پھٹ گیا۔ تعمیری منصوبہ غارت ہوگیا مگر سونے کی سلاخوں نے خوب کمائی کی۔ بوناپارٹ اور اس کے مشیرکاروں کی صرف اتنے میں تسلی نہ ہوئی کہ ستر لاکھ فرانک میں سے جو رقم جیتنےوالے ٹکٹوں کے انعام میں نکل جائے، اس سے اوپر آئی ہوئی رقم اپنی جیب میں ڈال لیں: انھوں نے جعلی ٹکٹ نکال دئے، ایک ہی نمبر کے دس، پندرہ بلکہ بعض تو بیس بیس ٹکٹ نکل آئے — یہ "۱۰ دسمبری سوسائٹی" کے ٹائپ کا مالی نسخہ تھا۔ اس بار قومی اسمبلی کو ریپبلک کے کسی فرضی پریسیڈنٹ سے واسطہ نہ تھا، بلکہ اس کا سامنا ہوا تھا سچ‌مچ کے ٹھوس بوناپارٹ سے۔ وہ پریسیڈنٹ کو ٹھیک جائےواردات پر پکڑ سکتی تھی، واردات کوئی آئین کےخلاف نہیں، بلکہ صاف صاف خیانت مجرمانہ۔ اگر دوہرا کے سوال جواب پر اسمبلی کان دباکر معمول کے کام نمٹانے میں لگی رہی تو اس کا سبب محض یہی نہ تھا کہ ژراردین نے جو تجویز رکھی کہ اسمبلی اپنے "اطمینان" کا اظہار کردے تو اس پر ضابطہ پارٹی کو خود ایک باقاعدگی سے بےایمانی کرتےرہنے کا خیال آگیا۔ بورژوا خاص کر وہ بورژوا جو اسٹیٹ کے گھوڑے پر سوار ہو، عملی معاملات میں اپنے نیچ‌پن کو خیالات و نظریات کی بلند آہنگی سے بھردیتا ہے۔ اسٹیٹسمین یا مدبر کی حیثیت میں وہ اپنے مقابل کی سرکاری طاقت کی طرح ایک بلندوبرتر ہستی بن بیٹھتا ہے

جس سے لڑنا ہو تو اسی بلند و برتر سطح پر، اسی آن‌بان کے ساتھ لڑا جا سکتا ھے۔

بوناپارٹ جو ایک بےحیثیت آدمی تھا، ایک شاھانہ آوارہ گرد تھا، اسے چال‌باز بورژوازی کے مقابلے میں یہ جیت ضرور تھی کہ وہ کش‌مکش ھونے پر گرے ھوئے حربے اختیار کر سکتا تھا۔ اب اس نے دیکھ لیا کہ جب خود قومی اسمبلی ھی پھسلواں زمین سے گزر جانے میں ھاتھ تھام کر سہارا دے رھی ھے، فوجی دعوتوں اور پریڈوں کے معاملے میں، ''۱۰ دسمبری سوسائٹی،، کے معاملے میں اور آخر میں اس خیانت مجرمانہ کے سلسلے میں جب اسمبلی نے خود اسے رہٹنے سے بچالیا تو وقت آ گیا ھے کہ وہ ظاھرا بچاؤ کرنے کے بجائے حملہ کر بیٹھے۔ اس عرصے میں جو چھوٹی چھوٹی شکستیں وزیرانصاف، وزیرجنگ، وزیر بحریہ، وزیر مالیات کو پارلیمنٹ کے مقابلے میں ھوئی تھیں وہ ان سے کچھ شکستہ خاطر نہیں تھا، ان موقعوں پر قومی اسمبلی صرف ناگواری ظاھر کرکے رہ گئی تھی۔ بوناپارٹ نے نہ صرف یہ کہ وزیروں کو استعفا دینے سے روکا، ایسا ھوتا تو پارلیمنٹ کے سامنے انتظامیہ طاقت کی حیثیت دب جاتی، بلکہ وہ کام جو قومی اسمبلی کی تعطیل کے دنوں میں اٹھایا تھا، اب اس کی تکمیل کےلئے میدان صاف پایا، یعنی فوجی طاقت کو پارلیمنٹ سے کاٹ دیا جائے: اس نے شنگارنیے کو برطرف کردیا۔

یلی‌سےنی کے ایک اخبار نے یہ عبارت شائع کی کہ گویا مئی مہینے میں پہلی فوجی ڈویژن کو ایک حکم جاری کیا گیا تھا — اور یہ ھے وہ حکم جو شنگارنیے کی طرف سے افسروں کے نام جاری کیا گیا کہ اگر بغاوت ھوجائے تو اپنی صفوں کے اندر جس کو ٹوٹتا دیکھیں، فوراً گولی سے اڑا دیں۔ اور اگر قومی اسمبلی فوج طلب کرے تو کمک نہ بھیجی جائے۔ تیسری جنوری ۱۸۵۱ء کو مجلس وزارت سے اس حکم پر جرح کی گئی تو اول اس نے معاملے کی چھان‌بین کےلئے تین مہینے کی مہلت مانگی، پھر ایک ھفتہ، آخر میں صرف چوبیس گھنٹے رہ گئے۔ اسمبلی نے اصرار کیا کہ فوراً پورے معاملے کی وضاحت پیش کی جائے۔ شنگارنیے اٹھ کر اعلان کرتا ھے کہ اس قسم کا کوئی

حکم کبھی جاری نہیں ہوا۔ وہ اتنا اور بڑھا دیتا ہے کہ قومی اسمبلی کا ہر ایک تقاضا پورا کیا جائےگا اور اگر کوئی ٹکراؤ کا وقت آیا تو ہمیشہ وہ اسے اپنے ساتھ پائےگی۔ قومی اسمبلی اس اعلان کو تالیوں کی گونج میں قبول کرتی ہے اور ووٹوں سے شنگارنیے پر اپنا اعتماد ظاہر کرتی ہے۔ خود کو جنرل کی ذاتی سرپرستی کے سپرد کرکے اسمبلی اپنے اختیارات سے دستبرداری، اپنی ذاتی بےبسی، اور فوج کے ہاتھ اختیارکل لکھ دیتی ہے۔ لیکن جنرل غلطی پر تھا کہ بوناپارٹ کے مقابلے میں اسی طاقت کو پارلیمنٹ کی مرضی پر چھوڑے دے رہا تھا جو طاقت اسے بوناپارٹ کی طرف سے محدود استعمال کے لئے دی گئی تھی، اور الٹا اسی پارلیمنٹ سے مدد کا امیدوار تھا جس نے مشکل کے وقت جنرل کی سرپرستی کا دامن تھاما تھا۔ تاہم شنگارنیے کو اس پراسرار طاقت پر ایمان رہا جو بورژوازی نے اسے ۲۹ جنوری ۱۸۴۹ء کو عطا کردی تھی۔ وہ خود کو دوسری دو سرکاری طاقتوں کے برابر کی تیسری طاقت سمجھ بیٹھا۔ اس دور کے جو باقی تیس‌مارخاں، بلکہ روحانی بزرگ تھے، ان کی صف میں وہ بھی شریک ہوگیا، وہ لوگ جن کی عظمت ان کی پارٹی کی زبانی پھیلائی ہوئی لمبی چوڑی باتوں میں پوشیدہ ہوتی ہے، مگر جوں ہی حالات کا الٹ پھیر ان سے کرامات کی امید کرنے لگتا ہے وہ سکڑ سمٹ کر اپنی اوقات پر آجاتے ہیں۔ لیکن ان فرضی سورماؤں اور سچ‌مچ کے کراماتی بزرگوں کے حق میں بےاعتباری عموماً ایک جان‌لیوا دشمن ہے۔ اسی‌لئے یہ حضرات ان جملہ کسنےوالوں اور پھبتی‌بازوں کی طرف سے عالی‌ظرفی کےساتھ منہ پھیر لیتے ہیں، انھیں خاطر میں نہیں لاتے جن میں جوش عقیدت کی کمی ہوتی ہے۔

اسی شام کو یلی‌سےئی محل پر مجلس وزارت طلب کی گئی۔ بوناپارٹ نے زور دیا کہ شنگارنیے کو برطرف کیا جائے۔ پانچ وزیروں نے دستخط دینے سے انکار کردیا۔ "مونیٹر" اخبار نے اعلان کیا کہ وزارت میں کھنڈت پڑگئی۔ ضابطہ پارٹی کے اخباروں نے دھمکی دی کہ شنگارنیے کی کمان میں پارلیمنٹ کی فوج بنا لی جائےگی۔ آئین کی رو سے اس پارٹی کو یہ حق حاصل تھا۔ صرف اتنا کرنا تھا

کہ شنگارنیے کو قومی اسمبلی کا صدر چن لیا جاتا اور اپنی سلامتی کےلئے فوج کی جتنی تعداد چاھئے ھوتی ، طلب کرلی‌جاتی ۔ ابھی جب کہ شنگارنیے واقعی فوج کے کمانڈر کے عہدے پر اور پیرس کے نیشنل گارڈ کی کمان سنبھالے ھوئے تھا ، اور اسی انتظار میں بیٹھا تھا کہ فوج سمیت اسے کمک پر بلایا جائے ، اطمینان سے یہ کارروائی ممکن تھی ۔ بوناپارٹ کے اخبارات کی ابھی اتنی ھمت نہ تھی کہ قومی اسمبلی اگر براہ راست فوج کی طلبی کا حکم دے تو اس پر اعتراض کرسکیں — اس قسم کا قانونی الجھاؤ بحالات موجودہ کام نہیں آ سکتا تھا ۔ قومی اسمبلی کے حکم پر فوج عمل کرتی ، یہ بات قرین‌قیاس معلوم ھوتی ھے ، بشرطےکہ ھم یہ واقعہ نظر میں رکھیں کہ بوناپارٹ کو سارا شہر پیرس کھنگالنے میں پورا ایک ھفتہ لگ‌گیا تب جاکر دو ایسے جنرل براگے دی ایلئے اور سین‌ژان دی‌انژیلی ھاتھ آئے جو شنگارنیے کی برطرفی کے حکم پر دستخط دینے کو تیار تھے ۔ لیکن سوال یہ ھے کہ خود ضابطہ پارٹی کو اپنی صفوں میں اور پارلیمنٹ میں اس قسم کے فیصلے کے حق میں ضروری تعداد مل جاتی ؟ اس میں بڑا شبہ ھے ، اگر ھم نظر میں یہ واقعہ بھی رکھیں کہ ھفتہ بھر بعد ۲۸۶ منتخبہ ممبر اس پارٹی سے پھر گئے اور دسمبر ۱۸۵۱ ء تک جب فیصلے کا آخری موقع تھا ، ”مونٹین“ والے اس قسم کی تجویز کو رد کرتے رہے ۔ تاھم یہ ممکن تھا کہ چودھری لوگ اپنی پارٹی‌والوں کا ھجوم لےکر سرفروشی کےلئے کھڑے ھوجاتے تو اسی میں دل قوی رھتا کہ ھم سنگینوں کے جنگل میں چھپ جائیں‌گے اور اس فوج کی خدمات سے کام لےلیا جاتا جو پارٹی کے کیمپ میں آکر مل جاتی ۔ مگر اس کےبجائے چودھری حضرات ۶ جنوری کی شام کو یلی‌سےئی محل کی جانب روانہ ھوگئے ، خیال یہ تھا کہ مدبرانہ داؤپیچ سے ، اور اونچ نیچ دکھا کر بوناپارٹ کو منالیں‌گے کہ وہ شنگارنیے کو برطرف کرنے کے فیصلے سے باز آئے ۔ جس کو منایا جاتا ھے اسے صورت‌حالات پر حاوی مان لیا جاتا ھے ۔ چودھریوں کی ان کوششوں سے بوناپارٹ کا حوصلہ بڑھ گیا ۔ ۱۲ جنوری کو اس نے نئی منسٹری نامزد کر دی جس میں پرانی

منسٹری کے لیڈر فولد اور بروش برقرار رہے ۔ سین ژان دی انژیلی کو وزیرجنگ مقرر کیا گیا ۔ ''مونیٹر،، اخبار میں شنگارنیے کی برطرفی کا حکم نکلتا ہے اور اس کا عہدہ دو حصوں میں تقسیم کردیا جاتا ہے : براگے دی ایلئے کو پہلی فوجی ڈویژن ملتی ہے اور پیرو کو نیشنل گارڈ کی کمان سپرد کی جاتی ہے ۔ وہ جو ''سماج کا مضبوط پشتہ،، تھا اپنے عہدے سے اٹھا دیا جاتا ہے ۔ اگر اس واقعے پر کوئی زلزلہ نہ آیا تو یہ کیا کم ہے کہ سٹہ کے بازار بھاؤ میں تیزی آ گئی ۔

ضابطہ پارٹی نے فوج کو دھکا دے کر ، حالاں کہ شنگارنیے کی صورت میں فوج اسی پارٹی کی مرضی پر کام کرتی ، اور اسے پریسیڈنٹ کے بالکل ہی حوالے کرکے یہ ثابت کر دکھایا کہ اب حکومت چلانا بورژوازی کے بس کی بات نہیں رہی ۔ پارلیمنٹری وزارت پہلے ہی اپنا وجود کھو چکی تھی ۔ اب جبکہ ضابطہ پارٹی نے فوج اور نیشنل گارڈ پر سے بھی اختیار کھودیا تو منوانے کی کونسی سبیل اس کے پاس رہ گئی جس سے بیک وقت وہ عوام پر پارلیمنٹ کا غاصبانہ اقتدار بھی قائم رکھتی اور پریسیڈنٹ کے مقابلے میں پارلیمنٹ کا آئینی اقتدار بھی سنبھالتی ؟ اب لے دے کر صرف اتنا رہ گیا کہ ان بےطاقت اصولوں کی اپیل کیا کرے جنھیں وہ خود ہی محض عام قسم کے اصول شمار کیا کرتی تھی جو دوسروں کےلئے بنائے جاتے ہیں تاکہ ان پر لاگو ہوں اور خود کو بےروک ٹوک عمل کرنے کی سہولت رہے ۔ شنگارنیے کی برطرفی اور بوناپارٹ کے ہاتھ میں فوجی طاقت آجانے کے ساتھ اس دور کا پہلا حصہ تمام ہوجاتا ہے جو ہمارے پیش نظر ہے، یعنی ضابطہ پارٹی اور انتظامیہ طاقت کی کش‌مکش کا دور ۔ اب دونوں طاقتوں میں جنگ ٹھن جاتی ہے اور جنگ کھل کر ہوتی ہے ۔ مگر یہ کب ؟ یہ اس وقت جب ضابطہ پارٹی ہتھیار بھی کھو چکی اور سپاہی بھی ۔ اب قومی اسمبلی کے پاس نہ وزارت ، نہ فوج ، نہ عوام ، نہ رائے عامہ اور ۳۱ مئی کا انتخابی قانون پاس کردینے کے بعد اس کو ایک خودمختار قوم کی نمائندہ کہلانے کا بھی حق نہیں تھا ۔ نہ آنکھ ، نہ کان ، نہ دانت ، نہ کچھ اور ، ایسی حالت میں

قومی اسمبلی رفتہ رفتہ فرانس قدیم کی پارلیمنٹ (۹۶) ہو کر رہ گئی، کہ گورنمنٹ کے ہاتھ میں ساری کارگزاری سونپ کر خود سبکدوش اور مار پیچھے پکار کرنے میں خوش۔

نئی وزارت کو ضابطہ پارٹی نے زبردست ہائےواویلا کے ساتھ قبول کیا۔ جنرل بیدو نے اپنی یادداشت میں ذکر کیا ہے کہ تعطیل کے دنوں میں مستقل کمیشن کتنا دب دب کر چل رہا تھا اور اس نے احتیاط کی انتہا یہ کی کہ اپنے جلسوں کی روئداد تک چھاپنے سے روک لی۔ وزیرداخلہ نے اپنی طرف سے کافی زور دیا کہ ان روئدادوں کی اشاعت کی جائے، جو اپنا لطف کھوچکی تھیں اور رکے ہوئے پانی کی طرح پھیکی سیٹھی ہو چکی تھیں؛ ان سے نہ اب کوئی خاص بات کھلتی تھی، نہ اکتائی ہوئی پبلک میں ان کا چرچا ہوتا تھا۔ ریمیوز کی تجویز پر قومی اسمبلی الگ الگ کمیشنوں میں بحث کرنے کے بعد ”غیرمعمولی کارروائیوں کی کمیٹی“ مقرر کر دیتی ہے۔ پیرس کو یوں بھی روزمرہ کے مشغلوں سے فرصت نہیں۔ کاروبار ان دنوں بہت مزے میں جارہا ہے، صنعتی ادارے زور میں چل رہے ہیں، اناج کے بھاؤ کم ہیں، کھانے پینے کا ذخیرہ افراط سے ہے۔ بچت فنڈ میں روزانہ خوب روپیہ جمع ہو رہا ہے۔ ”غیر معمولی کارروائیاں“، جن کی پارلیمنٹ نے اتنی دھوم دھام کی تھی، وہ سب غائب ہو گئیں کیوں کہ خود منسٹری کے خلاف ۱۸ جنوری کو عدم اعتماد کا ووٹ پاس ہو گیا اور اس میں کہیں شنگارنیے کا ذکر تک نہ تھا۔ ضابطہ پارٹی نے تحریک کا نقشہ اس طرح جمایا کہ ریپبلکنوں کے ووٹ بھی ساتھ کھنچے ہوئے آئیں، کیوں کہ وزارت نے جتنے کام کئے ان میں صرف ایک بات ریپبلکنوں کو پسند تھی، شنگارنیے کا نکالا جانا۔ مگر ضابطہ پارٹی کو دوسرے کاموں سے بھی انکار نہیں ہو سکتا تھا، وہ اس نے خود اپنے ایما پر وزارت سے کرائے تھے۔

۱۸ جنوری کی ووٹنگ میں وزارت کے خلاف عدم اعتماد کی تجویز پر ۲۸۶ کے مقابلے میں ۴۱۵ ووٹ آئے اور تجویز پاس ہو گئی محض اس لئے کہ انتہائی جائز وارث والوں کے ساتھ اورلین والے، خالص

ریپبلکن اور ''مونٹین،، کے حامی مل گئے۔ صاف نظر آ گیا کہ ضابطہ پارٹی نے صرف وزارت یا فوج ہی نہیں کھوئی بلکہ بوناپارٹ سے رسہ کشی میں پارلیمنٹ کی اکثریت بھی اس کے ہاتھ سے نکل چکی ہے۔ پارلیمنٹری نمائندوں کا ایک حصہ یوں ساتھ چھوڑ گیا کہ وہ انداد هند سمجھوتے کے حق میں تھا، کچھ ممبر ٹکراؤ کا سامنا دیکھ کر نکل گئے، کچھ کمزوری کی وجہ سے گئے، کچھ گھریلو مجبوریوں سے کیوں کہ سرکاری تنخواہ پر دارومدار تھا، کچھ اس امید میں کہ (اودی لوں بارو) قلمدان وزارت خالی ہونےوالے ہیں، کچھ محض خودپسندی یا خود غرضی کے مارے، جو معمولی بورژوا کے پاؤں اکھاڑ دیتی ہے اور وہ کسی نہ کسی ذاتی غرض پر اپنے پورے طبقے کا مفاد قربان کر ڈالتا ہے۔ بوناپارٹ کے حامی ممبر شروع سے ہی صرف انقلاب کے مقابلے میں ضابطہ پارٹی کے نقش قدم پر چل رہے تھے۔ کیتھولک پارٹی کے لیڈر مونتالامبیر نے اپنا پورا وزن بوناپارٹ کے پلے میں رکھ دیا تھا کیوں کہ اسے پارلیمنٹری پارٹی کے دم درود پر ایمان نہیں رہا تھا۔ آخر اس پارٹی کے سربرآوردہ نمائندوں، یعنی اورلین‌والے تیئر اور جائز وارث‌والے بیرئیے نے مجبوراً کھل کر اپنے ریپبلکن ہونے کا اظہار کیا اور یہ مان لیا کہ اگرچہ وہ دل سے بادشاہی کے طرفدار ہیں، لیکن دماغ سے ریپبلک کے حامی ہیں — اور یہ کہ پارلیمنٹری ریپبلک ہی ایک ایسی شکل رہ گئی ہے جس میں بورژوازی کا سکہ چل سکتا ہے۔ مختصر یہ کہ خود بورژوا طبقے کی آنکھوں کے سامنے انہیں مجبوری کو اپنے بادشاہت کی بحالی کے منصوبے ایک خطرناک مگر بےمعنی سازش کی طرح قلم‌زد کرنے پڑے جو وہ پارلیمنٹ کی پیٹھ پیچھے مستقل طور سے چلائے جا رہے تھے۔

۱۸ جنوری کو عدم‌اعتماد کے ووٹ نے وزارت پر کاری ضرب لگائی، لیکن پریسیڈنٹ پر نہیں، حالاں‌کہ شنگارنیے کو نکالنے میں وزارت کا نہیں، پریسیڈنٹ کا ہاتھ تھا۔ ضابطہ پارٹی سے اتنا نہ ہوا کہ خود بوناپارٹ سے جواب طلب کر لیتی، کہ وہ اپنے اختیارات کی بحالی کی گھات میں تھا۔ مگر یہ کیوں کر ہوتا جب کہ یہ پارٹی اسی میں اپنے شاہی خاندانوں کی بحالی مضبوط ہوتے دیکھ

رھی تھی۔ فوجی پریڈوں اور ''۱۰ دسمبری سوسائٹی،، کی سازش بھری حرکتوں پر جواب طلب کر لیتی؟ لیکن کیسے کرتی، یہ سوال تو پہلے ھی روزمرہ کے معمولی ایجنڈوں کے پلندے میں دفن کئے جا چکے تھے۔ ایک ایسے شخص کو نکالنے کے قصور میں جواب طلب کر لیتی جو ۲۹ جنوری اور ۱۳ جون کا ھیرو تھا اور جس نے مئی ۱۸۵۰ء میں دھمکی دی تھی کہ اگر بغاوت اٹھی تو پیرس کو چاروں کھونٹ سے پھونک دیا جائے گا۔ لیکن ضابطہ پارٹی کے اتحادیوں نے جو ''مونٹین،، پارٹی کے تھے اور کوےنیاک نے یہ بھی نہ کرنے دیا کہ ''سماج کا پشتہ،، جو بیٹھ گیا تھا، اس سے سرکاری طور پر اظہار ھمدردی کر دیا جاتا۔ خود اس پارٹی میں اتنی ھمت نہ تھی کہ آئین کی طرف سے پریسیڈنٹ کو جو اختیار دیا گیا ھے جنرلوں کو نکالنے کا، اس پر انگلی اٹھا سکے۔ ضابطہ پارٹی صرف اس کارن آپے سے باھر تھی کہ پریسیڈنٹ نے وہ آئینی حق جو اس کو ملاھوا ھے پارلیمنٹ کے خلاف استعمال کیا۔ مگر سوال یہ ھے کہ کیا خود اس پارٹی نے پارلیمنٹ میں اپنے خصوصی اختیارات سے مستقل کام لے کر بار بار آئین کے خلاف کارروائی نہیں کی، خاص کر جب عام حق رائے دھندگی کو منسوخ کیا؟ چناںچہ اب اس کے سامنے سوائے اس کے اور کوئی راہ نہ تھی کہ پارلیمنٹ کی مقررہ حدوں کے اندر رہ کر کام کرے۔ اور وہ اسی بیماری کے جال میں پھنس گئی جو ۱۸۴۸ء سے برابر پارلیمنٹری حماقت کے نام سے سارے یورپ کو لپیٹ میں لے چکا تھا۔ اس کی لپیٹ میں آئے ھوئے لوگ اپنی ایک خیالی دنیا میں بند کردئے جاتے ھیں، نہ ان کے پاس قوت تمیز رھتی ھے، نہ یادداشت، نہ باھر کی کھردری دنیا کی سوجھ بوجھ۔ صرف اسی پارلیمنٹری حماقت سے ضابطہ پارٹی کی یہ بےبسی سمجھ میں آتی ھے کہ اس نے خود اپنے ھاتھوں سے اور دوسرے طبقوں سے رسہ کشی کرنے میں پارلیمنٹ کی قوت‌وعظمت خاک میں ملادی اور ابھی تک اپنی پارلیمنٹری جیتوں کو فتوحات سمجھے جا رھی تھی اور سوچتی تھی کہ پریسیڈنٹ کی بنائی ھوئی وزارت پر چوٹ لگا کر خود پریسیڈنٹ کو ھی نشانہ بنایا ھے۔ پارٹی نے اسے الٹا اور موقع دیا کہ قومی

اسمبلی کو وہ پوری قوم کے سامنے پھر ذلیل کرے۔ ۲۰ جنوری کو ''مونیٹر،، اخبار نے اعلان کر دیا کہ پریسیڈنٹ نے مجلس وزارت کا استعفا قبول کر لیا ہے۔ اس بہانے سے کہ فی الحال کسی پارلیمنٹری پارٹی کو اکثریت حاصل نہیں ہے، جیسا کہ ۱۸ جنوری کی ووٹنگ سے ثابت ہوتا ہے اور یہ ووٹنگ ''مونٹین،، اور شاہ‌پرستوں نے مل کر کی تھی، اکثریت بننے تک بوناپارٹ نے نام کے لئے ایک وقتی وزارت قائم کر دی جس کا ایک رکن بھی پارلیمنٹ کا ممبر نہیں تھا، سب کے سب انجانے اور بے حیثیت لوگ تھے، یہ وزارت محض کلرکوں اور نقلچیوں کو جوڑ کر بنائی گئی تھی۔ ضابطہ پارٹی اب ان کٹھپتلیوں سے الجھنے میں ہی اپنی طاقت برباد کیا کرتی، کیوں‌کہ انتظامیہ طاقت کی نظر میں کوئی خاص وزن نہیں تھا اس بات کا کہ قومی اسمبلی میں اس کی اچھی خاصی نمائندگی ہونی چاہئے۔ بوناپارٹ نے اب اپنی ذات میں زیادہ سے زیادہ انتظامی اختیارات سمیٹ لئے تھے اور اس کے منسٹر جس قدر بھی نام کے مہرے بنتے اتنا ہی انتظامیہ کا استعمال اپنی غرض کےلئے زیادہ آسان ہو جاتا۔

ضابطہ پارٹی نے ''مونٹین،، سے مل کر انتقامی کارروائی کی کہ پریسیڈنٹ کو ۱۸ لاکھ فرانک کی رقم جو کلرک منسٹری نے ''۱۰ دسمبری سوسائٹی،، کے دباؤ سے دینا تجویز کی تھی، وہ نامنظور کر دی۔ اس بار نامنظوری کے حق میں صرف ۱۰۲ ووٹ زیادہ آئے، یعنی ۱۸ جنوری سے اب تک ضابطہ پارٹی کے ہاتھ سے ۲۷ ووٹ اور نکل چکے تھے: اس کا انتشار بڑھتا جا رہا تھا۔ اسی وقت، محض اس خیال سے کہ کہیں ''مونٹین،، کے ساتھ جو کولیشن ہو رہا ہے، اس کا کچھ اور مطلب نہ نکال لیا جائے، ضابطہ پارٹی ''مونٹین،، کے ۱۸۹ ممبروں کی پیش کردہ اس تجویز پر غور کرنے تک کو تیار نہ ہوئی کہ تمام سیاسی مجرموں کو عام معافی دی جائے۔ اور تو اور، وائس نام کے ایک وزیر داخلہ کی طرف سے کھلے لفظوں میں کہا گیا کہ امن‌وسکون صرف ظاہر کا پردہ ہے، زبردست ایجی‌ٹیشن اندر ہی اندر پھیل رہا ہے، جابجا خفیہ سوسائٹیاں بن رہی ہیں، جمہوریت‌پسند اخبار پھر سے سر اٹھانے

کی تیاری میں ھیں ، دیہی حلقوں (ڈپارٹمنٹوں) سے بھی خیروعافیت کی اطلاع نہیں آرھی ، جنیوا کو بھاگنےوالے فرانسیسی ان سازشوں کے سرغنہ ھیں ، جن کا تار لیون کے راستے سارے جنوبی فرانس میں پھیل چکا ھے اور فرانس صنعتی اور کاروباری توڑ پر پہنچ چکا ھے ، شہر روبے کے کارخانہ‌داروں نے کام کے گھنٹے کم کر دئے ھیں ، بیل ایل کے جزیرے میں (۹۷) سیاسی قیدیوں نے طوفان مچا دیا ھے — کسی ایک وائس کے منہ سے اتنی بات نکلنا ھی کافی ھو گیا کہ لال بھوت کا سایہ منڈلا رھا ھے اور ضابطہ پارٹی نے جھٹ ایسی تجویز سے منہ پھیر لیا جو قومی اسمبلی کو زبردست مقبولیت بخش دیتی اور بوناپارٹ کو پھر اس کے قدموں پر گرنے کے لئے مجبور کر دیتی۔ بجائے اس کے کہ انتظامیہ طاقت نے تازہ ھنگاموں کی جو خوفناک تصویر کھینچی تھی ، اس سے دھشت کھائے ، ضابطہ پارٹی کو چاھئے تھا کہ طبقاتی جدوجہد کا تھوڑا بہت زور دکھانے کا موقع نکالتی اور اس تدبیر سے انتظامیہ طاقت کو اپنے حالات کی حد تک لا کر روک لیتی۔ لیکن اپنے اندر اتنا بوتہ ھی نہ پایا کہ آگ انگاروں کے اس کھیل سے نمٹ لیتی۔

اتنے عرصے وہ نام کی وقتی وزارت اپریل کے وسط تک گاڑی کھینچتی رھی۔ بوناپارٹ آئے دن منسٹری کے نئے نئے جوڑ بٹھا کر قومی اسمبلی کا ناک میں دم کرتا رھا ، اسے بےوقوف بناتا رھا۔ کبھی وہ یہ ارادہ ظاھر کرتا کہ ریپبلکن منسٹری بنادے جس میں لامارتین اور بی‌یو شامل ھوں ، کبھی ایسی پارلیمنٹری وزارت بنانے کو کہتا جس میں اودی‌لوں بارو ضرور شریک ھو (یہ وہ نام ھے کہ جہاں بھی الٹی عقل کا ذکر ھوگا وھاں یہ نام زبان پر لازمی آئے گا) ، کبھی جائزوارث‌والے گروہ کی وزارت سوچی جاتی جس میں واتی‌مینل اور بینوا دی‌آزی شامل ھوں ، اور کبھی اورلین‌والوں کا نام آتا کہ مال‌ویل کو لےکر ان کی وزارت مقرر کی جائے۔ اس داؤ پیچ سے ضابطہ پارٹی کے مختلف گروھوں کو ایک دوسرے سے تناتنی کی حالت میں ڈال کر ، اور ساری پارٹی کو یہ اندیشہ جتا کر کہ ریپبلکنوں کی بھی منسٹری بن سکتی ھے ، وہ بن گئی تو عام‌رائے‌دھندگی کا حق پھر

سے بحال ہونا لازمی بات ہے ، بوناپارٹ نے بورژوازی کے دماغ میں یہ بات بٹھادی کہ پارلیمنٹری وزارت بنانے کی جتنی پرخلوص کوششیں وہ کرتا ہے ، سب کی سب شاہ‌پرست گروہوں کی باہمی ناچاقی سے ناکام ہوجاتی ہیں۔ بورژوازی اور بھی باآواز بلند ”مضبوط سرکار“ کا مطالبہ کرنے لگی اور فرانس کو ”بغیر کسی سرکاری بندوبست“ کے رہنے دینا ناقابل معافی جرم قرار دینے لگی۔اسے جتنا یہ نظر آتا گیا کہ ایک عام کاروباری سنکٹ قریب آرہا ہے جو شہروں میں اشتراکیت کے حامی پیدا کرےگا اور غلے کے بھاؤ تیزی سے گریں‌گے تو دیہات میں اشتراکیت کے حمایتی نکل پڑیں‌گے۔ روز بہ روز کساد بازاری بڑھتی گئی۔ بےروزگاروں کی تعداد بڑھتی نظر آنے لگی ، پیرس میں کم سے کم دس ہزار مزدور روٹی کو محتاج ہو گئے۔ رواَن ، سیولوز ، لیون ، روبہ ، ترکوئن ، سین‌ایتیئن ، ایل‌بیوف اور دوسرے کئی مقامات پر بہت سی فیکٹریوں پر تالے پڑگئے۔ ان حالات میں بوناپارٹ نے یہ جرات کی کہ ۱۸ جنوری والی منسٹری ہی ۱۱ اپریل کو بحال کردی ۔ اب تک وزارت میں مسٹر روئے ، فولد اور بروش وغیرہ تھے ہی ، اب لیون فوشے کو بھی ان میں جوڑ دیا ، حالاں‌کہ آئین ساز اسمبلی نے اپنے اجلاس کے آخری دنوں میں پانچ وزیروں کے اختلاف کے باوجود ، اتفاق رائے سے اس شخص پر ، جھوٹے ٹیلی‌گرام بھیجنے کے الزام میں عدم‌اعتماد کا ووٹ پاس کیا تھا۔ اس طرح سے قومی اسمبلی نے ۱۸ جنوری کو وزارت پر فتح پائی اور تین مہینے بوناپارٹ سے کش‌مکش جاری رکھی صرف اتنے کے لئے کہ ۱۱ اپریل کو فولد اور بروش اپنے وزارتی حلقے میں ایک تیسرے کو بھی ملا لیں — پاکباز فوشے کو۔

نومبر ۱۸۴۹ء میں بوناپارٹ اسی سے مطمئن تھا کہ وزارت پارلیمنٹری نہیں ہے ، جنوری ۱۸۵۱ء کو اتنی تسلی تھی کہ وزارت پارلیمنٹ سے باہر کی ہے ، اب ۱۱ اپریل کو ایسی وزارت بنانے کی طاقت پائی جو پارلیمنٹ کے خلاف ہو، اور ایسی وزارت کہ باری باری دونوں اسمبلیاں ، آئین ساز بھی اور قانون‌ساز بھی ریپبلکن‌والوں کی بھی اور شاہ‌پرستوں کی بھی اس وزارت کے خلاف عدم‌اعتماد کا ووٹ

پاس کر چکی تھیں ۔ وزارتوں کی یہ درجہ بدرجہ حیثیت ایسا تھرمامیٹر تھی جس سے خود پارلیمنٹ اپنی زندگی کا گرتا ہوا درجۂ حرارت ناپ سکتی تھی۔ یہ درجۂ حرارت اپریل کے آخر میں اتنا گر گیا کہ پیرسنی نے شنگارنیے کو ذاتی گفتگو میں پریسیڈنٹ سے مل جانے کی پیش کش کر دی۔ اس نے شنگارنیے کو یقین دلایا کہ بوناپارٹ کے اندازے سے اب قومی اسمبلی کا اثر بالکل ٹوٹ چکا، وہ فرمان بھی تیار رکھا ہے جو نظام حکومت کا تختہ الٹنے کے بعد شائع کیا جائے گا۔ اس کارروائی پر بھی خوب غور کیا جا چکا تھا لیکن پھر اتفاق سے ملتوی ہو گئی ہے۔ شنگارنیے نے ضابطہ پارٹی کے لیڈروں کو اس کی موت کی تیاریوں کی خبر بھیجی مگر کھٹمل کے کاٹنے سے موت کا یقین کون کرتا۔ پارلیمنٹ کتنی بھی بےبس تھی، ناچاقیوں کا شکار تھی، آخری سانس لے رہی تھی، تاہم کیسے نہ مانتی کہ "۱۰ دسمبری سوسائٹی" کے سرغنہ مسخرے سے دو دو ہاتھ کرنا ایسا ہی ہے جیسے کھٹمل سے کشتی لڑنا۔ لیکن بوناپارٹ نے ضابطہ پارٹی کو وہی جواب دیا جو اگیسِلائی نے شاہ اگیس کو دیا تھا:

"میں تمھیں چیونٹی نظر آتا ہوں، لیکن وقت آرہا ہے کہ میں شیر بن جاؤں گا۔" (۹۸)

٦

ضابطہ پارٹی نے "مونٹین" اور خالص ریپبلکنوں کے ساتھ کولیشن بنایا، وہ کولیشن بنانے پر اس لئے مجبور ہوئی تاکہ اپنی سی لاحاصل کوشش کرکے ایک تو فوجی طاقت کو ہاتھ سے نہ جانے دے، دوسرے انتظامیہ طاقت پر جو بالا دستی جاتی رہی، اسے پھر چھین لے۔ مگر اس کولیشن نے قطعی طور پر یہ ثابت کر دیا کہ ضابطہ پارٹی پارلیمنٹ میں بذات خود اکثریت سے محروم ہو چکی ہے۔ صرف وقت کی دیر تھی، ادھر کیلنڈر پر ۲۸ مئی کی تاریخ آئی، گھڑی نے ۲۸ مئی کا گھنٹہ بجا کر اس پارٹی کے بکھر جانے کا سگنل دے دیا۔ ۲۸ مئی کی تاریخ کو قومی اسمبلی کی زندگی کا آخری سال آ پہنچا۔ اب اس سوال کا فیصلہ درپیش تھا کہ آئین کو

جوں کا توں رہنے دیا جائے یا اس پر نظر ثانی کی جائے۔ نظرثانی کا مطلب یہ ہوتا کہ صرف بورژوازی یا چھوٹی حیثیت کی بورژوازی کی حکمرانی میں ، ڈیموکریسی یا پرولتاری نراج کی حکومت میں ، پارلیمنٹری ریپبلک یا بوناپارٹ کی عملداری میں ہی کسی ایک کا چناؤ نہیں کرنا تھا بلکہ اورلین اور بوربوں کی خاندانی بادشاہت میں سے بھی کسی کو چنا جا سکتا تھا۔ چناں‌چہ پارلیمنٹ کے بیچوں بیچ پھوٹ کا پھل گرا اور اس کے چار طرف کھلےعام ان مفادوں کی چھینا جھپٹی شروع ہوئی جو ضابطہ پارٹی کو ایک دوسرے کے دشمن گروہوں میں بانٹنےوالے تھے۔ مختلف فطرت کے سماجی عناصر یکجا ہونے سے یہ پارٹی بھان‌متی کا کنبہ تھی۔ آئین پر نظرثانی کا سوال آنا تھا کہ سیاسی پارہ چڑھ گیا ، جس سے جڑا ہوا کنبہ ٹوٹ کر ہر ایک پھر اپنے اپنے ٹھکانے جا لگا۔

بوناپارٹ‌والوں کو آئین پر نظرثانی کی کیوں پڑی تھی ، وجہ صاف ہے۔ سب سے اول ان کے نزدیک دفعہ ۴۵ کو ہٹوانا تھا جو بوناپارٹ کے دوبارہ چناؤ اور اختیارات کی مدت بڑھانے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ ریپبلکنوں کی پوزیشن بھی اتنی ہی واضح تھی۔ وہ غیرمشروط طور پر نظرثانی کے خلاف تھے کیوں کہ جانتے تھے اس سے ریپبلک کے خلاف عام سازش چل پڑےگی۔ قومی اسمبلی کے اندر انھیں ایک چوتھائی سے زیادہ ووٹ حاصل تھے اور چوں کہ آئین کے مطابق یہ لازم تھا کہ تین چوتھائی ووٹوں سے تجویز آئے تب آئین پر نظرثانی کا فیصلہ کیا جاسکتا ہے اور آئین میں ترمیم کے لئے خاص سشن طلب کیا جا سکتا ہے ، لہاذا ریپبلکن صرف اپنے ووٹوں پر بھروسہ کرکے یقین کے ساتھ جیت سکتے تھے۔ انھیں یقین تھا کہ جیت جائیں گے۔

ادھر تو ان دونوں کی یہ صاف پوزیشن تھی ، اس کے برخلاف ضابطہ پارٹی اپنے اندر ایسے تضادوں میں مبتلا ہوئی کہ وہ سلجھ نہ سکے۔ اگر وہ آئین پر نظرثانی کو ٹھکرا دے تو جو بندوبست‌قائم ہے ، وہ خطرے میں پڑےگا ، بوناپارٹ کے سامنے صرف ایک راستہ رہ‌جائےگا — طاقت آزمائی کا راستہ ، اور فرانس کو مئی ۱۸۵۲ء کے دوسرے اتوار

کے جیسے فیصلہ کن موقع پر وہ انقلابی افراتفری کے حوالے کردے گی؛ ایک پریسیڈنٹ ہوگا جس کے ہاتھ سے اختیار لے لیا گیا، پارلیمنٹ ہوگی جس کے پاس اختیار تھا ہی نہیں اور وہ عوام ہوں گے جو پھر سے طاقت چھیننے کی نیت لے کر اٹھیں گے۔ اب اگر ضابطہ پارٹی آئین کے مطابق نظرثانی کی حمایت میں ووٹ دے تو جانتی تھی کہ لا حاصل ہوگا کیوں کہ آئین کی رو سے ریپبلکنوں کے ووٹ اس ووٹنگ کو منسوخ کرا دیں گے۔ البتہ آئین شکنی کرکے محض اکثریت رائے فیصلہ کرنے کے حق میں آواز اٹھائے تو انقلاب پر قابو پانے کی امید کر سکتی ہے لیکن اس میں یہ پخ لگی ہے کہ انتظامیہ طاقت کے سامنے بالکل ہی گھٹنے ٹیک دے اور یوں بوناپارٹ کو ملک کے آئین پر، نظرثانی پر، اور خود اس پارٹی پر پورا اختیار دلوا دے۔ اور اگر آئین پر صرف جزوی نظرثانی کی جائے کہ پریسیڈنٹ کے اختیارات کی مدت بڑھانا مقصود ہو تو بوناپارٹ کے لئے طاقت دبا بیٹھنے کی زمین تیار ہوتی ہے۔ اگر عام نظرثانی کی جائے کہ ریپبلک کی عمر کا رشتہ ہی کاٹ دیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ الگ الگ شاہی خاندانوں میں رقابت زور پکڑے گی کیوں کہ اورلین اور بوربوں موروثی خاندانوں کی بحالی کے شرائط نہ صرف مختلف ہوں گے بلکہ ایک کے ہوتے دوسرے کی سمائی نہیں ہونے والی۔

پارلیمنٹری ریپبلک ہونے کو صرف ایک غیر جانبدار سرزمین تھی جس پر فرانسیسی بورژوازی کے دونوں گروہ، اورلین والے اور جائزوارث والے، صنعت کے مالک اور زمینوں جاگیروں کے مالک، پہلو بہ پہلو برابر کے حق سے راج کر سکتے تھے۔ یہی ایک لازمی شرط تھی ان کی اس مشترکہ حکمرانی کے لئے، جو بس واحد صورت رہ گئی تھی ایسی ریاست کی جس میں ان دونوں کے مشترکہ طبقاتی مفاد حاوی رہتے، بورژوازی کے الگ الگ گروہوں کے باہمی مقابلے پر اور سماج کے دوسرے طبقوں کے مفاد پر وہ غالب رہتے۔ شاہ‌پرست ہونے کے ناتے وہ پھر اپنی پرانی دشمنی نکالنے پر اتر آئے کہ جاگیر والوں کا ہاتھ اوپر رہے یا روپے والوں کا، یہ ٹکراؤ خوب ابھر کر ظاہر ہو رہا تھا ان کے بادشاہوں یا اپنے اپنے موروثی شاہی خاندانوں کی

صورت میں۔ یہ سبب تھا کہ ضابطہ پارٹی بوربوں والوں کی تخت پر واپسی کے خلاف گئی۔

اورلین والے اور منتخبہ ممبر پارلیمنٹ کرےٹن نے ۱۸۴۹ء، ۱۸۵۰ء اور ۱۸۵۱ء میں لگاتار یہ تجویز رکھی کہ شاہی خاندانوں کی جلاوطنی کا فرمان واپس لیا جائے۔ ہر بار پارلیمنٹ شاہ پرستوں کے جلسے کا ایک ایسا منظر پیش کرتی تھی جس نے اپنے دروازے مضبوطی سے بند کر رکھے تھے کہ نکالے ہوئے بادشاہ وطن کو واپس نہ آنے پائیں۔ رچرڈ سوم نے ہنری ششم کو یہ کہہ کر قتل کردیا کہ اس دنیا میں اتنے نیک آدمی کی ضرورت نہیں، اس کی جگہ آسمان پر ہے۔ شاہ پرستوں نے فرانس کو اتنا بے وقوف سمجھ رکھا تھا کہ وہ نکالے ہوئے بادشاہوں کو پھر واپس بلا لے گا۔ حالات کے دباؤ نے انھیں رپبلکن بن جانے پر مجبور کر دیا تھا اور کئی بار ایسا ہوا کہ قوم کے اس فیصلے کی انھیں تائید کرنی پڑی کہ بادشاہ کو فرانس سے جلاوطن رکھا جائے۔

حالات کا تقاضا تھا کہ آئین کی نظرثانی کے سوال پر غور کیا جائے اور ایسا کرنے میں جہاں یہ خطرہ بھی تھا اور امکان بھی کہ بورژوازی کے دونوں گروہوں کی حکمرانی قائم ہو جائے، وہیں بادشاہت قائم ہونے کا امکان ان مفادوں کی رقابت کو پھر سے زندہ کر دیتا جن کی بڑھ چڑھ کر نمائندگی باری باری کبھی ایک گروہ کرتا تھا، کبھی دوسرا اور بورژوازی کے دونوں گروہوں کے درمیان اوپر رہنے کی رسہ کشی بھی پھر سے جی اٹھتی۔ ضابطہ پارٹی کے سیاسی بھاؤ تاؤ کرنے والے سوچتے تھے کہ دونوں شاہی خاندانوں کو ملا کر یا بقول شخصے شاہ پرست پارٹیوں اور شاہی گھرانوں کو گھول کر وہ مقابلے کا قصہ ھی پاک کردیں گے۔ حقیقت میں ”بحالی،، والوں اور جولائی کی بادشاہت کی گھلی ملی شکل سے تو خود پارلیمنٹری رپبلک کا خمیر اٹھا تھا جس میں اورلین اور جائزوارث کے رنگ دھل دھلا کر، بورژوازی کے الگ نمونے صاف ہو کر سب ایک ھی بورژوا کے رنگ میں رنگ گئے تھے اور بورژوائی قسم کے نمائندے بن کر نکلے تھے۔ لیکن اب اورلین والوں کو جائزوارث اور جائزوارث والوں کو اورلین بننا

باقی تھا۔ وهی بادشاهت جس میں ان کی عداوت ظاهر هوتی تھی، اب اتنی کسر تھی که وهی اتحاد کا گڑھ بن جائے۔ ایک گروه کا مفاد دوسرے گروه کے مفاد کو برداشت نه کرنے کی جو صورت تھی وهی اب کایاکلپ هوکر ان سب کے مشترکه طبقاتی مفاد کی ایک شکل بننی باقی تھی۔ بادشاهت کو اب وهی کچھ کرنا تھا جو دونوں بادشاهوں کے دعوے رد کرنے سے، یعنی رپبلک کے ذریعے کیا جا سکتا تھا اور کیا جا چکا تھا۔ یهی وه سنگ فلاسفه تھا، وه کیمیا کا نسخه تھا جس پر ضابطه پارٹی کے کیمیاگر سر کھپا رهے تھے۔ گویا موروثی بادشاهت کے دعویدار کبھی صنعتی بورژوازی کی بادشاهت بن سکتے تھے، یا بورژوا بادشاهت بدل کر موروثی جاگیردار شرفا کی بادشاهت میں ڈھل سکتی تھی۔ گویا یه ممکن تھا که جاگیری ملکیت اور صنعتی ملکیت ایک تاج کے سائے میں میل ملاپ سے ره لیں حالاں که یه تاج دونوں میں سے کسی ایک هی کے سر چڑھ سکتا تھا — یا تو بڑے بھائی کے سر یا چھوٹے بھائی کے سر۔ گویا یه ممکن تھا که جاگیری ملکیت جب تک خود صنعتی ملکیت نهیں بن جاتی، صنعتی ملکیت اس سے بھائی چاره بنا کر رکھ سکتی هے۔ کل هنری پنجم مر جائے تو اس کی موت سے نواب پیرس جائزوارث والوں کا بادشاه نهیں مانے جائے گا جب تک وه اورلین والوں کا بادشاه هونے سے دست برداری نه لکھ دے۔ پھر بھی شاهی خاندانوں کو گھول دینے کے فلسفی، جن کی آواز آئین پر نظرثانی کا سوال آگے آنے کے ساتھ ساتھ اونچی هوتی گئی، جنهیں «Assemblée nationale» (۹۹) کا ایک روزنامه بھی سرکاری ترجمانی کے لئے مل گیا تھا اور جو آج تک (فروری ۱۸۵۲ء میں) برابر اپنے کام سے لگے هوئے هیں، یه سمجھے جا رهے تھے که ساری مشکل یه آ پڑی هے که دونوں شاهی خاندانوں کے درمیان مخالفت اور رقابت دور نهیں هوتی۔ آخر اورلین کے گھرانے کو هنری پنجم سے ملانے کی کوششیں رنگ لائیں، جو لوئی فلپ کی موت کے بعد شروع هوئی تھیں لیکن جیسا که عام طور سے شاهی خاندانوں کے جوڑتوڑ هوا کرتے هیں، جن دنوں قومی اسمبلی کی چھٹی رهتی تھی، اس ''انٹرول،، کے وقت میں پردے کے پیچھے یه جوڑ

توڑ خوب کھل کھیلتے تھے اور بجائے کسی سنجیدہ غرض کے ، ان میں پرانے چونچلوں کے جذباتی ڈھکوسلے زیادہ نظرآتے تھے ۔ اب جا کر انھوں نے ایک شاندار تماشے کی صورت اختیار کی جس میں ضابطہ پارٹی کو ، آج تک کے محض شوقیہ کھیل تماشے کی حیثیت سے نہیں ، بلکہ پورے اہتمام سے تمام حاضرین کے سامنے پردہ اٹھانا تھا ۔ اب کاغذی گھوڑے دوڑنے لگے ، پیرس سے وینس (۱۰۰) ، وینس سے کلیرمونت اور کلیرمونت سے پھر پیرس نامہ بروں کا تانتا لگ گیا ۔ گراف شمبور نے اعلان عام صادر فرمایا ، کہ وہ '' خاندان کے تمام ممبروں کی تائید کے بل پر ،، اپنی بحالی کا نہیں بلکہ '' قوم کی ،، بحالی کا تقاضا کرتے ہیں ۔ اورلین خاندان کا سلواندی ہنری پنجم کے قدموں پر جھک جاتا ہے ۔ جائزوارث گروہ‌والے کے پر مکھ بیرئے ، بینوا دی‌آزی ، سین پریست چل کر کلیرمونت پہنچتے ہیں کہ اورلین‌والوں کو کہہ سن کر منائیں مگر کچھ نتیجہ نہیں نکلتا ۔ شاہی خاندانوں کو گھول دینے کے حامی بہت دیر سے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ بورژوازی کے دونوں گروہوں کے مفاد ، خاندانی مفادوں کی صورت میں ، دو شاہی گھرانوں کے مفاد بن کر اور بھی کٹیلے ہو گئے ہیں ، ایک کو دوسرے کی برداشت بالکل نہیں رہی اور مروت یا رعایت سے کام لینے کو قطعی تیار نہیں ہیں ۔ اگر ہنری پنجم نواب پیرس کو اپنا جانشین بنانے پر راضی ہو (اب تک دونوں کو ملانے کی کوشش میں صرف اسی قدر کامیابی ہو سکتی تھی) تب بھی اورلین کے گھرانے کو اس سے خاص فائدہ نہیں ہوتا کیوں‌کہ ہنری پنجم کے لاولد ہونے کی بنا پر یہ تو پہلے ہی سے ظاہر تھا ، البتہ اورلین‌والوں نے جولائی کے انقلاب کی بدولت اپنا دعوا جتنا آگے بڑھایا تھا وہ بھی ہاتھ سے جائے‌گا ۔ اسے اپنے سارے دعووں سے دست‌بردار ہونا پڑجائےگا ، وہ سارے خطاب جو کم‌وبیش سو سال کے معرکوں کے بعد بوربوں شاہی گھرانے کی پرانی شاخ سے بزور بازو حاصل کئے تھے ، چھوڑنے پڑیں‌گے اور تاریخی طور پر شاہی خاندان کے اپنے شجرہ نسب کی بدولت جوحقوق پہنچتے ہیں ان کی خاطر موجودہ حقوق سے ہاتھ دھونے ہوں گے ۔ چناں‌چہ گھل مل

کر ایک ہو جانے میں اورلین کے گھرانے کو صرف یہی سلتا تھا کہ وہ خوشی سے دست‌برداری کرے ، Legitimacy کی حالت پر واپس جائے اور پروٹسٹنٹ سرکاری چرچ سے توبہ کرکے پھر کیتھولک چرچ کا حلقہ بگوش ہو جائے ۔ اتنی پسپائی اختیار کرنے کے بعد بھی تخت جو ہاتھ سے گیا ، ملنےوالا نہیں تھا ، بلکہ صرف تخت شاہی کے پائے تک رسائی ہوتی جہاں انہوں نے آنکھ کھولی تھی ۔ اورلین‌والوں کے پرانے وزیر گیزو ، دیوشاتیل وغیرہ جو دوڑ دوڑکر کلیرمونت جاتے تھے تاکہ وقت آنے تک دونوں خاندانوں کو ملا کر تیار رکھیں وہ جولائی کے انقلاب کا صرف خمار ظاہر کرتے تھے ، بورژوائی بادشاہت کے اور شاہی بورژوا کے بارے میں ان سے مایوسی ٹپکتی تھی ، اور ان کی کوششیں کیا تھیں Legitimacy کو اس وہم میں سر پر سوار کر لینا تھا کہ نراج سے حفاظت کا یہ آخری تعویذ گنڈا ہے ۔ خود کو یہ حضرات اگرچہ اورلین اور بوربون گھرانوں کے درمیان پنچ بنائے بیٹھے تھے ، تاہم اصلیت میں وہ اورلین‌والوں کو چھوڑ کر نکلے تھے اور پرنس ژوان ویل انہیں اسی حیثیت سے دیکھتا تھا ۔ ادھر اورلین‌والوں کا زیادہ جاندار اور جاں باز حصہ تیئر ، باز اور دوسرے لوگ لوئی فلپ کے خاندان کو زیادہ آسانی سے قائل کر سکتے تھے کہ جب موروثی بادشاہت کی بحالی کے سارے دعوےدار اس پر آمادہ ہیں کہ دونوں شاہی خاندانوں کو ملا کر ایک کر دیں اور ان کے گھل‌مل جانے سے ظاہر ہے کہ اورلین‌والوں کو اپنے شاہی موروثی حقوق سے دست‌بردار ہونا پڑےگا تو یہ صورت‌حال ان کی خاندانی روایات کے عین مطابق ہے کہ وہ فی الحال رپبلک کو مان لیں اور اس وقت کی گھات میں رہیں جب حالات پلٹا کھا کر پریسیڈنٹ کی کرسی کو ہی تخت بنا دیں ۔ شروع میں افواہ پھیلی کہ پرنس ژوان‌ویل نے رپبلک کے پریسیڈنٹ کی امیدواری کے لئے اپنا نام دیا ہے ۔ لوگوں کو اس بات کی کرید لگ گئی ۔ جب کئی مہینے گزر گئے تو ستمبر کے مہینے میں آئین پر نظرثانی کی تجویز ناکام ہو جانے کے بعد اس کی امیدواری کا عام اعلان کر دیا گیا ۔

اس طرح سے اورلین اور جائزوارٹ‌والے دونوں شاہی خاندانوں کو ملا دینے کی ساری کوششیں تو اکارت ہو ہی گئیں، انھوں نے پارلیمنٹ کے اندر بھی ان کی یک سوئی یعنی مشترکہ ریپلکن شکل برباد کردی جس سے ضابطہ پارٹی کے اجزا بکھر کر اپنے اپنے ٹھکانے پہنچ گئے۔ پھر کلیرمونت اور وینس کے درمیان فاصلہ جتنا بڑھتا گیا، اور پرنس ژوان ویل کی امیدواری زور پکڑتی گئی اسی نسبت سے جائزوارٹ‌والوں اور بوناپارٹ کے وزیر فوشے کے درمیان بات‌چیت بڑھی اور اس میں سنجیدگی آتی چلی گئی۔

ضابطہ پارٹی میں پھوٹ پڑی تو صرف یہی نہیں کہ اصلی اجزا بکھر کر الگ ہو جاتے بلکہ باری باری دونوں بڑے گروہ آپس میں بھی بکھرتے چلے گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پرانے اختلافی رنگ جو کبھی آپس میں دونوں کیمپوں کے اندر برسرپیکار رہا کرتے تھے (اورلین اور جائزوارٹ‌والے دونوں کیمپوں میں دست‌وگریبان رہتے تھے) اسی طرح پھر سے پھیل پڑے ہیں جیسے سوکھے کیچوے (infusoria) پانی لگتے ہی پھر زندہ ہو جاتے ہیں؛ معلوم ہوتا تھا کہ ان کے اندر زندگی کی اتنی کافی لہر دوڑ گئی ہے کہ اب اپنے الگ الگ گروپ بنا کر وہ باہمی مفادوں کے ٹکراؤ پر کمربستہ ہو سکتے ہیں۔ جائزوارٹ‌والوں کے تصور میں پھر وہی زمانہ پھر گیا جب تویلری محل اور مرسان پویلین کے درمیان، ویلیل اور پولی‌نیاک (۱۰۱) کے درمیان ٹھنی رہتی تھی۔ اورلین‌والوں کو ان سنہرے دنوں کی یاد تازہ ہو گئی جب گیزو، مولے، برولی، تیئر اور اودی‌لوں بارو کے درمیان اکھاڑے جمتے تھے۔

ضابطہ پارٹی کا وہ حصہ جو آئین پر نظرثانی کے حق میں تھا، لیکن اس پر باہمی اتفاق رائے نہیں رکھتا تھا کہ نظرثانی کس حد تک ہو، جس میں جائزوارٹ‌والوں کا ایک فریق ایک طرف سے بیرئے اور فالو کی سرکردگی میں اور دوسری طرف سے لاروش‌ژاکلین کی سرکردگی میں شریک تھا اور اورلین‌والوں میں سے مولے، برولی، مونتالامبیر اور اودی‌لوں بارو کی زیر سرکردگی وہ لوگ بھی جو روز کی کش‌مکش سے تنگ آچکے تھے، انھوں نے بوناپارٹ کے حامی، پارلیمنٹ کے

ممبروں سے معاملہ کیا کہ یہ تحریک کی جائے جس میں ہر قسم کی گنجائش ہے اور کوئی قطعی بات نہیں :

''اس غرض سے کہ قوم اپنے اقتدار اعلا کو پوری طرح کام میں لا سکے ، ذیل میں دستخط کرنےوالے نمائندے تحریک کرتے ہیں کہ آئین پر نظرثانی کی جائے - ''

انھی دنوں میں پارلیمنٹ کے ان ممبروں نے اتفاق رائے سے اپنے ترجمان توکویل کی زبانی یہ اعلان کر دیا کہ قومی اسمبلی کو ریپبلک توڑنے کی تجویز لانے کا کوئی حق نہیں ہے، یہ حق صرف اس ایوان کا ہے جو آئین پر نظرثانی کرنے کے لئے بیٹھے - اس کے علاوہ ان کے اعلان میں تھا کہ آئین پر صرف ''قانونی'' اصول کے ماتحت ھی نظرثانی کی جا سکتی ہے، یعنی صرف اس صورت میں کہ آئین کی رو سے تمام ووٹوں کے تین چوتھائی نظرثانی کے حق میں آئیں - چھ دن تک طوفانی بحثا بحثی کے بعد جیسا کہ پہلے سے اندازہ تھا، ۱۹ جولائی کو نظرثانی کی تجویز گر گئی - اس کے حق میں ۴۴۶ ووٹ آئے اور خلاف ۲۷۸ - اورلین والوں میں جو انتہائی لوگ تھے، تیئر، شنگارنیے اور دوسروں نے ریپبلکنوں اور ''مونٹین'' والوں کی تائید میں ووٹ دئیے -

اس طرح پارلیمنٹ کی اکثریت نے تو آئین کے خلاف رائے دی لیکن آئین نے خود اقلیت کے حق میں رائے دی اور فیصلہ اسی رائے پر ہونا تھا - سوال یہ ہے کہ کیا ضابطہ پارٹی نے آئین کو ۳۱ مئی ۱۸۵۰ء اور ۱۳ جون ۱۸۴۹ء کے دن پارلیمنٹ کی اکثریت رائے کا پابند نہیں بنایا تھا؟ کیا اب تک اس کی پالیسی یہ نہیں رہی تھی کہ آئین میں لکھے ہوئے پیراگراف پارلیمنٹری اکثریت کے فیصلے کے ماتحت رہیں؟ کیا اس نے ڈیموکریٹوں کو خود یہ موقع نہیں دیا تھا کہ وہ قانون کے لفظوں کو پرانے زمانے کی وہم‌پرستی کی طرح چاٹ رہے ہیں؟ کیا اس نے ڈیموکریٹوں کو اس وہم‌پرستی کے قصور کی سزا نہیں دی تھی؟ لیکن فی الحال آئین پر نظرثانی کا

مطلب سوائے اس کے کچھ نہ تھا کہ پریسیڈنٹ کے اختیارات کی مدت بڑھا دی جائے اور آئین کی مدت بڑھانے کا مطلب صرف اتنا تھا کہ پریسیڈنٹ کو ہٹا دیا جائے۔ پارلیمنٹ نے پریسیڈنٹ کے حق میں فیصلہ دیا لیکن خود آئین نے پارلیمنٹ کے خلاف فیصلہ صادر کر دیا۔ مطلب یہ کہ بوناپارٹ نے جب آئین چاک کر کے پھینکا تو پارلیمنٹ کی مرضی پر عمل کیا اور جب پارلیمنٹ توڑ دی تو آئین کا منشا پورا کر دیا۔

پارلیمنٹ نے آئین کو، اور آئین کے ساتھ ھی اپنے اقتدار کو ''اکثریت سے بالاتر،، قرار دیا تھا۔ پارلیمنٹ نے اپنے فیصلے سے آئین کو منسوخ کیا اور پریسیڈنٹ کے اختیارات کی میعاد بڑھا دی اور ساتھ ھی یہ اعلان کر دیا کہ جس وقت تک پارلیمنٹ کا وجود باقی ھے، نہ تو آئین مر سکتا ھے، نہ پریسیڈنٹ کے اختیارات زندہ رہ سکتے ھیں۔ جو اسے دفنانے آئے تھے وہ دروازے پر کھڑے رہ گئے۔ اس وقت جب پارلیمنٹ آئین پر نظرثانی کی بحثوں میں الجھی ہوئی تھی، بوناپارٹ نے جنرل براگے دی ایلئے کو پہلے آرمی ڈویژن کمانڈر کے عہدے سے ہٹا دیا، اس شخص سے تذبذب ظاہر ھو رھا تھا، اس کی جگہ جنرل مانیان کو مقرر کر دیا جو لیون کا فاتح تھا اور دسمبر کے دنوں میں کارنامے انجام دے چکا تھا، خود بوناپارٹ کا بنایا ھوا آدمی تھا، اور لوئی فلپ کے زمانے میں ھی بولون کی فوجی مہم کے سلسلے میں بوناپارٹ کے حمایتی کے نام سے اپنی شہرت کو کم‌وبیش بٹہ لگا چکا تھا۔

ضابطہ پارٹی نے آئین پر نظرثانی کے بارے میں جو فیصلہ کیا اس سے ظاہر ھو گیا کہ نہ تو وہ حکمرانی کے قابل ھے، نہ محکومی کے، نہ جینے کے، نہ مرنے کے، نہ رپبلک کو قبول کرنے کے، نہ اسے رد کرنے کے، نہ وہ اس حالت میں ھے کہ آئین پر آنچ نہ آنے دے اور نہ اس پوزیشن میں کہ اسے پھینک دے، نہ وہ پریسیڈنٹ سے مل کر کام کر سکتی ھے، نہ اس سے رشتہ توڑ سکتی ھے۔ اب کس سے آس تھی کہ ان سارے تضادوں کو سلجھائے؟ صرف کیلنڈر سے، واقعات کی رفتار سے آس رہ گئی تھی۔ واقعات پر

قابو رکھنے کی امید اس نے چھوڑ دی تو خود کو واقعات کے قابو میں دے دیا یعنی اس طاقت کے قابو میں دے دیا جسے وہ عوام سے ٹکراتے وقت برابر یکے بعد دیگرے اختیارات سونپتی چلی جا رہی تھی یہاں تک کہ اس طاقت کے آگے ضابطہ پارٹی کے ہاتھ میں کوئی بھی اختیار نہ رہ گیا۔ اور اس غرض سے کہ انتظامیہ طاقت کے سربراہ کو بغیر کسی روک ٹوک کے میدان صاف ملے، کہ وہ اسی پارٹی سے ٹکر لینے کی تدبیریں زیادہ اطمینان سے سوچ سکے، بھر پور حملہ کرنے کے ذریعے پکے کر سکے، اپنے ہتھیار چن سکے اور قدم جما سکے، ضابطہ پارٹی نے ایسے نازک لمحے میں فیصلہ کیا کہ خود منظرعام سے ہٹ جائے اور پارلیمنٹ کا اجلاس ۱۰ اگست سے ۴ نومبر تک تین مہینے کے لئے برخاست کر دیا جائے۔

اتنا ہی کافی نہ تھا کہ پارلیمنٹری پارٹی دو بڑے گروہوں میں بٹ گئی اور پھر ان دو گروہوں کے اندر بھی الگ الگ پرزے اڑنے لگے، اوپر سے یہ ہوا کہ پارلیمنٹ کے اندر کی اور باہر کی ضابطہ پارٹی نے ایک دوسرے سے منہ پھیر لیا۔ بورژوازی کی طرف سے زبان اور قلم چلانےوالے، اس کے پلیٹ‌فارم اور اخبار، یعنی بورژوازی کے دماغ اور خود بورژوازی، وہ جو نمائندے تھے اور وہ جن کی نمائندگی کی جاتی تھی دونوں ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے، ایک کی بات دوسرے کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

دیہاتی صوبوں میں جائزوارث‌والے، جن کی نظر محدود لیکن ولولہ بےپناہ تھا، خود اپنے پارلیمنٹری لیڈروں بیرئے اور فالو کے سر الزام تھوپنے لگے کہ وہ بوناپارٹ کے کیمپ سے مل گئے اور ہنری پنجم کو دغا دے گئے۔ ان کے بچکانے دماغوں میں یہ بات بیٹھ گئی کہ یہ کوئی ڈپلومیسی نہیں بلکہ آدمی نے ٹھوکر کھائی ہے۔

تجارتی کاروباری بورژوازی اور اس کے سیاست‌دانوں میں اور بھی بری طرح اور زوردار لے دے شروع ہو گئی۔ جائزوارث والے تو اپنے سیاست‌دانوں کو اصولوں سے مکر جانے کا ہی قصوروار

ٹھیرا رہے تھے، یہاں کاروباری بورژوازی نے اپنے سیاسی کارندوں کو الٹا ملزم گردانا کہ ایسے اصولوں سے کیوں لپٹے رہے جن کا کچھ فائدہ نہ تھا۔

میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں کہ جب سے وزارت میں فولد شامل ہوا کاروباری بورژوازی کا وہ حصہ جو لوئی فلپ کے زمانے میں اختیارات کا شریک غالب رہا تھا یعنی اوپر کے مالیاتی شرفا کا حلقہ، وہ بوناپارٹ کا حامی بن گیا۔ فولد نہ صرف یہ کہ شیئر بازار میں بوناپارٹ کی وکالت بلکہ بوناپارٹ کے سامنے شیئر بازار کی وکالت بھی کیا کرتا تھا۔ مالیاتی شرفا کی پوزیشن ان کے یورپی ترجمان لندن کے اخبار «Economist» (۱۰۲) کی ایک تحریر میں بڑی خوبی سے بیان ہوئی ہے۔ پہلی فروری ۱۸۵۱ء کے شمارے میں «Economist» اخبار نے اپنے پیرس کے نمائندے کا یہ بیان شائع کیا:

''اب ہر طرف سے یہ بیان دئے جا رہے ہیں کہ فرانس کو سب سے مقدم امن و سکون کی ضرورت ہے۔ پریسیڈنٹ کی طرف سے قانون ساز اسمبلی کو جو پیغام بھیجا گیا اس میں بھی یہی جتایا ہے، قومی پلیٹ‌فارم سے بھی اسی بات کی گونج سنی گئی، اخبار بھی اسی پر زور دے رہے ہیں، گرجا گھر کے ممبروں سے بھی یہی صدا بلند ہے، بے‌چینی کے زرا بھی آثار ہوں تو سرکاری رقموں کے کاغذات پر اس کا فوراً اثر ظاہر ہوتا ہے اور انتظامیہ طاقت کی ہر ایک جیت پر سودا پکا رہتا ہے — اس سے بھی یہی صاف نظر آ رہا ہے۔''

۲۹ نومبر ۱۸۵۱ء کو یہ اخبار اپنی طرف سے لکھتا ہے:

''یورپ کے سارے شیئر بازاروں میں اب پریسیڈنٹ کو نظم و نسق کا پہرہ‌دار مان لیا گیا ہے۔''

اوپر کے مالیاتی شرفا نے انتظامیہ طاقت سے ضابطہ پارٹی کی پارلیمنٹری کش‌مکش کو ضابطے میں خلل ڈالنے کا قصور ٹھیرایا اور اس پر پریسیڈنٹ کی ہر ایک فتحیابی کو ضابطے کی فتح کہہ کر سینے سے لگایا۔ یہاں اوپر کے مالیاتی شرفا سے مطلب صرف وہی سیٹھ ساهوکار نہیں جو بڑے قرضے کا لین‌دین کرتے ھیں، سرکاری رقمیں بھناتے اور ان پر سٹہ لگاتے ھیں، کہ ان کے مفاد سرکاری طاقت کے مفاد کے ساتھ پوری طرح بندھے ہونے کی وجہیں صاف ظاہر ھیں۔ آج کے زمانے میں روپے کا سارا لین‌دین اور بینک کا کاروبار سرکاری قرضوں کے ساتھ خوب گتھا ہوا ھے۔ ان کے کاروباری سرمائے کا ایک حصہ لازمی طور سے ان سرکاری سکیورٹیز میں لگا رہتا ھے جن کا سود ملے اور ہاتھ کے ہاتھ رقم کھری کی جا سکے۔ بینکوں کے ڈپازٹ، یعنی وہ نقد رقم جو بینکوں کے راستے ہوکر بیوپاریوں اور صنعت‌کاروں میں پھیلی رہتی ھے اس کا ایک حصہ سرکاری قرضوں کے منافع سے آتا ھے۔ جب ہر زمانے میں یہ ہوتا رہا ھے کہ سرکاری طاقت کی مضبوطی تمام نقد سودوں کے بازار اور اس بازار کے مہنتوں کے لئے تائیدغیبی بنی رہی ھے تو اب اس کے خلاف کیسے ہو سکتا تھا جب کہ ہر آنے والے سیلاب سے یہ خطرہ تھا کہ پرانی ریاستیں بھی ڈوب جائیں اور ساتھ میں ان کے سرکاری قرضے بھی؟

صنعتی بورژوازی جسے ضابطے اور نظم و نسق کی رٹ لگی رہتی ھے، وہ بھی پریسیڈنٹ کے ساتھ ضابطہ پارٹی کی پارلیمنٹری چپقلش سے ناراض ہوتی تھی۔ جنرل شنگارنیسے کو برطرف کرنے کے سلسلے میں ۱۸ جنوری کو جو ووٹنگ ہوئی اس کے بعد پارلیمنٹ کے ممبر تیئر، آنگلس، سینٹ‌بیوف وغیرہ کو ان کے اپنے اپنے حلقۂ انتخاب کی طرف سے، جو صنعتی علاقوں میں پھیلے تھے، عام نکتہ‌چینی کا نشانہ بنایا گیا کہ ان لوگوں نے ''مونٹین،، سے کولیشن بنا کر خصوصیت سے نظم و ضبط کے معاملے میں دغا کی ھے۔ جیسا کہ ذکر آ چکا ھے کہ پریسیڈنٹ سے ضابطہ پارٹی کی جو کھینچا تانی چل رہی تھی اس میں جس طرح بڑھ بڑھ کر دعوے کئے گئے، طعنے

دئیے گئے اور گھٹیا داؤپیچ کھیلے گئے ان کی داد کچھ بہتر نہیں ملنےوالی تھی تو اب بورژوازی کا یہ حصہ جس کا پارٹی کے نمائندوں سے صرف اتنا تقاضا تھا کہ فوجی طاقت کو اپنی پارلیمنٹ کے ھاتھ سے نکل کر بلامقابلہ ایسے جانبھار شخص کے قبضے میں جانے دیں جو حکومت پر دانت لگائے بیٹھا ھے اب وہ ان داؤپیچ کی بھی ضرورت نہ سمجھتا تھا جو پہلے ھی اپنی غرض کو بہت کھیلے جا چکے تھے۔ بورژوازی کے اس حصے نے دکھا دیا کہ اس کی سماجی مصلحتوں، نجی طبقاتی مصلحتوں اور سیاسی اقتدار کی مصلحتوں کی خاطر جو بھی کش‌مکش ھوتی ھے وہ اب اس کے ذاتی کاروبار میں رکاوٹ ڈالنے کے سبب ناگوار گزرتی ھے اور نقصان پہنچاتی ھے۔

اضلاع کے صدرمقامات پر بورژوائی معززین نے جن میں میونسپلٹی کے ممبر، کاروباری عدالتوں کے جج وغیرہ شامل تھے، قریب قریب ھر جگہ، جہاں بوناپارٹ دورہ کرتا پہنچا خوشامدانہ استقبال کیا۔ دی ژون تک میں استقبال ھوا جہاں اس نے قومی اسمبلی پر بے لگام حملے کئے اور خاص کر ضابطہ پارٹی کو نکتہ چینی کا نشانہ بنایا۔

جب تک کاروبار مزے میں چلتا رھا — جیسا کہ ۱۸۵۱ء کے شروع میں چل رھا تھا، کاروباری بورژوازی کو کسی قسم کی بھی پارلیمنٹری کھینچاتانی برداشت نہ تھی کہ کہیں اس کے کارن بزنس کو نقصان نہ پہنچے۔ جب کاروبار ٹھنڈا پڑا — جیسا کہ فروری ۱۸۵۱ء کے آخر سے مستقل خرابی آئی — تو وھی کاروباری بورژوازی شکایت کرنے لگی کہ پارلیمنٹری کش مکش کے کارن بزنس اٹک رھی ھے، اسے فوراً ختم کرنا چاھئے تاکہ کاروبار میں پھر سے جان پڑنے کی راہ کھلے۔ آئین پر نظر ثانی کی بحثابحثی خاص انھی دنوں چل رھی تھی جب کاروبار مندا تھا۔ چوں‌کہ سارا معاملہ یہ درپیش تھا کہ موجودہ سرکاری نظام چلنے دیا جائے یا اسے ختم کیا جائے، تو بورژوازی خود کو اور بھی حق بجانب سمجھتی تھی اپنے نمائندوں سے یہ مطالبہ کرنے میں کہ وہ اس اذیت‌ناک عبوری حالت کو جلدی سے نمٹائیں اور جو ڈھچر

چل رہا ہے اسے جوں کا توں چلنے دیں۔ اس معاملے میں کوئی اختلاف نہ تھا۔ عبوری حالت کا خاتمہ چاہنے کا مطلب وہ خوب سمجھتی تھی کہ حالات جوں کے توں باقی رہیں اور ان کا فیصلہ کھٹائی میں ڈال دیا جائے۔ جو ڈھچر چل رہا تھا اسے باقی رکھنے کی صرف دو ہی صورتیں تھیں: یا تو بوناپارٹ کو مختار کل کی حیثیت سے رہنے دیا جاتا یا پھر آئین کی رو سے اسے رخصت کرکے کوے‌نیاک کو اس کی جگہ پریسیڈنٹ چن لیا جاتا۔ بورژوازی کا ایک حصہ دوسری صورت کی طرف مائل تھا لیکن وہ اپنے نمائندوں کو اس سے بہتر مشورہ نہ دے سکا کہ وہ خاموش رہیں اور اس دہکتے ہوئے سوال کو چھیڑیں ہی نہیں۔ وہ یہ سوچ بیٹھا تھا کہ اگر اس کے نمائندے زبان نہ کھولیں تو بوناپارٹ عمل نہ کرے۔ وہ شترمرغ جیسی پارلیمنٹ چاہتا تھا جو اپنا سر ریت میں چھپالے تاکہ نظر ہی میں نہ آئے۔ بورژوازی کا دوسرا حصہ چاہتا تھا کہ اب بوناپارٹ پریسیڈنٹ کی کرسی پر جما ہوا ہے تو اسے جما رہنے دیا جائے تاکہ جیسا ہوتا آرہا ہے، ویسا ہی ہوتا رہے۔ اسے یہ پریشانی تھی کہ اس کی پارلیمنٹ کھلے عام آئین کی خلاف‌ورزی کرنے کو اور اختیارات سے چپ‌چاپ ہاتھ اٹھانے کو تیار نہیں ہے۔

دیہی حلقوں کی جنرل کونسلیں، جو بڑی بورژوائی کے صوبائی نمائندہ ادارے تھے، انھوں نے قومی اسمبلی کی تعطیل کے دنوں میں ۲۵ اگست کے بعد سے اپنے اجلاسوں پر قریب قریب ایک آواز سے پارلیمنٹ کے خلاف آئین پر نظرثانی اور بوناپارٹ کے حق میں اعلان کر دیا۔

اپنے پارلیمنٹری نمائندوں سے بورژوازی نے جو بے تعلقی برتی وہ تو تھی ہی مگر اس سے بھی زیادہ غصہ ظاہر کیا اپنے ادبی نمائندوں اور ذاتی اخباروں پر۔ ان سے بورژوازی نے کوئی لگی لپٹی نہیں رکھی۔ صرف فرانس نہیں بلکہ سارا یورپ حیران رہ گیا یہ دیکھ‌کر کہ بورژوائی عدالتوں نے ان بورژوا اخبارنویسوں کو جنھوں نے بوناپارٹ کے طاقت ھتھیا لینے کی نیت پر کسی قسم کا

حملہ کیا یا ان اخباروں پر جنھوں نے بورژوازی کے سیاسی حق پر انتظامیہ طاقت کی دست‌درازی کے خلاف زرا زبان کھولی، کس بےدردی سے جرمانے کئے اور کیسی کیسی قیدوبند کی شرمناک سزائیں دیں۔

جیسا کہ میں دکھا چکا ہوں، جب پارلیمنٹ کی ضابطہ پارٹی نے امن و سکون کی ضرورت کا شور مچا مچا کر خود کو نچلا بٹھانے کا سامان کر لیا، جب اس نے دوسرے سماجی طبقوں سے کٹا چھنی کرنے میں خود اپنے ہاتھ سے وہ حالات ڈبو دئے جو خود اسی کی عملداری، ایک پارلیمنٹری عملداری قائم رکھتے، جب اس نے کھلم کھلا کہہ دیا کہ بورژوازی کی سیاسی حکمرانی اور اس کی سلامتی یا وجود کا ایک ساتھ رہنا ممکن نہیں، تو پھر پارلیمنٹ سے باہر کے عام بورژوا لوگوں نے بھی پریسیڈنٹ کے آگے جی حضوری کرکے، پارلیمنٹ کو رسوا کرکے، اپنے ھی اخباروں کے ساتھ بے دردی کا برتاؤ کرکے بوناپارٹ کو شہ دے دی کہ وہ اس بورژوازی کے زبانی اور قلمی حمایتیوں کو، سیاست‌دانوں اور اھل قلم کو، تقریری پلیٹ‌فارموں اور اخباروں کو کچل کر رکھ دے، ان کا صفایا کردے اور یہ سب اس غرض سے کیا کہ پھر کسی خرخشے کے بغیر بورژوازی ایک طاقتور اور مختارکل حکومت کے سائے میں اپنے ذاتی معاملات کی دیکھ بھال میں لگ جائے۔ بورژوازی نے دو ٹوک اعلان کر دیا کہ وہ خود اپنی سیاسی حکمرانی سے جان چھڑانے کی آرزومند ھے اور اس لئے آرزومند ھے کہ حکمرانی میں مشکلات اور خطرے پیش آئیں‌گے۔

اور یہ پارلیمنٹ سے باہر کی بورژوازی جسے خود اپنے طبقے کی حکمرانی کی خاطر پارلیمنٹری اور قلمی جدوجہد تک گوارا نہ تھی، جس نے ان لیڈروں تک کو دغا دی جو یہ جدوجہد چلا رہے تھے، اب یہی بورژوازی پرولتاریہ کو قصوروار ٹھیرانے کی ھمت کرتی ھے کہ وہ خونی مقابلے کے میدان میں، موت و حیات کی کش مکش میں اس کی طرف سے کیوں نہیں اترا۔ وہ بورژوا جو ھر منٹ اپنے طبقے کے مشترکہ مفاد کو، یعنی سیاسی مقاصد کو چھوٹے چھوٹے ذاتی، گھٹیا اور ذلیل اغراض پر قربان کرتا تھا اور اپنے نمائندوں

سے بھی یہی قربانی مانگتا تھا، اب اس پر ھائے واویلا کرتا ھے کہ پرولتاریہ نے اپنے مادی فائدوں کے لئے ھمارے اونچے سیاسی مفاد قربان کر دئے۔ وہ خود کو نہایت عالی ظرف ھستی قرار دیتا ھے جسے ٹھیک طرح سمجھا نہیں گیا اور جب فیصلے کا وقت آیا تو پرولتاریہ نے اشتراکیوں کے بہکاوے میں پڑکر اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ یہ ھائے واویلا پوری بورژوائی دنیا میں گونجتی ھے اور یہی آوازیں پلٹتی ھیں۔ یہاں میرا روئے سخن ظاھر ھے کہ جرمن کم ظرفوں کی طرف، سیاسی شاطروں اور ان کے چھٹ بھیاؤں کی طرف نہیں ھے۔ فی الحال میری نظر میں وھی اخبار «Economist» ھے جو ۲۹ نومبر ۱۸۵۱ء کو بھی، یعنی سرکار کا تختہ الٹے جانے سے صرف چار دن پہلے تک بوناپارٹ کو ''نظم و نسق کا پہرہ دار،، قرار دے رھا تھا اور تیئروں اور بیرئے کو ''انارکسٹ،،۔ اور پھر ۲۷ دسمبر ۱۸۵۱ء کو جب بوناپارٹ ان ''انارکسٹوں،، کو ٹھنڈا کر چکا، تو یہی اخبار چیخ پکار کرتا ھے کہ ''گستاخ، بے ادب، بدتمیز اور کوڑھ مغز پرولتاری عوام،، نے ''سوسائٹی کے درمیانی اور اونچے درجےوالوں کی ذھانت، لیاقت، تمیزداری، اخلاقی اثر، دماغی صلاحیت اور اخلاقی برتری،، کو دغا دی ھے، حالاں کہ کوڑھ مغز، بد تمیز اور بدطینت لوگ نکلے تو وہ یہی بورژوازی کے لوگ تھے۔

یہ صحیح ھے کہ ۱۸۵۱ء میں فرانس کو ایک طرح کا کاروباری جھٹکا لگا۔ فروری کے آخر میں سال کی برآمد ۱۸۵۰ء کے مقابلے میں گرنے لگی۔ مارچ میں بیوپار مندا ھوا اور فیکٹریوں پر تالے پڑنے شروع ھو گئے۔ اپریل میں دیہات کے صنعتی حلقوں کی حالت ویسی ھی خستہ نظر آنے لگی جیسے انقلاب فروری والے دنوں میں تھی۔ مئی میں بھی کاروبار کی حالت کچھ سدھری نہ تھی۔ ۲۸ جون تک یہ نوبت پہنچی کہ بینک آف فرانس میں ڈپازٹ کی بھاری رقموں کے ھوتے ھوئے، مال پر اڈوانس کی مانگ اتنی ھی گری تھی، رقمیں اٹکی پڑی تھیں اور اس سے ظاھر ھوتا تھا کہ پیداوار وھیں ٹھیری ھوئی ھے۔ کہیں اکتوبر کے وسط میں جاکر پھر سے کاروبار

کی حالت کچھ سدھرتی نظر آئی۔ فرانسیسی بورژوازی کا کہنا تھا کہ بیوپار کے اٹکنے کا سبب سیاسی حالات ہیں، پارلیمنٹ اور انتظامیہ طاقت کی رسہ کشی ہے، ریاست کا ایک عارضی عبوری حالت میں ہونا ہے اور مئی ۱۸۵۲ء کے دوسرے اتوار کو جو خطرناک آثار نظر آتے ہیں وہ بھی اس کا سبب ہیں۔ مجھے اس سے انکار نہیں کہ یہ سب حالات بھی پیرس میں اور دیہی علاقوں (ڈپارٹمنٹوں) میں صنعت کی بعض شاخوں پر پست ہمتی کا سایہ ڈال رہے تھے۔ تاہم کچھ بھی ہو، سیاسی حالات کا یہ اثر مقامی تھا اور زیادہ گہرا نہ تھا۔ کیا اس بیان کے لئے اتنا ثبوت کافی نہیں ہے کہ کاروبار کی حالت اکتوبر کے وسط میں سدھرنے لگی؟ یعنی عین اس وقت جب سیاسی صورت حال اور بھی بگڑ چکی تھی، سیاسی افق پر کالی گھٹا چھانے لگی تھی، اور ہر لمحے یہ نظر آتا تھا کہ ایلی سے ئی محل سے اب کوئی بجلی کڑک کر گرنے والی ہے۔ فرانسیسی بورژوا، جس کی ''ذہانت، لیاقت، دور اندیشی اور ذہنی صلاحیت،، اس کی ناک سے آگے نہیں بڑھنے پاتی، ان دنوں جب لندن میں صنعتی نمائش (۱۰۳) چل رہی تھی، اپنی کاروباری بدحالی کا سبب ناک کے نیچے دیکھ سکتا تھا۔ ٹھیک اس زمانے میں جب فرانس کے کارخانے بند ہو رہے تھے، انگلینڈ میں تجارتی فرموں کے دیوالے نکلنے شروع ہو گئے۔ اپریل اور مئی کے دوران فرانس میں صنعتی بدحواسی انتہا کو پہنچ گئی۔ اپریل اور مئی کے دوران ہی انگلینڈ میں کاروباری سراسیمگی کی انتہا ہو گئی۔ فرانس کی اونی صنعت کی طرح انگلستان کی اونی صنعت کو بھی چوٹ پہنچی۔ فرانس کے ریشم سازوں کی طرح انگلینڈ کے ریشم سازوں پر بھی زد پڑی۔ یہ صحیح ہے کہ انگلستان کے سوتی مل چلتے رہے، لیکن ۱۸۴۹ء اور ۱۸۵۰ء کا سا منافع نہیں رہا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ فرانس میں صنعتی بحران آیا تھا اور انگلستان میں تجارتی۔ جن دنوں فرانس کے کارخانے بند پڑے تھے، انگلینڈ میں ان کی سرگرمی بڑھی ہوئی تھی لیکن اس سے پہلے کے برسوں کی سی سازگار فضا میں کام نہیں کر رہے تھے۔ فرانس میں مال کی برآمد پر زیادہ

چوٹ پڑی تو انگلینڈ میں درآمد پر۔ ان دونوں کا مشترک سبب بالکل صاف تھا جسے فرانس کے سیاسی افق پر تلاش کرنا بےسود ہے۔ ۱۸۴۹ء اور ۱۸۵۰ء زبردست مادی خوش حالی کے سال تھے، اور ان میں پیداوار کھپت سے بڑھ گئی جس کا نتیجہ کہیں ۱۸۵۱ء میں جاکر معلوم ہوا۔ صنعتی نمائش کے امکانات نے ۱۸۵۱ء کے شروع سال میں پیداوار ضرورت سے آگے بڑھادی۔ اس کے علاوہ کچھ اور بھی خاص اسباب سہیا ہو گئے: اول تو یہ کہ ۱۸۵۰ء اور ۱۸۵۱ء میں کپاس کی فصل کمزور رہی، پھر جتنی کی امید کی جارہی تھی اس سے کہیں زیادہ کپاس آنا یقینی ہوگیا۔ کپاس کے بھاؤ پہلے تو خوب چڑھے پھر ایک دم تیزی سے گرنے لگے، مختصر یہ کہ ان کے داموں میں بہت اونچ نیچ ہو گئی۔ کچے ریشم کی فصل، کم‌ازکم فرانس میں تو اوسط سے بھی بہت کم اٹھی۔ اونی مال بننا ۱۸۴۸ء کے بعد سے اتنا پھیل گیا کہ اون کی پیداوار سپلائی میں اس کا ساتھ نہ دے سکی، چناں‌چہ کچے اون کا بھاؤ اتنا بڑھا کہ تیار مال کی قیمتوں سے اس کا اوسط نہیں بیٹھا۔ ہمارے سامنے دنیا کے مارکٹ کی تین صنعتوں کے کچے مال کی حالت ہے جہاں رکاوٹ پڑنے کے تین مختلف سبب موجود ہیں۔ ان خاص حالات و اسباب کے علاوہ ۱۸۵۱ء کا یہ ظاھرا سنکٹ سوائے اس کے کچھ نہ تھا کہ فالتو پیداوار اور حد سے بڑھی ہوئی سٹہ‌بازی کے کارن ہر ایک صنعتی چکر گھومنے میں ہمیشہ کاڑی کہیں نہ کہیں اٹک جاتی ہے اور پھر سارا زور لگاکر جنونی پن سے اس چکر کے آخری حصے کو گھمایا جاتا ہے اور گھماؤ پورا کر کے پھر اسی نقطے پر پہنچ جاتے ہیں جہاں سے چلے تھے۔ وہ نقطہ ہے عام کاروباری بحران۔ تجارت کی تاریخ میں جب یہ وقفے آتے ہیں تو انگلینڈ میں کاروباری دیوالے نکلنے لگتے ہیں اور فرانس کی صنعت ہی چوپٹ ہو جاتی ہے۔ اس کی کچھ تو وجہ یہ کہ تمام منڈیوں سے انگریزوں کے مقابلے کی بدولت اس کا ناطقہ بند کیا جاتا ہے اور ان حالات میں وہ مقابلے پر قدم نہیں جمائے رہ سکتی، اور کچھ یہ وجہ کہ اس کے پاس ایسی صنعت

ہے جو (ضرورت کا نہیں) آسائش کا سامان تیار کرتی ہے اور جب بھی لین دین میں کسی طرح کا خلل پڑتا ہے، آسائشی سامان کی صنعت پر خاص کر اس کا اثر ظاہر ہوتا ہے۔ اس طرح عام بحرانوں کے علاوہ فرانس کے اندر قومی تجارتی بحران بھی آجاتے ہیں جن پر فرانس کے مقاسی حالات کا اثر اتنا نہیں پڑتا بلکہ اس سے کہیں زیادہ دنیا بھر کے مارکٹ کی عام حالت ان بحرانوں کو جدھر چاہتی ہے لے جاتی ہے، اور جیسے چاہتی ہے چلاتی اور طے کرتی ہے۔ فرانسیسی بورژوا جن غلط فہمیوں میں مبتلا تھا ان کا انگریزی بورژوا کے سلجھے ہوئے خیالات* سے مقابلہ کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ لیورپول کی ایک بہت بڑی فرم نے ۱۸۵۱ء کی اپنی سالانہ کاروباری رپورٹ میں لکھا کہ:

''یہ سال جو ابھی تمام ہوا، اب تک کے برسوں میں عجیب گزرا ہے کہ شروع میں اس سے جتنی امیدیں وابستہ کی گئی تھیں، سب کو جھٹلا گیا۔ بجائے اس زبردست خوش حالی کے، جس کی سب نے متفقہ امید لگائی تھی، یہ سال ایسا ہمت شکن نکلا کہ پچھلے پچیس برسوں میں کبھی اتنی دشواری نہ ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ بات صنعتی طبقے کے نہیں، تجارتی طبقے کے بارے میں صحیح ہے۔ اس سال کے شروع میں بغیر کسی شک و شبہ کے ایسے اثار تھے کہ نتیجہ جو نکلا اس کے برعکس نکلنا چاہئے تھا: مال کا اسٹاک کم رکا تھا، سرمایہ افراط سے تھا، خوراک کا سامان سستا اور فصل بہت اچھی نظر آتی تھی؛ یورپ کے امن میں کہیں خلل نہیں تھا اور نہ ملک میں کوئی سیاسی یا مالی دشواری کا سامنا تھا۔ واقعی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تجارت پہلے سے کہیں زیادہ پر پھیلائےگی... یہ جو الٹا نتیجہ نکلا یہ کس کے سر ڈالا جائے؟ ہم سمجھتے ہیں کہ درآمد اور برآمد دونوں کا مال حد سے زیادہ بڑھ گیا۔ اگر ہمارے بیوپاری خود اپنی کارروائیوں کو مقررہ

حد کے اندر نہیں رکھ سکتے تو پھر توازن قائم رکھنے
کی کوئی صورت نہ ہوگی سوائے اس کے کہ ہر تین سال
میں ایک دفعہ بدحواسی پھیلا کرے۔ ،،

اب زرا تصور کریں کہ اس تجارتی بدحواسی میں گھر کر لین دین میں الجھے ہوئے دماغ کے ساتھ فرانسیسی بورژوا کی کیا حالت ہوگی کہ وہ مستقل عذاب میں مبتلا ہے، چکرا رہا ہے، سرکار کا تختہ الٹنے اور عام رائے دھندگی کا حق بحال ہونے کی افواہوں نے کان کھالئے ہیں، پارلیمنٹ اور انتظامیہ طاقت میں کٹاچھنی ہے، اورلین اور جائزوارث والوں میں الگ صف آرائی ہے، فرانس کے جنوب میں کمیونسٹوں کی سازشیں پھیلی ہیں، نیورے اور شیر کے دیہی حلقوں (ڈپارٹمنٹوں) میں شورشیں برپا ہیں، پریسیڈنٹ کے عہدے کے لئے کئی امیدواروں کی اشتہاربازی جاری ہے، اخباروں نے نعروں کا بازار چلا رکھا ہے، رپبلکنوں نے دھمکی دی ہے کہ ہتھیاروں کی مدد سے آئین کو بچائیں گے اور عام رائے دھندگی کا حق دلوائیں گے، ملک سے باہر جلاوطن ہیرو الگ اپنا وعظ سنا رہے ہیں، انھوں نے پیش گوئی کر رکھی ہے کہ مئی ۱۸۵۲ء کے دوسرے اتوار کو قیامت کا صور پھونکا جائے گا، — یہ سب تصور کریں تو سمجھ میں آجاتا ہے کہ اس ناقابل بیان ہنگامے میں، جہاں ملانے کی، نظرثانی کی، مدت بڑھانے کی، آئین کی، سازش کی، کولیشن کی، ملک سے باہر بھاگنے کی، طاقت ہتھیانے اور انقلاب برپا کرنے کی چیخ پکار میں کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی تھی، بورژوازی نے بوکھلا کر کیوں اپنی پارلیمنٹری رپبلک کو چیخ کر ڈانٹا کہ: ''وحشت ناک انجام بہتر ہے اس سے کہ وحشت کا کوئی انجام نہ ہو!،،

بوناپارٹ اس چیخ کا مطلب سمجھ گیا۔ اس کی سوجھ بوجھ ان قرضخواہوں کی بڑھتی ہوئی بے صبری نے تیز کر دی تھی جو دیکھ رہے تھے کہ ہر ایک غروب آفتاب کے ساتھ پریسیڈنٹ کی کرسی کا آخری دن، مئی ۱۸۵۲ء کا دوسرا اتوار نزدیک آتا

جا رہا ہے۔ آسمان پر ستاروں کی گردش زمینی قرض کی دستاویزوں کو گھور رہی ہے۔ یہ لوگ سچ مچ جوتشی بن گئے تھے۔ قومی اسمبلی نے بوناپارٹ کو اس امید سے محروم کر دیا تھا کہ اختیارات کی میعاد آئین کے مطابق بڑھا دی جائےگی۔ پرنس ژوان ویل کی امیدواری نے اب تذبذب کی مہلت بھی نہیں چھوڑی تھی۔

اگر کبھی کسی واقعے نے ظہور میں آنے سے بہت پہلے اپنا سایہ ڈالا ہے تو وہ بوناپارٹ کے ہاتھوں سرکار کا تختہ الٹنے کا واقعہ ہے۔ بہت پہلے ۲۹ جنوری ۱۸۴۹ء کو، چنے جانے کے صرف مہینہ بھر بعد بوناپارٹ نے شنگارنیے سے اس قسم کا خیال ظاہر کر دیا تھا۔ ۱۸۴۹ء کی گرمیوں میں اس کے ذاتی وزیراعظم اودی‌لوں بارو نے ڈھکے چھپے لفظوں میں، اور ۱۸۵۰ء کی سردیوں میں تیئر نے کھلے لفظوں میں سرکار کا تختہ الٹنے کی سیاست کا ذکر کیا۔ مئی ۱۸۵۱ء میں پیرسنی نے پھر ایک بار شنگارنیے کو ملانے کی کوشش کی۔ «Messager de l'Assemblée» (اسمبلی کے رپورٹر) (۱۰۴) نے اس بات چیت کو بآواز بلند کہہ ڈالا۔ بوناپارٹ کے اخبار ہر ایک پارلیمنٹری ہلچل کے موقع پر سرکار کا تختہ الٹے جانے کا خطرہ دکھاتے رہتے تھے۔ کرائسس جتنا قریب آ رہا تھا، ان کے لہجے کی سختی بڑھتی جا رہی تھی۔ بوناپارٹ جو ناؤنوش کی محفلیں ہر رات جمایا کرتا تھا جن میں بنے ٹھنے جعل ساز مذکرومونث جمع ہوتے تھے، جہاں آدھی رات ہونے آئی اور فرط شوق میں ان کی زبانیں کھلیں، خیالی گھوڑے بگٹٹ دوڑتے ہی اگلی صبح سرکار کا تختہ الٹنے کے فیصلے سنانے لگتے۔ تلواریں نیام سے باہر کھینچی جاتیں، جام کھنکائے جاتے، پارلیمنٹ کے ممبروں کو کھڑکی سے باہر پھینکا جاتا، سلطنت کا بار بوناپارٹ کے شانوں پر رکھا جاتا، یہاں تک کہ صبح ہوتے یہ منڈلاتے آسیب بکھر جاتے اور حیرت زدہ پیرس کو غیرمحتاط خبریں اڑانےوالوں اور بےتکلف ادھر کی ادھر لگانےوالوں کی زبانی پتہ چلتا کہ کل رات پھر ایک خطرہ تھا جو اس کے سر سے ٹل گیا ہے۔ ستمبر اکتوبر میں تو انقلاب حکومت کی افواہوں نے زرا

بھی دم نہیں لیا۔ سائے میں اب رنگین فوٹوپلیٹ کی طرح رنگ آ چلا۔ یورپ کے اخباروں سے اگر ستمبر اکتوبر کے ورق الٹے جائیں تو ان میں لفظ بہ لفظ اس مضمون کی اطلاعیں ملتی ھیں: ''سرکار کا تختہ الٹے جانے کی افواھیں پیرس میں گرم ھیں۔ کہا جا رہا ھے کہ راجدھانی پر رات کو فوج پھیل جائے گی اور صبح ھوتے فرمان نکل جائیں گے کہ قومی اسمبلی توڑی جاتی ھے، سینا کا علاقہ (ڈپارٹمنٹ) محاصرے کی حالت میں ھے، عام رائے دھندگی کا حق بحال کردیا گیا اور قوم کے نام اپیل جاری کی جاتی ھے۔ کہتے ھیں کہ بوناپارٹ کو ایسے وزیروں کی تلاش ھے کہ ان خلاف قانون فرمانوں کی تعمیل کر سکیں۔،، یہ اطلاعات ھمیشہ ایک بدقسمت لفظ پر تمام ھوتی ھیں: ''ملتوی،،۔ تختہ الٹنے کی دھن ھمیشہ سے بوناپارٹ کے دماغ میں سمائی ھوئی تھی۔ یہی دھن لے کر وہ فرانس واپس آیا تھا۔ اور اس پر یہ دھن ایسی سوار تھی کہ مستقل ظاھر ھوتی، اور گفتگو میں زبان سے نکل جاتی تھی۔ بوناپارٹ جب تک کمزور رھا مستقل طور پر اپنے خیال سے مکرتا رھا۔ انقلاب حکومت کا سایہ ایک آسیب یا بھوت تھا کہ پیرس والے چلتے پھرتے اس کے اتنے عادی ھو گئے کہ جب وہ گوشت پوست کے وجود میں سامنے اتر آیا تب بھی انھیں یقین ھی نہیں آتا تھا۔ پس اگر انقلاب حکومت کامیاب رھا تو اس کی وجہ یہ ھرگز نہیں کہ ''۱۰ دسمبری سوسائٹی،، کے سرغنہ نے سازش کو بہت ھی خفیہ رکھا تھا، اور قومی اسمبلی بےخبری میں ماری گئی۔ پھر بھی اگر اس میں کامیابی ھوئی تو بوناپارٹ کے بےپروائی سے زبان چلانے کے باوجود اور قومی اسمبلی کے اچھی طرح باخبر ھونے کے باوجود، صرف اس لئے ھوئی کہ پہلے سے واقعات کی رفتار کا یہی لازمی اور قطعی نتیجہ نکلنے والا تھا۔

۱۰ اکتوبر کو بوناپارٹ نے اپنے وزیروں سے کہہ دیا کہ وہ عام حق رائے دھندگی بحال کرنے کا فیصلہ کرچکا ھے۔ ۱٦ اکتوبر کو انھوں نے استعفے حوالے کردئے، ۲٦ تاریخ کو پیرس میں اطلاع عام ھوئی کہ تھوری نی کی وزارت بن گئی۔ اسی وقت پولیس

پریفیکٹ (انسپکٹر جنرل) کارلے کی جگہ موپا کو مقرر کردیا گیا۔ پہلی فوجی ڈویژن کے افسراعلا مانیان نے راجدھانی میں نہایت بھروسے کی پلٹنیں جمع کرلیں۔ ۴ نومبر کو قومی اسمبلی نے اپنا اجلاس شروع کیا۔ اسمبلی کو اب اس کے سوا کیا کرنے کو رہا تھا کہ جس راہ پر وہ چل چکی ہے اسے کم فاصلے میں طے کرے، اس پٹے ہوئے راستے کو پورا کرے اور ثابت کردے کہ جب اس کا دم نکل چکا تب دفن کیا گیا ہے۔

انتظامیہ طاقت سے ٹکرلینے میں اسمبلی کے ہاتھ سے جو پہلا مورچہ نکلا وہ وزارت تھی۔ اسے یہ نقصان اس ٹھاٹھ سے قبول کرنا پڑا کہ تھوری‌نی کی جھوٹ‌موٹ کی وزارت کو سچ‌مچ کی وزارت مان‌لیا۔ مستقل کمیشن کے سامنے جب مسٹر ژیرو نئی کابینہ کی طرف سے پیش ہوئے تو کمیشن والے ہنس پڑے۔ عام رائے دھندگی کا حق بحال کرنے کے جیسے بھاری اقدام کے لئے اتنی ہلکی وزارت! مگر لےدے کے ساری غرض اتنی تھی کہ پارلیمنٹ کے ذریعے سے کچھ نہیں کرنا، جو کچھ کرنا ہے پارلیمنٹ کے برخلاف۔

جس دن قومی اسمبلی کا اجلاس شروع ہوا اسی روز بوناپارٹ کا پیغام آپہنچا جس میں کہا گیا تھا کہ عام رائے دھندگی کا حق پھر سے بحال کیا جائے اور ۳۱ مئی ۱۸۵۰ء کا قانون منسوخ کردیا جائے۔ اسی روز وزیروں نے اس مطلب کا سرکاری اعلان سامنے رکھ دیا۔ قومی اسمبلی نے منسٹروں کی یہ تحریک کہ سرکاری اعلان کی فوری ضرورت ہے، ہاتھ کے ہاتھ رد کردی اور قانون کو بعد میں ۱۳ نومبر کے روز ۳۴۸ کے مقابلے میں ۳۵۵ ووٹوں سے منسوخ کردیا۔ اس طرح سے اسمبلی نے پھر ایک دفعہ اپنے منڈیٹ کے پرخچے اڑا دئے، پھر خواہ مخواہ تصدیق کردی کہ بجائے اس کے کہ وہ لوگوں کے آزادانہ ووٹ سے چنی ہوئی ایک جماعت ہو، اب محض ایک طبقے کی غاصبانہ پارلیمنٹ بن‌چکی ہے، پھر ایک بار تسلیم کرلیا کہ پارلیمنٹ کے دماغ کو قوم کے جسم سے جوڑنےوالے رگ پٹھے اس نے خود ہی کاٹ دئے ہیں۔

اگر انتظامیہ طاقت اپنی اس تجویز کے ذریعے کہ عام‌رائے

دھندگی کا حق بحال کیا جائے، قومی اسمبلی میں عوام سے اپیل کر رہی تھی، تو قانون ساز طاقت نے کوئسٹروں کا مسودہ قانون پیش کرکے عوام کی طرف سے فوج سے اپیل کی۔ اس مسودہ قانون سے اسمبلی کا منشا یہ تھا کہ فوج کو براہ راست طلب کرنے کا، پارلیمنٹ کی فوج بنانے کا اپنا حق پوری طرح منوائے۔ اس صورت میں جب قومی اسمبلی نے فوج کو اپنے اور لوگوں کے درمیان، اپنے اور بوناپارٹ کے درمیان پنچ مقرر کردیا، ریاست میں فوج کو فیصلہ کن طاقت مان لیا تو پھر اسے یہ بھی تصدیق کرنی چاہئے تھی کہ اس طاقت کو ہاتھ میں رکھنے کے دعوے سے وہ بہت پہلے ہی دست بردار ہو چکی تھی۔ بجائے اس کے کہ فوراً فوج طلب کرلیتی، اس نے فوج طلب کرنے کے اپنے حق کو بحثابحثی کا موضوع بنا کر، الٹا یہ ظاہر کردیا کہ خود اپنے کس بل پر بھروسہ نہیں رہا۔ پھر کوئسٹروں کے مسودہ قانون کو رد کرکے اسمبلی نے اپنی بےبسی بالکل ہی مان لی۔ اس مسودہ قانون کے پاس ہونے میں ۱۰۸ ووٹوں کی کسر رہ گئی: ''مونٹین،، نے اس کی تقدیر کا فیصلہ کردیا۔ ''مونٹین،،والوں کی وہ درگت بنی جو بریڈن کے گدھے کی بنی تھی، فرق اتنا کہ گدھے کو گھاس کے دو گٹھوں میں سے ایک چننا تھا جو زیادہ لبھاتا ہو، لیکن یہاں دو طرف سے مار پڑ رہی تھی، اور انھیں وہ مار چننی تھی جس کی چوٹ کراری پڑے۔ ایک طرف سے جنرل شنگارنیے کا خوف، دوسری طرف سے بوناپارٹ کا ڈر — ماننا پڑےگا کہ حالت کوئی بہت شاندار نہیں تھی۔

۱۸ نومبر کو ضابطہ پارٹی کے پیش کئے ہوئے قانون میں جو میونسپل الکشنوں کے بارے میں تھا، ایک ترمیم آئی۔ ترمیم یہ کہ میونسپلٹی کے انتخابات میں ووٹ دینے کے لئے حلقۂ انتخاب میں تین سال کے بجائے ایک سال کا قیام کافی سمجھا جائے۔ ایک ووٹ کی کمی سے ترمیم رہ گئی۔ مگر فوراً پتہ چل گیا کہ ایک ووٹ کی کمی اصل میں گننے کی غلطی تھی۔ دشمن گروہوں میں بٹ جانے کی وجہ سے ضابطہ پارٹی بہت پہلے پارلیمنٹ میں آزادانہ اکثریت کھوبیٹھی تھی۔ اب اس نے یہ بھی دکھا دیا کہ پارلیمنٹ

کے اندر کسی قسم کی اکثریت باقی نہیں ہے۔ قومی اسمبلی کے بس کی بات نہ رہی کہ فیصلے کرسکے۔ جن ذرّوں سے وہ مل کر بنی تھی وہ یوں بکھرے کہ اب انہیں جوڑنے والی کوئی تدبیر نہیں رہ گئی۔ اس نے آخری سانس لیا اور جان دے دی۔

آخر، جب آفت برپا ہونے میں کچھ ہی دن رہ گئے تھے، پارلیمنٹ سے باہر کی عام بورژوازی نے طے کیا کہ پارلیمنٹ کے اندر کی بورژوازی سے اپنا قطع تعلق دھوم دھام سے دکھا دیا جائے۔ تیئر نے جو پارلیمنٹری ہیرو کی حیثیت سے پارلیمنٹری حماقت کے ناقابل علاج مرض کا خاص کر مارا ہوا تھا، پارلیمنٹ کی موت کے بعد، اسٹیٹ کونسل سے مل کر پارلیمنٹ کے انداز کا ایک نیا شوشہ چھوڑا، یہ کہ ''قانون ذمہ داری،، بنایا جائے۔ مقصد یہ کہ پریسیڈنٹ کو آئین کی حدوں میں تھام کر رکھا جائے۔ جس طرح ۱۵ ستمبر کو ہو چکا تھا کہ پیرس میں نئے مارکٹ ہال کی بنیاد رکھتے وقت بوناپارٹ مسانیو سے کچھ پیچھے نہیں رہا تھا، اس نے منڈی کی عورتوں، یعنی مچھلی والیوں کے دل موہ لئے تھے، اور سچ پوچھئے تو ایک مچھلی والی کس بل میں سترہ چودھریوں کو بھاری پڑتی ہے، اسی طرح جب کوئسٹروں کا مسودہ قانون پیش ہو چکا تھا، اس نے ایلی سے ژی کے شاہی محل میں اپنے حمایتیوں کو دعوت پر بلا کر رنگرلیاں منائی تھیں، اس بار بھی ۲۵ نومبر کے دن بوناپارٹ نے صنعتی بورژوازی کو اپنی جیب میں ڈال لیا، یہ صاحبان سرکس میں جمع ہوئے تھے اس کے دست خاص سے لندن کی صنعتی نمائش کے انعامی تمغے پانے کے لئے۔ یہاں اس نے تقریر کی، اس کا ایک نمائندہ حصہ میں اخبار [illegible] سے نقل کرتا ہوں:

''اتنی انہونی کامیابیاں مجھ کو پھر یہ جتانے کا حق دیتی ہیں کہ فرانسیسی ریپبلک کیا عظمت حاصل کر سکتی ہے اگر اسے یہ موقع مل جائے کہ اس بے چینی کے سبب مستقل نقصان اٹھانے کے بجائے، جو ایک طرف

تو تقریر باز پھیلاتے ہیں، دوسری طرف موروثی بادشاہت کے خواب دیکھنے والے ، یہ ریپبلک اپنے اصلی مفادوں کی فکر کرے اور اپنے اداروں کی اصلاح میں لگ جائے ۔ (ہال کے ہر ایک کونے سے زور کی تالیاں بجتی ہیں اور دیر تک تالیوں کی گونج بلند رہتی ہے ۔) بادشاہت کے خوابوں نے تمام ترقیوں کا اور صنعت کی تمام شاخوں کا راستہ روک رکھا ہے ۔ ترقی کے بجائے محض کش مکش رہ گئی ہے ۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ لوگ جو پہلے شاہی طاقت اور شاہی prerogatives (خصوصی اختیارات) پر جان دیتے تھے ، اب وہی کنونشن (مقررہ چلن) کے چکر میں پڑ کر اس طاقت کو کمزور کرنے کی فکر میں لگے ہیں جو عام رائے دہندگی کے حق سے پیدا ہوتی ہے ۔ (دیر تک زور زور سے تالیاں بجتی ہیں ۔) ہم دیکھتے ہیں کہ وہی لوگ جنھوں نے انقلاب کے ہاتھوں سب سے زیادہ نقصان اٹھایا اور سب سے زیادہ اس کے شاکی تھے، وہی نیا انقلاب بھڑکانے کی فکر میں ہیں، وہ بھی اس خاطر کہ قوم کی قوت ارادی کو جکڑ دیا جائے... میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آنے والے زمانے میں امن و سکون ہوگا،،... وغیرہ وغیرہ (''واہ وا، واہ وا،، کی آوازیں بلند ہوتی ہیں ۔)

اس طرح سے صنعتی بورژوازی دوسری دسمبر کے انقلاب حکومت پر ، پارلیمنٹ کی تباہی پر ، خود اپنے اقتدار کی موت پر اور بوناپارٹ کی ڈکٹیٹری پر خوشامدی تالیاں بجا رہی تھی ۔ ۲۵ نومبر کو بجنے والی تالیوں کی گونج کا ۴ دسمبر کو توپوں کی گرج سے جواب ملا ۔ اور موسیو سلاندروز، جس نے سب سے زیادہ تالیاں بجائی تھیں اسی کے مکان پر توپ کے گولے بھی سب سے زیادہ بجے ۔

کروموییل نے جب (انگلینڈ میں) لمبی پارلیمنٹ (۱۰۵) کو توڑا تھا تو وہ تن تنہا پارلیمنٹ کے اندر پہنچا، اپنی گھڑی اتارلی تاکہ جو وقت مقرر کر رکھا تھا اس سے ایک منٹ بھی آگے

نہ چلنے پائے، اور ایک ایک ممبر کا مذاق اڑا کر، پھبتی کس کر، مزے لےلے کر پارلیمنٹ سے باہر نکال دیا۔ یہ نپولین، جو پہلے کے نمونےوالے نپولین سے بہت چھوٹا ہے، اٹھارویں برومیئر قانون‌ساز ادارے کی طرف چلا، اور اگرچہ آواز لرز رہی تھی، تاہم سزائے موت کا فیصلہ پڑھ کر سنا دیا۔ یہ دوسرا نپولین، جس کے ہاتھ کروم‌ویل یا نپولین سے مختلف انتظامیہ طاقت آچکی تھی، اب اس تلاش میں تھا کہ پہلے کی کوئی مثال سامنے رکھے، عالمی تاریخ کی جگ‌بیتی میں سے نہیں، بلکہ ”۱۰ دسمبری سوسائٹی،، کے یا فوجداری عدالت کے پرانے کاغذوں میں سے۔ وہ بینک آف فرانس سے ڈھائی کروڑ فرانک قبضا لیتا ہے، دس لاکھ میں جنرل مانیان کو خریدتا ہے، ہر ایک فوجی پر پندرہ فرانک اور شراب خرچ کرتا ہے، اپنے حوالی موالی کے ساتھ مل کر رات گئے چور کی طرح یہ حکم دیتا ہے کہ، جو سب سے خطرناک پارلیمنٹری لیڈر ہیں ان کے مکانوں میں زبردستی گھس کر، کوےنیاک، لموری‌سیئر، لےفلو، شنگارنیے، شراس، تیئر، باز اور دوسرے لوگوں کو بستر سے گھسیٹا اور جیل میں بھر دیا جائے۔ پیرس کے خاص خاص چوراہوں اور پارلیمنٹ کی عمارتوں پر فوجی پہرہ بٹھا دیتا ہے۔ اور صبح سویرے راجدھانی میں ہر جگہ اس اعلان کے اشتہار لگا دئے جاتے ہیں کہ قومی اسمبلی اور اسٹیٹ کونسل توڑ دی گئی، عام رائے دھندگی کا حق بحال کردیا گیا اور سینا کا حلقہ (ڈپارٹمنٹ) محاصرے کی حالت میں ہے۔ تھوڑا وقت دےکر اخبار ”مونیٹر،، میں ایک جعلی دستاویز شائع کراتا ہے جس میں یہ ظاہر کیا گیا کہ پارلیمنٹ کے کئی بااثر نمایاں ممبروں نے اس کی تائید میں جمع ہوکر ایک ہنگامی اسٹیٹ کونسل بنائی ہے۔

بچی کھچی پارلیمنٹ جس میں اورلین اور جائزوارث‌والے شامل تھے، دسویں حلقے کے mairie (میونسپل ہال) میں جمع ہوئی اور ”ریپبلک زندہ‌باد!،، کے لگاتار نعروں کی گونج میں ووٹ کے ذریعے فیصلہ کیا کہ بوناپارٹ کو پریسیڈنٹ کے عہدے سے برطرف کیا جاتا ہے۔ عمارت کے سامنے جو ہجوم جمائیاں لے رہا

تھا، اس پر ان اپیلوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا، یہاں تک کہ آخر میں افریقی نشانہ‌بازوں کی حراست میں انھیں اورسئے کی بارکوں میں، اور وہاں سے قیدی گاڑیوں میں بھر بھر کر مزاس، ھام اور وینسین جیلوں میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ یوں ضابطہ پارٹی، قانون‌ساز اسمبلی، اور فروری کے انقلاب کا خاتمہ ہوگیا۔

بیان ختم کرنے سے پہلے ہم فروری کے انقلاب کی ایک مختصر تاریخ پر نظر ڈالتے چلیں:

پہلا دور۔ ۲۴ فروری سے ۴ مئی ۱۸۴۸ء تک۔ فروری کا دور۔ تماشے کی تمہید۔ عالم‌گیر برادری کا تماشا۔

دوسرا دور۔ ریپبلک قائم ہوتی ہے اور آئین ساز قومی اسمبلی بنتی ہے۔

۱ - ۴ مئی سے ۲۵ جون ۱۸۴۸ء تک۔ سارے طبقے پرولتاریہ کے مقابلے پر نکل آتے ہیں۔ پرولتاریہ کو جون کے دنوں میں شکست۔

۲ - ۲۵ جون سے ۱۰ دسمبر ۱۸۴۸ء تک۔ خالص بورژوا ریپبلکنوں کی ڈکٹیٹری۔ آئین کی تیاری۔ پیرس میں محاصرے کی حالت کا اعلان۔ ۱۰ دسمبر کو بوناپارٹ کا پریسیڈنٹ چنا جانا اور اس کے کارن بورژوا ڈکٹیٹری کا ہٹایا جانا۔

۳ - ۲۰ دسمبر ۱۸۴۸ء سے ۲۸ مئی ۱۸۴۹ء تک۔ آئین ساز اسمبلی کی بوناپارٹ سے اور اس کے ساتھ مل جانےوالی ضابطہ پارٹی سے کشمکش۔ آئین ساز اسمبلی کا خاتمہ۔ ریپبلکن بورژوازی کی شکست۔

تیسرا دور۔ آئینی ریپبلک کا زمانہ اور قانون ساز قومی اسمبلی کا زمانہ۔

۱ - ۲۸ مئی ۱۸۴۹ء سے ۱۳ جون ۱۸۴۹ء تک۔ چھوٹی حیثیت کی بورژوازی کا بورژوازی اور بوناپارٹ سے مقابلہ۔ چھوٹی بورژوازی کی ڈیموکریسی کو شکست۔

۲ - ۱۳ جون ۱۸۴۹ء سے ۳۱ مئی ۱۸۵۰ء تک۔ ضابطہ پارٹی کی پارلیمنٹری ڈکٹیٹری۔ یہ پارٹی عام رائے دھندگی کا حق ہٹا کر اپنا راج ختم کر لیتی ہے۔ لیکن پارلیمنٹری وزارت کھو دیتی ہے۔

۳ - ۳۱ مئی ۱۸۵۰ء سے دوسری دسمبر ۱۸۵۱ء تک پارلیمنٹری بورژوازی اور بوناپارٹ کے درمیان کشمکش -

(الف) ۳۱ مئی ۱۸۵۰ء سے ۱۲ جنوری ۱۸۵۱ء تک - پارلیمنٹ کے ہاتھ سے فوج کی اعلا کمان نکل جاتی ہے -

(ب) ۱۲ جنوری ۱۸۵۱ء سے ۱۱ اپریل ۱۸۵۱ء تک - انتظامی طاقت کو اپنا فرماں بردار رکھنے میں پارلیمنٹ ناکام ہوتی ہے - ضابطہ پارٹی پارلیمنٹ میں اپنی اکثریت کھو دیتی ہے - رپبلکنوں اور ''مونٹین،، والوں کے ساتھ کولیشن بنا لیتی ہے -

(ج) ۱۱ اپریل سے ۹ اکتوبر ۱۸۵۱ء تک - آئین پر نظرثانی، اختلاف کی جگہ میل، میعاد میں توسیع کی کوششیں - ضابطہ پارٹی کے سب اجزا بکھر کر اپنی اصلی حالت پر واپس - بورژوائی پارلیمنٹ اور بورژوائی اخبارات کا عام بورژوازی سے قطع تعلق -

(د) ۹ اکتوبر سے دوسری دسمبر ۱۸۵۱ء تک - پارلیمنٹ اور انتظامیہ طاقت میں صاف قطع تعلق - پارلیمنٹ کی موت - خود اپنے طبقے نے، فوج نے اور باقی دوسرے طبقوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور وہ ڈوب گئی - پارلیمنٹری عملداری اور بورژوا حکمرانی کا خاتمہ - بوناپارٹ کی فتح - سلطنت کی بحالی کا منہ چڑایا جانا -

۷

انقلاب فروری (۱۸۴۸ء) کی شروعات میں سماجی رپبلک زبان پر چڑھا ہوا ایک جملہ، ایک پیش گوئی معلوم ہوتی تھی - جون ۱۸۴۸ء کے دنوں میں وہ پیرس کے پرولتاریہ کے لہو میں ڈبو دی گئی - یہ لہو ڈرامے کے اگلے ایکٹوں میں سر چڑھ کر بولتا ہے - منظرعام پر ڈیموکریٹک رپبلک نمودار ہوتی ہے - ۱۳ جون ۱۸۴۹ء کو یہ رپبلک اپنی چھوٹی حیثیت کی فراری بورژوازی کے ساتھ نظروں سے غائب ہو جاتی ہے، لیکن بھاگتے میں وہ پوری قوت سے اپنے ڈنکے بجاتی جاتی ہے - اب پارلیمنٹری رپبلک بورژوازی سمیت سارے اسٹیج پر قبضہ کر لیتی ہے، تمام گنجائشوں میں

پھیل پڑتی ہے لیکن دوسری دسمبر ۱۸۵۱ء کی تاریخ متحدہ شاہ‌پرستوں کی ''رپبلک زندہ‌باد!،، کی وحشیت زدہ چیخوں میں اسے دفنا دیتی ہے۔

فرانس کی بورژوازی کو محنت‌کش پرولتاریوں کا غلبہ گوارا نہیں تھا، تو اس نے آوارہ گرد پرولتاریہ کو ''۱۰ دسمبری سوسائٹی،، کے سرغنہ سمیت قبضہ دے دیا۔ بورژوازی نے لال نراج کا ھوا دکھاکر فرانس کے ہوش اڑا رکھے تھے — بوناپارٹ نے اسی خوف کو بھنالیا جب نشے میں دھت ضابطے کی فوج نے اس کے حکم سے ۴ دسمبر کو نامور بورژواؤں پر گولیاں چلائیں جو مون‌مارتر بلوار اور اطالین بلوار میں اپنی کھڑکیوں میں کھڑے تھے۔ بورژوازی تلوار کی دھونس دیتی تھی — تلوار نے اسی کو دبا لیا۔ بورژوازی نے انقلابی پریس کو کچلا تھا — خود اسی کا پریس کچل دیا گیا۔ وہ عام جلسوں پر پولیس کا پہرہ بٹھاتی تھی — اب اسی کی نشست گاھوں پر پولیس لگی ہوئی ہے۔ اس نے جمہوریت پسند نیشنل گارڈ کو توڑا تھا — اب خود اسی کا نیشنل گارڈ توڑ دیا گیا۔ اس نے محاصرہ کی حالت عائد کی تھی، اب خود اس کا محاصرہ ہوگیا ہے۔ اس نے عدالتوں کی جگہ فوجی کمیشن بٹھائے تھے، اب اس کی عدالتوں کی جگہ فوجی کمیشنوں نے لےلی ہے۔ اس نے تعلیم عامہ کو پادریوں کے قبضے میں دیا تھا، اب پادری خود اسی کے اسکولوں پر چھائے ہوئے ہیں۔ اس نے لوگوں کو بغیر مقدمہ چلائے جلا وطن کیا تھا، اب اسے مقدمہ چلائے بغیر ملک بدر کیا جا رہا ہے۔ اس نے سماج میں بےچینی کی ہر ایک لہر کو سرکاری طاقت سے دبایا تھا، اب اس کی سوسائٹی کی ہر ایک لہر کو سرکاری طاقت دبا رہی ہے۔ اس نے اپنی تجوری کے خبط میں خود اپنے ہی سیاست دانوں اور اہل قلم کے خلاف ہنگامہ کھڑا کیا تھا، اب ان سیاست دانوں اور اہل قلم کو بےدخل کردیا گیا، منہ پر تالے لگانے اور قلم توڑ دینے کے بعد اب اس کی تجوری پر ہاتھ ڈالا جا رہا ہے۔ بورژوازی کبھی نہیں تھکی، انقلاب کو زور سے اسی طرح ڈانٹتی تھی جیسے سینٹ آرسینی نے عیسائیوں کو ڈانٹا تھا کہ ''بھاگ جاؤ، خاموش، نچلے بیٹھو!،،، اب بورژوازی

کو بوناپارٹ انھی لفظوں میں ڈانٹ رہا ہے: ''بھاگ جاؤ، خاموش، نچلے بیٹھو!''

فرانسیسی بورژوازی نے نپولین کی گتھی کا حل بہت زمانے پہلے معلوم کر لیا تھا، گتھی تھی: ''پچاس سال کے اندر یورپ یا تو ریپبلکن ہو جائےگا یا قزاق''۔ حل یہ معلوم کیا کہ یورپ ''قزاقی ریپبلک'' ہو جائے۔ علم سفلی کے کسی ماہر سیرتسئے جادوگرنی کی ضرورت نہیں تھی جو بورژوائی ریپبلک کے اس شاہکار کو بدل کر بھیانک دیو بنا دے۔ اب بھی کیا بگڑا ہے! ریپبلک کی صرف ظاہری شان میں ھی فرق آگیا ہے۔ موجودہ فرانس* پارلیمنٹری ریپبلک کی بنی بنائی شکل میں موجود تھا۔ صرف ایک سنگین بھونکنے کی کسر تھی کہ غبارہ پھٹے اور دیو کود کر آنکھوں کے آگے آجائے۔

پیرس کے پرولتاریہ نے دوسری دسمبر کے بعد بغاوت کے لئے سر کیوں نہیں اٹھایا؟

بورژوازی کو چت کرنے کا ابھی حکم ھی نکلا تھا، حکم کی تعمیل نہیں ہوئی تھی۔ اگر پرولتاریہ کی طرف سے کوئی سنجیدہ بغاوت اٹھتی تو وہ بورژوازی میں پھر سے جان ڈال دیتی، اس کا فوج سے میل ملاپ کرا دیتی اور مزدوروں کو دوبارہ جون کی سی شکست کا سامنا کرنا پڑتا۔

۴ دسمبر کو بورژوازی اور دوکانداروں نے پرولتاریہ کو اکسایا کہ وہ مقابلے کے لئے بڑھے۔ اسی روز شام کو نیشنل گارڈ کے کئی دستوں کا وعدہ تھا کہ میدان جنگ میں ہتیار اور وردی سج کر نکلیں گے۔ بات یہ تھی کہ بورژوا اور دوکانداروں کو پتہ چلا کہ بوناپارٹ نے ایک فرمان ایسا بھی نکالا ہے جس کے ذریعے دوسری دسمبر سے خفیہ ووٹنگ کا طریقہ منسوخ کر دیا گیا اور حکم ہوا ہے کہ آئندہ سے سرکاری رجسٹروں میں اپنے اپنے نام کے آگے ''ھاں'' یا ''نہیں'' لکھا کریں۔ ۴ دسمبر کی

---

* یعنی ۱۸۵۱ء کے انقلاب حکومت کے فوراً بعد۔ (ایڈیٹر)

مخالفت سے بوناپارٹ ڈر گیا۔ اسی رات پیرس کے تمام چوراہوں پر اس کے حکم سے یہ اعلان لکھ کر لگا دئیے گئے کہ خفیہ ووٹنگ باقی رکھی جاتی ہے۔ بورژوا اور دوکانداروں نے سوچا کہ مطلب نکل گیا اور دوسری صبح وہی تھے جنھوں نے گھر سے باہر قدم نہیں نکالا۔

پہلی اور دوسری دسمبر کی درمیانی رات میں اچانک چھاپے مار کر بوناپارٹ نے پیرس کے پرولتاریہ کو اس کے لیڈروں، یعنی بیری کیڈ (سڑک کی روک) کے ذمہ‌داروں سے محروم کر دیا۔ اب یہ بےسری فوج رہ گئی، جس کی یادوں میں جون ۱۸۴۸ء اور ۱۸۴۹ء اور مئی ۱۸۵۰ء کے دنوں کی تلخی موجود تھی اور اس ناگواری کے ہوتے وہ ''سونٹین،، کے جھنڈے تلے لڑنے پر زرا بھی آمادہ نہ تھی۔ اس نے اپنے ہراول دستے یعنی خفیہ سوسائٹیوں کی طرف یہ ذمہ‌داری بڑھا دی کہ پیرس کی باغیانہ شان باقی رکھی جائے جس شان کو بورژوازی نے فوجیوں کے قدموں میں ڈال کر ایسا بٹہ لگایا تھا کہ بعد میں بوناپارٹ نے نیشنل گارڈ سے ہتھیار رکھواتے وقت یہ زہریلا کٹیلا شوشہ چھوڑا کہ: اندیشہ ہے کہ انارکسٹ ان ہتھیاروں کو خود نیشنل گارڈ پر ہی آزمائیں گے۔

''بس، یہ ہے مکمل اور آخری فتح سوشلزم کی،، ان لفظوں میں گیزو نے دوسری دسمبر کے واقعے کا خلاصہ کیا۔ لیکن اگر پارلیمنٹری ریپبلک کا تختہ الٹنا اپنے اندر پرولتاری انقلاب کے جراثیم چھپائے ہوئے تھا تو اس کا فوری اور ٹھوس نتیجہ تو یہی نکلا کہ بوناپارٹ کو پارلیمنٹ پر فتح ہوئی، انتظامیہ طاقت کو قانون ساز طاقت پر اور محض طاقت کو، جس پر لفاظی منڈھی ہوئی نہیں تھی، لفاظی کی طاقت پر فتح ہو گئی۔ پارلیمنٹ میں قوم نے اپنے متفقہ منشا کو ایک قانون کی صورت دے دی، یوں کہنا چاہئے کہ حاکم طبقے کے قانون کو اس نے اپنا متفقہ منشا بنا لیا۔ انتظامیہ طاقت کے سامنے کسی ذاتی منشا پر زبان کھولنے کی جرات نہیں، اب وہ غیر کی مرضی، یعنی حکم چلانے‌والے کی مرضی کے آگے سر جھکاتی ہے۔ قانون ساز طاقت کے مقابلے پر انتظامیہ طاقت، قوم

کی خود انتظامی کے بجائے اب اس کی ماتحتی (heteronomy) ظاہر کرتی ہے ۔ اس طرح سے فرانس نے پورے ایک طبقے کی اندھیر گردی سے نجات پا لی ، گویا محض اس لئے نجات پائی کہ فردواحد کی اندھیر گردی کا حکم بجا لائے، ایک ایسے شخص کے کلی اختیار کا حکم، جسے حکم چلانے کا اختیار ھی نہیں دیا گیا۔ ساری کش مکش یہاں پہنچ کر تمام ہو گئی کہ سب طبقے ایک جیسی بے بسی، ایک جیسی بے نوائی کے ساتھ بندوق کے دستے کے سامنے گھٹنے ٹیک دیں ۔

مگر انقلاب کی جڑ بنیاد ھوتی ھے ۔ اسے ابھی مقام اعراف سے گزرنا ھے ۔ اپنا کام قاعدے سے پورا کرنا ھے ۔ دوسری دسمبر ۱۸۵۱ء تک اس نے تیاری کا آدھا کام کر لیا ، اب آدھا کرنا باقی ھے ۔ پہلے تو اس نے پارلیمنٹری طاقت کو تکمیل تک پہنچایا تاکہ اس کا الٹنا ممکن ہو جائے ۔ اب وہ کام پورا ہو گیا تو انتظامیہ طاقت کو اس کے کمال تک پہنچانا ھے، اس مقام تک لے جانا ھے کہ وہ کھلے روپ میں خود کو ظاھر کرے ۔ پھر اسے الگ تھلگ کرنا ھے، اسے ٹھیک اپنے مقابل لانا ھے کہ ایک نشانہ بندھ جائے اور پھر تباھی مچانےوالی اپنی ساری طاقتوں کو اسی کے خلاف سمیٹا جائے ۔ اور جب انقلاب پیش بندی کے اس باقی آدھے کام کو پورا کر لےگا تو پھر یورپ اپنی جگہ سے اچھل اچھل کر داد دےگا ''واہ رے بجو، اندر ھی اندر خوب، زمین کھودتے ھو !،، *

یہ انتظامیہ طاقت جس کے پاس سرکاری نوکریوں اور فوج کی زبردست تنظیم ھے، جس کے پاس نہایت پیچدار اور مصنوعی سرکاری مشین ھے، پانچ لاکھ کے قریب سرکاری ملازموں کی پلٹن، اور اسی کے ساتھ اور پانچ لاکھ کی فوج، یہ ھیبت‌ناک اور مفت‌خورا انجرپنجر ، جو سارے فرانسیسی سماج کو اپنے شکنجے میں کسے ہوئے ھے، اور اس کے سارے مسامات کو بند کئے ہوئے ھے، یہ انتظامیہ طاقت اپنی مرضی کی مالک بادشاھت کے زمانے میں عالم وجود میں

* شکسپیئر ''ہیملٹ،، کا پہلا ایکٹ، پانچواں منظر ۔ (ایڈیٹر)

آئی تھی، جب جاگیرداری نظام زوال آمادہ تھا اور اسی جکڑبندی نے اس کے زوال کی رفتار بھی تیز کر دی۔ زمینداروں اور شہروں کو جو چودھراہٹ نصیب تھی وھی سرکاری طاقت کے بہت سارے خانوں میں تبدیل ھوگئی، جو لوگ جاگیرداری میں عزت‌والے تھے وہ تنخواہ یافتہ سرکاری ملازم بن گئے۔ قرون وسطی کے ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے اختیارات کا جو رنگ برنگا نقشہ تھا وہ سرکاری طاقت کے ایک ایسے باضابطہ مقررہ نقشے میں ڈھل گیا جہاں محنت کی تقسیم اور مرکزیت ٹھیک اسی انداز پر ھے جیسے کارخانے میں ھوتی ھے۔ پہلا انقلاب فرانس، جسے یہ فرض انجام دینا تھا کہ تمام مقامی، جگہ جگہ، علاقے علاقے کی، شہروں اور صوبوں (مضافات) کی خاص حکمرانی کا خاتمہ کرے تاکہ پوری قوم کی شہری وحدت بنائی جائے، اب وہ کام بھی اسے اور آگے بڑھانا پڑا جو اپنی مرضی کی مالک بادشاھت نے شروع کیا تھا، یعنی سب کو ملاکر مرکزیت قائم کرنا۔ مگر اسی کے ساتھ حکومت کی طاقت سے کام لینے والوں کا دائرہ، ان کے عہدے اور حیثیت اور ان کی تعداد بھی پہلے سے زیادہ پھیل گئی۔ نپولین نے یہ سرکاری مشین بنا کر تیار کی۔ جائزوارث والوں کی بادشاھت اور جولائی کی بادشاھت، دونوں نے اس کے سوا کچھ نہ کیا کہ کاموں کے خانے اور بڑھا دئے اور وہ اتنے ھی بڑھے جتنی بورژوا سماج کے اندر محنت کی تقسیم نے مفادوں کے نئے نئے گروپ بنائے، نتیجہ یہ کہ سرکاری نظم و نسق کے نئے سروسامان پیدا ھوتے چلے گئے۔ ھر قسم کا مشترکہ مفاد باقی سماج سے کاٹ کر خود سماج کے مقابل اس طرح رکھ دیا جاتا جیسے اس سے بلند تر اور سبھی کا ایک مفاد ھے، وہ کاموں کے اس دائرے سے نکل جاتا جو سماج کے ممبر آپس میں مل کر خود ھی کر لیا کرتے تھے۔ اب وہ حکومت کی کارکردگی کی چیز بن جاتا — کسی گاؤں کی برادری کے لئے پل، اسکول کی عمارت، یا پنچائتی ملکیت سے لے کر ریلوے، قومی ملکیت اور فرانس کی قومی یونی‌ورسٹی تک یہی حال ھوا۔ آخر پارلیمنٹری رپبلک کو انقلاب کا مقابلہ کرتے وقت مجبور ھونا پڑا کہ زور زبردستی کی تدبیروں کے ساتھ

ساتھ حکومت کی طاقت کے ذریعوں اور ان کی مرکزیت کو بھی زیادہ مضبوط کیا جائے۔ تمام انقلابات اس مشین کو توڑنے کے بجائے اسے اور پکا کر دیتے تھے۔ ایک کے بعد ایک پارٹی جو غلبہ پانے کے لئے میدان میں اتری، اسے یہی فکر رہی کہ اس گراں ڈیل سرکاری درودیوار کو اپنے قبضے میں کرلے تو فتح کا سب سے بڑا مال غنیمت ہاتھ آجائے گا۔

مختار کل بادشاہت کے زمانے میں، پہلے انقلاب فرانس کے دنوں میں، نپولین کے ہوتے، نوکرشاہی صرف ایک ذریعہ تھی اس تیاری کا کہ بورژوازی اپنے طبقے کا راج قائم کرے۔ جب شاہی بحالی کا زمانہ آیا، لوئی فلپ نے اختیار سنبھالا اور پھر پارلیمنٹری ریبلک قائم ہوئی تو نوکرشاہی جو اپنی طاقت بنانے کی دھن میں تھی حاکم طبقے کا اوزار بن کر رہ گئی۔

صرف یہی دوسرے بوناپارٹ کا زمانہ ایسا آیا کہ اسٹیٹ خود اپنی مالک و مختار معلوم ہوتی ہے۔ اسٹیٹ کا کام چلانےوالی مشین نے ملکی سماج کی نسبت سے خود اپنی حیثیت اتنی مضبوط کرلی ہے کہ ''۱۰ دسمبری سوسائٹی،، کے سرغنہ کی سرکردگی میں اپنا کام چلا سکتی ہے، ایک ایسے منچلے کی سرکردگی میں جو غیر ملک سے آٹپکا، نشے میں دھت فوجیوں نے اسے ڈھال کی طرح آگے کرلیا جنھیں اس نے شراب اور سوکھا گوشت کھلا پلا کر خرید لیا اور بار بار گوشت کے ترلقموں سے خوش رکھنا پڑتا ہے۔ اسی لئے اب فرانس کا دل ڈوبا ہوا ہے، انتہاہ گراوٹ اور ذلت کا احساس سینے پر پتھر بن گیا ہے کہ وہ چین سے سانس بھی نہیں لے سکتا۔ اسے محسوس ہوتا ہے کہ عزت آبرو خاک میں مل گئی۔

تاہم سرکاری طاقت کوئی ہوا میں معلق نہیں ہے۔ بوناپارٹ ایک طبقے کا نمائندہ ہے، وہ بھی ایسے طبقے کا جو فرانسیسی سماج میں سب سے بڑی بھاری تعداد رکھتا ہے۔ یعنی چھوٹی کاشت‌والے (parzellen) کسانوں کا۔

جس طرح بوربوں گھرانا بڑی بڑی جاگیروں کے مالکوں کا شاہی خاندان تھا، اورلین‌والے نقد رقم والوں کے نمائندے تھے، بوناپارٹ‌والے

اسی طرح کسانوں کا شاہی خاندان معلوم ہوتے ہیں یعنی فرانس کے بالکل معمولی عام لوگوں کا۔ کسانوں کی پسند کا بوناپارٹ وہ نہیں تھا جو بورژوا پارلیمنٹ کے ماتحت تھا، بلکہ ان کی پسند کا بوناپارٹ وہ ہے جس نے اس پارلیمنٹ کو توڑ کر باہر کر دیا۔ تین سال تک شہروں کا بس چلا کہ وہ دس دسمبر کے الکشنوں کا مطلب پلٹتے رہے اور کسانوں کو جو آس تھی کہ بادشاہی پھر بحال ہو جائےگی، اسے فریب دیتے رہے۔ ۱۰ دسمبر ۱۸۴۸ء کو جو الکشن ہوئے تھے، اب جاکر دوسری دسمبر ۱۸۵۱ء کے انقلاب حکوست میں ان کا اصلی وجود سامنے آیا ہے۔

چھوٹی کاشت کے کسان بڑی بھاری آبادی ہیں۔ یہ لوگ ایک جیسے حالات میں زندگی بسر کرتے ہیں البتہ ان کے آپس میں طرح طرح کے سمبندھ نہیں ہوتے۔ خود پیداواری طریقہ انھیں باہم نتھی کرنے کے بجائے ایک دوسرے سے الگ کرکے رکھتا ہے۔ فرانس کے اندر راستوں اور سڑکوں کی خراب حالت اور کسانوں کی غریبی بھی انھیں الگ تھلگ رکھنے میں اپنا اثر دکھاتی ہے۔ ان کی پیداواری زمینیں، چھوٹے چھوٹے کھیت نہ تو کاشتکاری میں محنت کی تقسیم ہونے دیتے ہیں، نہ سائنس کا استعمال، نتیجہ یہ کہ ترقی یا تبدیلی کی کوئی رنگارنگی بھی ان میں اثر نہیں کرتی، ذہانت یا ہنرمندی کے درجے بھی نہیں بن پاتے، اور سماجی تعلقات کی کسی قسم کی دولت بھی نصیب نہیں ہوتی۔ ایک ایک کسان گھرانا خود اپنے بل پر کام چلا لیتا ہے اور اپنی ضروریات کی بیشتر چیزیں خود ہی بنا لیتا ہے، گزر اوقات کا جو سامان درکار ہے، اس کے لئے سماج سے لین دین کرنے کے بجائے، وہ فطرت سے معاملہ کرکے خود مہیا کر لیتا ہے۔ چھوٹی سی کاشتکاری ہے، کسان ہے، اس کا کنبہ ہے؛ پڑوس میں دوسری کاشتکاری، دوسرا کسان اور اس کا کنبہ۔ ایسے کئی ایک یونٹ مل کر گاؤں اور کئی گاؤں کی ڈھیری ایک ڈپارٹمنٹ (حلقہ) ہو جاتی ہے۔ اس صورت سے فرانسیسی قوم کی بڑی بھاری آبادی ایک ایک یونٹ سے مل کر بنی ہے، جیسے آلوؤں کی بوری ایک ایک آلو اور بوری سے

مل کر بنتی ہے۔ جب لاکھوں خاندان ایسے معاشی حالات میں رہتے ہیں کہ ان کا رہن سہن، ان کے مفاد اور تعلیم و تربیت، دوسرے طبقوں کے رہن سہن، مفاد اور تعلیم و تربیت سے الگ بھی پہچانے جائیں اور ان کے بالکل برخلاف بھی، تو وہ ایک طبقہ بن جاتے ہیں۔ اب چوں کہ چھوٹی کاشت والے کسانوں کے درمیان صرف مقامی رشتے رہتے ہیں اور ان کے مفادوں کی یکسوئی ان میں نہ تو کوئی یگانگی پیدا کرتی ہے، نہ کسی قومی رشتے کو ابھارتی ہے، نہ کسی سیاسی تنظیم کو، اس لئے وہ مل کر ایک طبقہ نہیں بن پاتے۔ لہازا وہ اس قابل نہیں ہوتے کہ اپنے طبقے کے مفاد کو خود اپنے نام پر بچا سکیں، چاہے وہ پارلیمنٹ کے توسط سے ہو یا کنونشن کے وسیلے سے۔ وہ خود اپنی نمائندگی نہیں کرسکتے، دوسروں کو ان کی نمائندگی کرنی پڑتی ہے۔ جو ان کی طرف سے کھڑا ہو اسے نمائندگی کرنے کے ساتھ ان کا مالک، صاحب اختیار اور ان سے اوپر بھی ہونا چاہئے، حکومت کی ایسی طاقت ہو جس کا ہاتھ نہ روکا جاسکے، ان کے لئے دوسرے طبقوں کے مقابل سینہ سپر ہو جائے اور اوپر سے بارش اور دھوپ نازل کیا کرے۔ لے دے کر حاصل یہ کہ چھوٹی کاشت والے کسانوں کا سیاسی اثر خود کو گویا ایسی انتظامیہ طاقت میں سامنے لاتا ہے جو سماج کو اپنا ماتحت بنا کر رکھے۔

تاریخی روایت نے فرانسیسی کسانوں کے دل میں یہ وہمی اعتقاد ڈال رکھا ہے کہ نپولین نام کا آدمی ہوگا جو انہیں کھوئی ہوئی نعمتیں دلوائے گا۔ آخر ایک آدمی نکل آیا جو خود کو وہی شخص موعود بتاتا ہے اور وجہ محض یہ کہ اس کا نام بھی نپولین ہے ایک قانونی دفعہ کے بل پر— ضابطہ نپولین (Code Napoléon) ''کسی کے باپ کی چھان بین کرنا منع ہے''۔ بیس برس کی آوارہ گردی اور ناگفتنی واقعات کا ایک سلسلہ پورا کرنے کے بعد آخر پیش گوئی پوری ہوئی اور وہ آدمی فرانس کا شہنشاہ بن گیا۔ بڑے نپولین کے بھتیجے کے دل میں جو لگن تھی پوری ہو گئی، کیوں کہ

اتفاق سے یہی لگن فرانسیسی سماج کے اس طبقے کو بھی تھی جو تعداد میں اوروں سے کہیں زیادہ ہے۔

یہاں مجھ پر ایک اعتراض ہو سکتا ہے: یوں ہے تو پھر آدھے فرانس میں کسانوں کی بغاوتیں کیا معنی؟ کسانوں پر فوج کے چھاپے، ان کی دھڑا دھڑ عام گرفتاریاں اور جلاوطنی کیسی؟

لوئی چہاردھم کے زمانے سے آج تک فرانس میں کبھی ''لفظی رعب داب کے بدلے،، کسانوں کا ایسا پیچھا نہیں لیا گیا تھا۔

میری بات کا غلط مطلب نہ نکالا جائے۔ بوناپارٹ خاندان انقلابی کسانوں کی نہیں، قدامت‌پسند کسانوں کی نمائندگی کرتا ہے، اس کسان کی نہیں جو اپنے سماجی وجود، یعنی چھوٹی کاشت کے تنگ دائرے سے نکلنے کے لئے بےتاب ہے، بلکہ اس کسان کی جو چھوٹی کاشت اور ان حالات کو مضبوط کرنا چاہتا ہے، دیہات کی اس آبادی کی نمائندگی نہیں کرتا جو شہروں سے ملنے کے لئے بے تاب ہے اور خود اپنے بل پر بوسیدہ نظام کو الٹ دینا چاہتا ہے بلکہ اس دیہاتی آبادی کی جو اسی پرانے نظام کے اندر گھٹا پڑا ہے اور سلطنت کے پرچھانویں سے امیدوار ہے کہ وہ اسے بچا لےگا اور اس کی حیثیت بنائے رہےگا۔ بوناپارٹ کا خاندان کسان کی روشن خیالی کا نہیں، بلکہ اس کی وہم‌پرستی کا، اس کی قوت فیصلہ کا نہیں، بلکہ اس کے تعصب کا، اس کے مستقبل کا نہیں، اس کے ماضی کا، اس کے جدید سیوینے کا نہیں، اس کے جدید ویندیئے (۱۰۶) کا نمائندہ ہے۔

پارلیمنٹری ریپبلک کے تین سال کے بے درد راج نے اگرچہ یہ صحیح ہے کہ صرف اوپر سے ہی کھرچا تھا، تاہم فرانسیسی کسانوں کے ایک حصے کے دماغ سے نپولین کا وہم و گمان نکال دیا اور اس میں انقلابی جذبہ بیدار کر دیا۔ لیکن جوں ہی وہ حرکت میں آتے، بورژوازی انہیں سختی سے کچل دیتی تھی۔ پارلیمنٹری ریپبلک کے دنوں میں فرانسیسی کسان کے شعور میں نئے خیالات اور پرانی روایات کے درمیان کش مکش چلتی رہی۔ یہ سلسلہ اسکول ماسٹروں کی اس جدوجہد کی صورت میں پھوٹ نکلا جو انہوں نے پادریوں کے مقابلے پر چھیڑی تھی اور بورژوازی نے اسکول ماسٹروں

کو ڈانٹ کر چپ کردیا۔ کسانوں نے پہلی بار پورا زور لگایا
کہ حکومت کی کارگزاری کے تعلق سے اپنی آزادانہ پوزیشن قائم
کریں۔ یہ حقیقت یوں کھل کر سامنے آئی کہ میئروں (دیہات کے
سرپنچوں) اور پریفیکٹوں (سرکاری حاکموں) کے درمیان مستقل
ٹکر رہنے لگی۔ بورژوازی نے میئروں کو ہر بار بے دخل کر دیا۔
آخر یہ ہوا کہ فرانس کے مختلف علاقوں میں، پارلیمنٹری رپبلک
کے زمانے میں کسان خود اپنی ہی اولاد، یعنی فوج کے مقابلے پر
اٹھ کھڑے ہوئے۔ بورژوازی نے انھیں محاصرے کی حالت میں
لے کر اور تعزیری فوج بھیج کر سزا دی۔ اور اب یہی بورژوازی
عوام کی کوڑھ مغزی کو، اس گھناونے ہجوم عام کی جان کو
رو رہی ہے جو گویا بوناپارٹ سے مل کر دھوکا دے گیا۔ اس
نے بزور بازو کسان طبقے میں سلطنت پرستی کے جذبے کو تقویت
پہنچائی ہے، اس نے حالات کا وہ رخ بنائے رکھا جو زمین تیار
کرتا ہے اس کسانی عقیدے کے اگنے اور پھلنے پھولنے کے لئے۔
سچ بات یہ کہ عوام جب تک قدامت پرست رہیں، بورژوازی کو ان
کی نادانی سے ڈر لگتا ہے اور جب وہ انقلابی رنگ میں رنگ جائیں
تب ان کی دانائی سے ہول چڑھتا ہے۔

انقلاب حکومت کے بعد جو بغاوتیں اٹھیں، ان میں فرانسیسی
کسانوں کے ایک حصے نے ہتھیار اٹھا کر اس شخص کے خلاف
اپنے غصے کا اظہار کیا جسے خود ہی ۱۰ دسمبر ۱۸۴۸ء میں
ووٹ دے کر چنا تھا۔ ۱۸۴۸ء کے بعد سے جس اسکول میں وہ
رہے اسی نے ان کی عقلوں پر دھار رکھ دی۔ لیکن انھوں نے اپنے
عقل و ہوش تاریخ کی پوشیدہ قوت کے ہاتھ نیلام کر دئے اور
تاریخ نے ان کی بولی مان لی۔ ان میں سے اکثر تو اتنا بھٹکے کہ
خاص وہی علاقے جو سرخ رنگ والوں کا گڑھ تھے، وہاں کاشتکار
آبادی نے کھلے عام بوناپارٹ کے حق میں ووٹ دئے۔ ان کو یہ
خیال ہو گیا تھا کہ بوناپارٹ کچھ کرنا چاہتا ہے مگر قومی
اسمبلی اس میں روڑے اٹکاتی ہے۔ پھر کیا تھا، بوناپارٹ نے وہ
زنجیریں توڑ ڈالیں جو شہروں نے دیہات کی مرضی کو پہنا رکھی

تھیں۔ بعض جگھوں پر کسان وھم میں مبتلا ھو کر نپولین کےساتھ کنونشن کو جوڑنے کی تجویزیں پیش کرنے لگیں (۱۰۷)۔

جب پہلے انقلاب نے زمین سے بندھے ھوئے کسان (serf) کو خودکاشت مالک کی حیثیت دی تو نپولین نے ایسے حالات کا ڈول ڈالا جن میں کسانوں کو فرانس کی اس سرزمین سے فیض اٹھانے کا بےروک ٹوک موقع ملے جو ابھی ان کے ھاتھ آئی ھے اور ملکیت کی نئی نئی ترنگ کو پوری تسکین مل جائے۔ لیکن فرانسیسی کسان کے لئے فی الحال بس کی گانٹھ بھی یہی چھوٹی کاشت ھے، زمین کی یہ تقسیم، ذاتی ملکیت کی یہ شکل جسے فرانس میں نپولین نے جمایا تھا۔ یہی وہ مادی حالات ھیں جنھوں نے فرانس کے زمین سے بندھے کسان کو چھوٹی کاشت کا مالک بنا دیا اور نپولین کو شہنشاہ۔ دو نسلوں کے گزرنے کی دیر تھی کہ اس عمل کا لازمی نتیجہ نکل آیا: کاشتکاری کی حالت رفتہ رفتہ بگڑتی گئی اور کاشتکاروں پر قرض کا بار بڑھتا گیا۔ ذاتی ملکیت کا ''نپولینی،، روپ جو ۱۹ ویں صدی کے شروع میں فرانس کی دیہاتی آبادی کے لئے دولت مندی اور آزادی کا پروانہ تھا، وھی ان سو سالوں کے عرصے میں قانون بن گیا جس نے دیہات والوں کی غلامی اور محتاجی کا کاغذ پکا کر دیا۔ یہی قانون وہ پہلا ''نپولینی نکتہ،، ھے جسے دوسرے بوناپارٹ کو جھنڈے پر چڑھانا ھے۔ اگر اب بھی وہ کسانوں کی اس خوش فہمی میں شریک ھے کہ ان کی تباھی کا راز چھوٹی کاشت کی ملکیت کے بجائے کہیں اور تلاش کرنا چاھئے، ثانوی حیثیت کے حالات و اسباب میں ڈھونڈھنا چاھئے تو اس کے تجربے پیداواری تعلقات سے چھوتے ھی صابون کے غباروں کی طرح اڑجائیں گے۔

چھوٹی کاشت کی ملکیت کی معاشی صورت ابھرنا وہ سبب ھے جس نے سماج کے دوسرے طبقوں سے کسان کا رشتہ جڑبنیاد سے بدل ڈالا۔ نپولین کے زمانے میں جب زمین الگ الگ کاشتکاریوں میں بٹ گئی تو ساتھ ھی شہروں میں کھلے عام مقابلہ شروع ھو گیا اور بڑی صنعت کا پھیلاؤ ھونے لگا۔ کسان طبقہ دیہات میں سراپا احتجاج بن گیا اوپر کے جاگیرداروں کے خلاف جنھیں تبھی بےدخل

کیا گیا تھا۔ چھوٹی کاشت کی ملکیت نے فرانس کی سرزمین میں جڑ پکڑی تو جاگیردارانہ نظام کی جڑوں کو تری پہنچنے کی گنجائش نہیں چھوڑی۔ چھوٹی کاشتکاری نے جو منڈیریں کھڑی کیں وہ بورژوازی کی قدرتی فصیل بن گئیں تاکہ اس کے پچھلے مالک اچانک نہ چڑھ آئیں۔ مگر ۱۹ ویں صدی کے دوران جاگیردار کی خالی کی ہوئی جگہ پر شہر کے ساہوکار کا قبضہ ہو گیا، زمین پر جاگیرداری کے جو حقوق چلے آتے تھے، اب ان کی جگہ رہن‌ناموں نے لےلی اور فیوڈل شرفا کی زمینی ملکیت ہٹ کر بورژوائی سرمایہ چھاتا چلا گیا۔ کاشتکار کی چھوٹی کاشتکاریاں محض ایک بہانہ ھیں جس سے سرمایہ‌دار کے لئے گنجائش رہتی ھے زمین سے منافع کمانے، سود اور لگان وصول کرنے کی اور یہ کام خود کاشتکار کی مرضی پر چھوڑ دیا جاتا ھے کہ وہ جیسے چاھے اپنی محنت مزدوری کا حق زمین سے نکال لے۔ رہن رکھ کر لئے ہوئے قرضوں سے فرانس کی مٹی دب گئی اور فرانسیسی کسان پر سود کی اتنی بڑی رقم کا بوجھ پڑ گیا جو برطانیہ کے سارے قومی قرضے کے سالانہ سود کے برابر ھوتی ھے۔ چھوٹی کاشتکاری ملکیت، کہ وہ جس قدر بڑھتی ھے اتنی ھی سرمائے کے شکنجے میں پڑتی جاتی ھے، اب اس پر سرمائے کا شکنجہ اتنا سخت ھو چکا ھے کہ فرانسیسی کسان کی اکثریت کو اس نے غاروں میں بسنےوالا جنگلی بنا ڈالا ھے۔ ایک کروڑ ساٹھ لاکھ کسان (بال بچے سمیت) کال کوٹھریوں میں بھرے ھیں، جن میں سے اکثر ایسی ھیں کہ صرف ایک کھڑکی لگی ھے، باقی میں دو کھڑکیاں اور بہت ھوا تو تین کھڑکیاں۔ گھر میں کھڑکیوں کا مصرف وھی ھے جو سر میں پانچ حواس کا۔ بورژوا نظام جس نے ۱۸ ویں صدی کے شروع میں ریاست کے ذمے کیا تھا کہ وہ تازہ‌وارد چھوٹی کاشتکاری کی حفاظت کرے، اس پر نعمتوں کی بارش کیا کرے، اب ایک جونک بن گئی ھے جو اس کے دل کا لہو چوس کر اور سر کا بھیجا چاٹ کر سرمائے کی کیمیائی کٹھالی میں انڈیلتی رہتی ھے۔ اب ''ضابطہ نپولین،، (Code Napoléon) سوائے اس کے کچھ نہیں کہ یہ ایک ضابطہ ھے عدالتی

فیصلے نافذ کرنے کا، قرقی کے وارنٹ نکالنے اور نیلام پر سامان چڑھانے کا۔ سرکاری شمار سے جو چالیس لاکھ آدمی (بال بچے سمیت) فرانس میں بھکاریوں، آوارہ گردوں، مجرموں اور رنڈیوں کی تعداد درج ہے اسی میں پچاس لاکھ کی تعداد اور جمع کرنا چاہئے ایسوں کی جو موت کے کنارے لگے رہتے ہیں، یا تو گاؤں میں ہی پڑے ہیں یا چیتھڑے لگائے، بچے اٹھائے مستقل طور پر گاؤں سے شہر اور شہر سے گاؤں مارے مارے پھرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ جیسے نپولین کے زمانے میں تھا، کسان کے مفاد اب بورژوازی اور سرمائے کے مفادوں سے میل نہیں کھاتے بلکہ ایک دوسرے کے بالکل ہی مخالف پڑتے ہیں اور اس تضاد کا کوئی حل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کسان کو اب اپنا قدرتی حلیف، حمایتی اور رہنما شہری پرولتاریہ میں ملتا ہے جو بورژوائی نظام کو الٹنے کے درپے ہے۔ لیکن ایک مضبوط اور بے روک‌ٹوک حکومت کا، جو ''نپولین کے نکات،، میں نکتہ دوم ہے اور جسے نپولین ثانی کے ہاتھوں پورا ہونا ہے، کام یہ ہے کہ بزور طاقت اس ''مادی،، نظام کو قائم رکھے۔ چناں‌چہ بوناپارٹ نے باغی کسانوں کے خلاف جتنے حکم احکام نکالے ہیں ان میں اسی ''مادی نظام،، «ordre metériel» کی چاٹ رکھی گئی ہے۔

چھوٹی کاشتکاری پر سرمائے کی طرف سے جو رہن کا بوجھ لادا جاتا ہے، اس کے علاوہ ٹیکس بھی لدا ہوا ہے۔ ٹیکس چشمۂ حیات ہے سرکاری ملازمین کے لئے، فوج، پادری اور اونچے محل کے لئے یعنی انتظامیہ طاقت کے سارے کل پرزوں کے لئے۔ مضبوط حکومت اور بھاری ٹیکس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ چھوٹی کاشتکاری کی ملکیت خود اپنی طبیعت سے زمین تیار کرتی ہے اس بات کے لئے کہ نوکرشاہی مختار کل ہو اور بےشمار ہو۔ وہ پورے ملک کے طول و عرض میں ایک ہی سطح کا تعلق اور ایک ہی سطح کے کارکن پیدا کرتی ہے۔ اسی لئے یہ ممکن ہوتا ہے کہ سب سے اعلا مرکز سے حکم جاری ہوتے ہی کارکنوں کا یکساں لاؤلشکر ملک کے ہر ایک حصے میں اس پر یکساں کارروائی کرے۔ عوام

اور سرکاری طاقت کے درمیان جو ایک سیڑھی جاگیرداری شرفا کی ہوتی ہے اسے یہ چھوٹی کاشتکاری ملکیت درمیان سے نکال دیتی ہے۔ اس کی تاثیر یہی ہے کہ ہر طرف اسی سرکاری طاقت کا براہ‌راست عمل دخل ہو اور ہر جگہ اس کے براہ‌راست کارندے مصروف عمل ہوں۔ آخر وہ ایسی فالتو بےمصرف آبادی کو جنم دیتی ہے جس کی کھپت نہ دیہات میں ہو، نہ شہروں میں، اور وہ سرکاری نوکری کو اپنی قسم کی ایک باعزت بھیک سمجھ کر اپنا لے، یہ آبادی مجبور کرتی ہے کہ سرکاری نوکریوں کی تعداد زیادہ سے زیادہ بنائی جائے۔ نپولین نے لازمی ٹیکس لگائے مگر سنگین کی نوک سے نئی منڈیاں کھول کر، یورپ کو لوٹ کر ٹیکسوں میں وصول کی ہوئی وہ رقم اصل مع سود واپس کردی۔ ان ٹیکسوں سے کسانوں کی دستکاریوں کو شہ ملی اور اب وہی ٹیکس ان دستکاریوں کی آخری بوند تک نچوڑے لے رہے ہیں اور محتاجی کے سامنے اس کی بےبسی کو انتہا تک پہنچا رہے ہیں۔ اور پیٹ بھرے، بنے سنورے سرکاری ملازمین کے بےشمار کل پرزے — یہ ہے وہ ''نپولینی نکتہ،، (idée napoléonienne) جو بوناپارٹ دوم کو سب سے زیادہ عزیز ہے۔ اس کے سوا اور کیا ہونا تھا جب بوناپارٹ کو سماج کے اصلی طبقوں کے ساتھ ساتھ ایسی ایک مصنوعی ذات بھی پیدا کرنی ہو جس کے لئے بوناپارٹ کا راج پاٹ بنا رہنا دال روٹی کا سوال بن جائے۔ یہی وجہ ہے کہ مالیات میں جو پہلے قدم اس نے اٹھائے ان میں یہ بھی تھا کہ سرکاری ملازمین کی تنخواہیں، بڑھاکر پہلے جتنی کر دی جائیں اور نئے اعلا عہدہ دار مقرر کئے جائیں۔

ایک اور ''نپولینی نکتہ،، تھا حکومت وقت کے کارندے کی حیثیت سے پادریوں کا غلبہ۔ نئی نئی وجود میں آئی ہوئی چھوٹی کاشتکاری جو سماج سے ہم‌آہنگ تھی اور قدرتی طاقتوں پر جس کا دارومدار تھا، ایسی بڑی طاقت کے سامنے جو اوپر سے اس کی حفاظت کرے، سر جھکاتی تھی، تو قدرتی بات ہے کہ وہ مذہبی تھی۔ لیکن اب ہر طرف سے قرضوں میں دبی ہوئی یہ کاشتکاری،

جو نہ سماج سے وابستہ ہے نہ اوپر کی طاقت سے، جو مجبور ہے کہ چھوٹی کاشت کی اپنی حدبندیاں توڑ کر باہر نکلے، وہ قدرتاً مذہب کے خلاف پھر جائےگی۔ رحمت برستی تھی اور وہ بھی موسم کی صورت میں اس قطعہ اراضی پر جو نیا نیا لوگوں کے ھاتھ آیا تھا لیکن یہ غیبی رحمت بھی ایک زحمت بن جاتی ہے اگر کہیں قطعہ اراضی سے محروم کرکے اس کے بدلے ملتی ھو۔ ایسی حالت میں تو پادری بھی ماتھے پر تلک لگائے پولیس کا کتا نظر آنے لگتا ہے۔ یہ بھی ''نپولینی نکتہ،، ھوا۔ اگلی بار روم پر جو چڑھائی ھونی ہے وہ خود فرانس میں ھی ھوگی لیکن چڑھائی کے معنی اس کے برخلاف ھوں گے جیسا موسیو سونتالامبیر سمجھتے ھیں۔

آخر میں ''نپولینی نکتے،، کی انتہا یہ ہے کہ فوج کی بالا دستی۔ چھوٹی کاشتکاری‌والے کسان کے لئے فوج بڑی شان کی بات تھی۔ اس نے ان کو ایسے سورما بنا دیا جنھوں نے باھر کے دشمن سے ان کی نئی املاک کی حفاظت کی، نئی نئی قومی وحدت جو حاصل ھوئی تھی، اس کا جھنڈا اونچا کیا، دنیا کو لوٹ کر اسے انقلابی رنگ میں رنگ دیا۔ فوجی وردی ان کے لئے شاندار پوشاک، جنگ ان کی شاعری، اور تصور میں زرا آگے تک پھیلی ھوئی چوکور کاشتکاری یہ ان کا وطن بن گئی تھی، اور وطن پرستی ان کے لئے ایک بےمثال شکل تھی احساس ملکیت کی۔ لیکن وہ دشمن جن سے فرانسیسی کسان کو اب اپنی ذاتی ملکیت کی حفاظت کرنی ہے، وہ قزاق نہیں بلکہ عدالت کے قرق امین اور کلکٹر ھیں۔ اب چھوٹی کاشتکاری نام کے اس وطن میں نہیں پائی جاتی بلکہ رھن ناموں کے رجسٹر میں درج ہے۔ فوج اب کسان کی اٹھتی جوانی نہیں بلکہ کسانی آوارہ‌گردوں کی دلدل کا پھول ہے۔ اب اس فوج میں زیادہ تر یا تو نکمے رنگروٹ بھرے ھیں یا بدلی کے لوگ جیسے خود بوناپارٹ دوم جو نقلی اور نپولین اول کی بدلی کا آدمی ہے۔ یہ فوج ساری سورمائی اس وقت دکھاتی ہے جب کسانوں پر چھاپا مارنے نکلے اور سیاسی پولیس (ژندارمی) کا فرض انجام دینے چلے۔ اگر کہیں ''۱۰ دسمبری سوسائٹی،، کے سرغنہ نے اپنے نظام

کے اندرونی تضاد سے اسے فرانس کی حدوں کے پار بھیجا تو فوج وهاں لوٹ مار کے دو چار هاتھ دکھا کر، فتح کے نشان نہیں بلکه چیتھڑے اڑوا لےگی۔

پس یه بات صاف هو گئی که جتنے بھی ''نپولینی نکتے،، هیں وہ کچی، نوخیز اور اسنگوں بھری چھوٹی کاشتکاری کے نکتے هیں۔ جب وہ اپنی عمر پوری کر چکی تو پھر یه نکتے بالکل بےمعنی هیں، ان کی حیثیت بس ایسی هی هے جیسے حالت نزع کا هذیان، جیسے لفظوں سے جڑے هوئے جملے، روحوں کے بگڑے هوئے بھوت۔ لیکن سلطنت کا منه چڑانا بھی ضروری تھا تاکه فرانسیسی قوم کے عام لوگوں کے سر سے روایت کا بوجھ اتارا جائے اور سرکاری طاقت اور سماج میں جو کھلی چوٹ هے وہ کھل کر سامنے آجائے۔ چھوٹی کاشتکاری کی بڑھتی هوئی گراوٹ کے ساتھ ساتھ اس کی بنیاد پر کھڑی هوئی سرکار کی عمارت بھی هل جاتی هے۔ سرکار کی مرکزیت، جس کی ضرورت هے آج کی سوسائٹی کو، وہ صرف فوجی اور نوکرشاهی گورنمنٹ کی مشینری کے ملبے پر بن کر تیار هوتی هے اور یه وہ مشینری هے جسے جاگیرداری سے ٹکر لیتے وقت بنایا گیا تھا*۔

* ۱۸۵۲ء کے ایڈیشن میں اس پیراگراف کے آخر میں دونوں جملوں کے بجائے یه عبارت درج تھی: ''سرکاری مشینری کے ٹوٹنے سے مرکزیت کو کسی قسم کا خطرہ نہیں هوتا۔ بیوروکریسی صرف ایک نیچے کی اور بھدی شکل هے مرکزیت کی جسے خود اپنے مخالف یعنی جاگیرداری کا سامنا رهتا هے۔ جب فرانسیسی کسان نپولین ثانی کی آمد سے مایوس هو چکےگا تو وہ اپنی چھوٹی کاشتکاری پر ایمان کھو بیٹھےگا۔ اور جو سرکاری عمارت اس کاشتکاری کی بنیاد پر کھڑی هوئی هے، وہ ایک دم نیچے آ پڑےگی۔ تب جاکر پرولتاری انقلاب کو بازو کی وہ آوازیں میسر آئیں‌گی جن کے بغیر سارے کسانی ملکوں میں پرولتاری کا ایک سرا نغمه صدا بصحرا هو کر رہ جاتا هے۔،، (ایڈیٹر)

فرانسیسی کسان کی حالت دیکھنے سے ۲۰ اور ۲۱ دسمبر کے عام الکشنوں کا معمہ حل ہو جاتا ہے جنھوں نے بوناپارٹ دوم کو اٹھا کر کوہ طور پر (۱۰۸) پہنچا دیا، اس لئے نہیں کہ اس پر وهاں خدائی احکام نازل ہوں بلکہ اس لئے کہ وهاں سے خدائی احکام نازل کرے۔

ظاهرا بورژوازی کے سامنے اب اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں رہ گیا تھا کہ وہ بوناپارٹ کے حق میں ووٹ دے۔ جب کٹر اخلاق کے پابند اہل ایمان نے کونسٹینس کونسل (۱۰۹) میں پادریوں کی بگڑی ہوئی زندگی کی شکایت کی اور اخلاقی اصلاح کی ضرورت کا رونا رویا تو بڑے پادری صاحب کارڈنل پیئر دی آئی نے گرج کر جواب دیا کہ ''اب صرف شیطان هی کیتھولک چرچ کو تباهی سے بچا سکتا ہے اور آپ لوگ فرشتے طلب کرنے چلے ہیں!،، اسی طرح، جب انقلاب حکومت ہو چکا تو فرانسیسی بورژوازی نے چیخ کر کہا: صرف ''۱۰ دسمبری سوسائٹی،، کا سرغنہ هی بورژوائی سوسائٹی کو بچا سکتا ہے! صرف چوری هی اب ذاتی ملکیت کو، صرف جرائم پیشگی هی مذهب کو، نا جائز ولدیت هی خاندان کو اور بےضابطگی هی ضابطے کو بچا سکتی ہے!

بوناپارٹ انتظامیہ طاقت کی حیثیت سے، بجائے خود حاکم وقت کی حیثیت سے اپنا یہ منصب سمجھتا ہے کہ ''بورژوا ضابطے،، کو خلل سے محفوظ رکھے۔ اس بورژوا ضابطے کی اصل طاقت درمیانی طبقے میں ہے۔ اسی بل پر وہ خود کو درمیانی طبقے کا نمائندہ شمار کرتا ہے اور اسی نسبت سے احکام جاری کرتا ہے۔ لیکن دوسری طرف سے دیکھئے تو وہ جس مرتبے پر پہنچا، صرف اس وجہ سے پہنچا کہ اسی درمیانی طبقے کے سیاسی کس بل نکال دئے اور ہر روز یہ کس بل نکالتا جارہا ہے۔ اس لئے وہ خود کو درمیانی طبقے کی سیاسی اور ادبی طاقت کا مخالف شمار کرتا ہے۔ لیکن اس طبقے کی مادی طاقت قائم رکھنے کی بدولت وہ اس کی سیاسی قوت میں پھر سے جان ڈال رہا ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ سبب کو تو

سنبھال کر رکھا جائے مگر نتیجے کو، جہاں بھی وہ سر اٹھائے روئے زمین سے صاف کردیا جائے۔ لیکن سبب اور نتیجے کے معاملے میں الجھاؤ پڑنا لازمی ہے کیوں کہ سبب اور نتیجہ ایک دوسرے میں ایسے گتھے ہوتے ہیں کہ اپنی امتیازی حیثیت کھو بیٹھتے ہیں۔ نئے فرمان صادر ہوتے ہیں جو کناروں کو گھس کر برابر کر دیتے ہیں۔ اسی دوران بوناپارٹ بورژوازی کے برابر کے پلے میں خود کو کسانوں کا نمائندہ بلکہ سبھی عوام کا نمائندہ بنا کر رکھتا ہے اور آرزو کرتا ہے کہ بورژوا سماج کے دائرے میں رہ کر لوگوں کے نیچےوالے طبقے کو راحت پہنچا دے۔ نئے فرمان صادر ہوتے ہیں، ایسے فرمان جو حکومت چلانے کے ہنر میں ایسے ہوشیار ہیں کہ ''سچے سوشلسٹوں،، (۱۱۰) کے بھی کان کتر لیتے ہیں۔ لیکن بوناپارٹ کی نظر میں اس کی سب سے مقدم حیثیت ''۱۰ دسمبری سوسائٹی،، کے سرغنہ کی ہے، اس آوارہ گرد پرولتاریہ کے نمائندے کی جس میں سے وہ خود نکلا ہے، اس کے مصاحب نکلے ہیں، اس کی حکومت اور فوج نکلی ہے، جنھیں صرف اس سے غرض ہے کہ اپنے ٹھاٹھ بنے رہیں اور سرکاری خزانے کے صندوق سے کیلیفورنیاوالی انعامی لاٹریاں نکالا کریں۔ وہ اپنی ''۱۰ دسمبری سوسائٹی،، کے سرغنہ کی حیثیت کو بنائے رکھتا ہے فرمان نکال کر، فرمان سے کترا کر اور فرمان کے باوجود۔

یہ جو اس شخص کا اندرونی تضادوں سے بھرا مشن ہے، اس میں بوناپارٹ کی حکومت کے ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے عمل کا راز ہے، جو اٹکل پچو ہاتھ پھینک رہی ہے، کبھی ایک طبقے کو کبھی دوسرے کو بڑھانے یا گرانے کی کوشش کرتی ہے، اور سب طبقوں میں ایک ہی طرح اپنی مخالفت ابھار رہی ہے،— ایسی حکومت جس کے عمل میں تو ہچکچاہٹ ہے، لیکن سرکاری احکام میں دبنگ اور نپاتلا لب ولہجہ ہے ان حاکمانہ قوانین کا جو چچاجان (نپولین بوناپارٹ) کے احکام سے آنکھ بند کر کے نقل کئے جاتے ہیں — اپنے عمل اور احکام میں پرلے درجے کے مسخرےپن کا موازنہ پیش کر رہی ہے۔

صنعت اور تجارت، یعنی درمیانی طبقے کا کاروبار مضبوط حکومت کے سائے میں خوب پھلنا پھولنا چاہئے، جیسے بند نرسری میں پودے - ریلوے میں بےشمار رعایتیں دھڑا دھڑ دی جا رہی ہیں - بہرحال بوناپارٹ‌والے آوارہ‌گردوں کو روپیہ بنانا ہے - ریلوے میں ملنے‌والی رعایتوں کے گپت سودے پر پہلے سے سٹہ لگایا جاتا ہے، جیسے تاش کے ایک کھیل میں پتوں کی چال پر - پھر بھی ریلوے کے لئے سرمایہ ملتا نظر نہیں آتا - بینک کو حکم پہنچتا ہے کہ ریلوے کے کھاتے میں قرضے کھولے - لیکن بوناپارٹ کو خود بھی بینک سے ذاتی فائدہ اٹھانا ہے - اس لئے بینک کو بھی چمکارنا ضروری ہے - چناں‌چہ بینک کو ہر ہفتے اپنا حساب شائع کرنے سے چھٹی مل جاتی ہے - وہ حکومت سے ایسا راضی نامہ کر لیتا ہے کہ بڑا حصہ حکومت کے ہاتھ میں پہنچتا رہے - لوگوں کو روزگار ملنا چاہئے - سماجی کاموں کی داغ بیل ڈالی جاتی ہے - لیکن سماجی کاموں سے لوگوں پر ٹیکسوں کا بوجھ بھی بڑھتا ہے - اس لئے ٹیکس کا بوجھ ہلکا کرنا ہے تو بونڈ کی رقم پر ہاتھ ڈالا جائے، جہاں بونڈ پر پانچ فیصدی سود دیا جاتا تھا اسے ساڑھے چار فیصدی کر دیا جائے - لیکن بورژوازی کو پھر سے میٹھی گولی دینی چاہئے - اس لئے شراب پر ٹیکس دوگنا کر دیا جائے عام لوگوں کے لئے، جو تھوڑی تھوڑی مقدار میں خریدتے ہیں، اور آدھا کر دیا جائے اکٹھی مقدار میں لینے‌والے درمیانی طبقے کے لئے - مزدوروں کی جو انجمنیں چل رہی تھیں، انہیں توڑ دیا جاتا ہے، لیکن حکومت یہ وعدہ بھی کر لیتی ہے کہ آئندہ انجمنوں کی کراماتیں ظاہر ہوگی - کسانوں کی مدد کرنی ہے - رہن رکھ‌کر قرضہ دینے‌والے بینک کھولے جاتے ہیں جن سے کسان اور بھی تیزی سے مقروض ہونے لگتے ہیں اور زمینی جائداد سمٹنے لگتی ہے - مگر ان بینکوں سے کام یہ لینا ہے کہ اورلین گھرانے‌والوں کی جو جائدادیں ضبط کی گئی ہیں ان سے نقد روپیہ نچوڑا جائے - اس آخری شرط پر، جو فرمان میں درج نہیں ہے، ایک بھی سرمایہ‌دار راضی نہیں ہوتا، نتیجہ یہ کہ قرضہ بینک کاغذی فرمان پر ہی رہ جاتے ہیں، وغیرہ وغیرہ -

بوناپارٹ کی آرزو تھی کہ وہ تمام طبقوں کے شفیق سرپرست کا رول ادا کرے۔ لیکن کسی ایک طبقے سے چھینے بغیر دوسرے طبقے کو کچھ دینا اس کے بس سے باہر ہے۔ جس طرح فرونڈے کے زمانے میں ڈیوک گیز کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ فرانس میں کارخیر کا سب سے بڑا دھنی تھا کیوں کہ اس نے اپنے حمایتیوں کے تمام قرضے اپنے نام لے کر ساری املاک اور جائداد ان قرضوں پر چڑھالی، اسی طرح بوناپارٹ کا جی چاہا کہ وہ بھی فرانس میں سب سے بڑا محسن بن جائے اور فرانس کی ساری ملکیت، ساری جائداد اور محنت کو خاص اپنے نام ذاتی قرضے میں چڑھوالے۔ اسے خواہش ہوئی کہ سارے فرانس کی چوری کر لے تاکہ پھر فرانس کو تحفے میں بخش دے، یا یہ زیادہ صحیح ہوگا کہ پھر فرانس کو فرانسیسی سکے میں خریدے کیونکہ ''۱۰ دسمبری سوسائٹی،، کے سرغنہ کی حیثیت سے اسے وہی خریدنا ہے جو اس کی جیب میں پڑا رہے۔ جتنے سرکاری ادارے ہیں، سنیٹ ہے، اسٹیٹ کونسل ہے، قانون‌ساز ادارہ ہے، صاحب امتیاز لیجن، فوجی تمغے، واشنگ فیکٹریاں، سماجی کام، ریلوے، نیشنل گارڈ کا جنرل ہیڈکوارٹر جس میں عام والنٹیر شامل نہیں، اورلین گھرانے کی ضبطشدہ جائداد یہ سب بکاؤ مال ہو جاتاہے۔ فوج میں اور حکومت کے عہدوں میں جتنی آسامیاں ہیں ان کے مول پر خریداری کرنی ہے۔ لیکن اس پورے معاملے میں کہ فرانس کا سودا کرنا ہے اور پھر سب اسی کے حوالے کر دینا ہے، سب سے خاص بات یہ ہے کہ لین دین میں جو بیچ کا کمیشن ہاتھ لگےگا، وہ سارے کا سارا ''۱۰ دسمبری سوسائٹی،، کے سرغنہ اور اس کے ممبروں کی جیب میں جائےگا۔ اورلین گھرانے کی جائداد ضبط ہونے پر نواب‌زادی ''ایل،، نے جو موسیو دی مورنی کی داشتہ ہیں، ایک جملہ کسا تھا «C'est le premier vol de l'aigle» * (''یہ شکرے کی پہلی پرواز ہے،،)۔ یہی جملہ اس شکرے کی ہر ایک پرواز پر صادق آتا ہے جو

* لفظ «vol» کے دو معنی ہیں اڑان اور چوری۔

شکرے کے بجائے کوے سے زیادہ مشابہ ھے۔ وہ اور اس کے حوالی موالی روزانہ آپس میں ایک دوسرے سے وھی الفاظ کہا کرتے ھیں جو اٹلی کے ایک تارک دنیا نے ایسے کنجوس سے کہے تھے جو اپنی دولت کا شمار کرکے بڑی شیخی مارا کرتا تھا کہ اتنی دولت ھے جو عمر کے سالہا سال تک کافی ھوگی ''تم اپنی دولت شمار کرتے ھو، تمھیں چاھئے تھا کہ پہلے اپنی عمر کے سال شمار کر لیتے''۔ کہیں سال گننے میں غلطی نہ ھو جائے، یہ لوگ زندگی کے منٹ گنا کرتے ھیں۔ شاھی محل کی طرف، وزارتی دفتروں میں، سرکاری محکموں اور فوج کے سب سے اونچے مقام پر بانکوں کی ریل پیل ھے، جس میں سب سے بہتر کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ھے کہ معلوم نہیں کہاں سے نکل پڑے ھیں۔ یہ شور مچاتے ھوئے، بدنامی ٹپکاتے ھوئے، اکھڑ اور اوت پٹانگ لوگ، جنھوں نے پھندنے ٹنکی ھوئی وردیاں اوپر سے لاد رکھی ھیں، ایسی بناوٹی شان سے اینٹھتے پھرتے ھیں جیسے سولوک فاؤستین کے بڑے آدمی۔ ایک نظر میں ''۱۰ دسمبری سوسائٹی'' کے اس اوپروالے درجے کا جلوہ دیکھا جا سکتا ھے اگر یہ بھی دھیان میں رکھا جائے کہ ان لوگوں کا اخلاقی معلم وہ شخص ھے جسے ''ویروں کرےویل'' * کہنا چاھئے اور ان کا مفکر وہ ھے جسے ''گرانئے دی کسانیاک'' کہا جائے۔ گیزو اپنے زمانہ وزارت میں ایک گپ‌چپ اخبار کے اندر اسی گرانئے کو سوروثی خاندان‌والے حزب مخالف کے توڑ پر ھتھیار کی طرح استعمال کرتے وقت یوں ھی اس کی شان میں یہ جملہ کہا کرتا تھا «C'est le roi des drôles» — ''مسخروں کا بادشاہ ھے یہ''۔ بڑی زیادتی ھوگی اگر لوئی بوناپارٹ کے محل اور اس کی ٹولی کو ریجنسی کے زمانے (۱۱۱) یا لوئی پانزدھم کے زمانے کے محل سے برابر کی سطح پر رکھا جائے۔ کیوں کہ ''فرانس

---

* بالزاک نے اپنے ناول «Cousine Bette» میں ڈاکٹر ویروں کو کرےویل کے نام سے پیش کیا ھے۔ یہ ڈاکٹر ویروں اخبار ''کانسٹی‌ٹیوشنل'' کا مالک ھے اور پیرس کا انتہائی بکواسی اور بدچلن آدمی ھے۔

پر یہ بپتا کئی بار پڑی ہے کہ داشتاؤں نے حکومت چلائی لیکن یہ کبھی نہیں بیتی کہ الفانسو (رکھیل مردوں) نے حکومت کی ہو،،۔ *

بوناپارٹ جس صورت حال میں ہے اس کے متضاد تقاضوں سے عاجز آکر، پھر ایک شعبدہ باز کی سی پوزیشن میں، اس مجبوری سے کہ آخر نپولین کی جگہ سنبھالی ہے تو نئی نئی انھونی حرکتوں کے ذریعے پبلک کی پوری توجہ اپنی طرف رکھی جائے، یا یوں کہئے کہ ہر روز چھوٹے پیمانے پر انقلاب حکومت کرکے، اس نے بورژوازی کی معاشی دنیا میں نفسانفسی پھیلا دی ہے، ۱۸۴۸ء کے انقلاب نے بھی جن چیزوں کو ہاتھ نہیں لگایا تھا ان میں الٹ پلٹ کردی ہے، اور اس طرح ایک کو تو یہ سکھا دیا کہ انقلاب کے وجود و عدم سے اسے کوئی مطلب نہیں، دوسرے کے دل میں انقلاب کی تمنا جگادی، ضابطے کے نام سے صحیح معنوں میں افراتفری عام کر دی اور ساتھ ہی یہ بھی کہ سرکاری کل پرزوں کی پوری مشینری کو اس کے ہالے سے محروم کر دیا، اسے بےننگ و نام کر ڈالا، ایسا بنا دیا کہ دیکھ کر گھن بھی آئے اور ہنسی بھی۔ عبائے مقدس (۱۱۲) کی زیارت کا جو ایمان چلا آتا تھا، اب وہ اس کی جگہ پیرس میں نپولینی عبائے شہنشاہی کی زیارت‌گاہ کا چربہ اتارنے کی فکر کر رہا ہے۔ لیکن یہ عبائے شہنشاہی اگر آخر میں لوئی بوناپارٹ کے شانوں پر پھیل گئی تو ویندوم کی لاٹ پر (۱۱۳) نپولین کا کانسی کا مجسمہ چکنا چور ہوکر رہ جائے گا۔

مارکس نے دسمبر ۱۸۵۱ء اور
مارچ ۱۸۵۲ء کے درمیان لکھا۔
رسالے « Die Revolution »
(نیویارک) کے پہلے شمارے
۱۸۵۲ء میں شائع ہوا مارکس
کے دستخط کے ساتھ۔

---

* یہ الفاظ مادام ژیراردین نے کہے تھے۔

تشریحی نوٹ

۱- ''فائرباخ پر تھی‌سیس،، کارل مارکس نے ۱۸۴۵ء کے موسم بہار میں بروسلز میں لکھا تھا۔ یہ وہ وقت ہے کہ مارکس نے تاریخ پر اپنے مادی نظریے کا خاکہ تیار کر لیا تھا اور تفصیل سے یہ دکھایا تھا کہ انسانی سماج کا تجزیہ کرنے کے لئے تاریخ پر مادیت کے اصول کس طرح صادق آتے ہیں۔ اینگلس کا بیان ہے کہ ''یہ وہ پہلی ٹھوس تحریر ہے جس میں دنیا کو دیکھنے سمجھنے کے لئے ایک زبردست اور نئی بصیرت موجود ہے،، (ملاحظہ ہو چوتھی جلد میں کتاب ''لوڈوگ فائرباخ،، پر دیباچہ)۔ مارکس نے اس تصنیف میں جتایا ہے کہ فائرباخ کے اور اس سے پہلے کے اصول مادیت کی اصل کمزوری کیا ہے، یہ کہ مادیت کے ان فلسفوں کا مزاج محض مطالعہ کرنے کا ہے، وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ انسان کی سرگرمی انقلابی ہوتی ہے اور ''عملی پرکھ،، رکھتی ہے۔ مارکس نے اس پر زور دیا ہے کہ دنیا کا علم حاصل کرنے اور دنیا کو بدلنے میں انقلابی عمل قول فیصل کی حیثیت رکھتا ہے۔ صفحہ ۳۹

۲ - ''کمیونسٹ پارٹی کا مینیفسٹو،، علمی کمیونزم کی پالیسی ظاہر کرنےوالی پہلی دستاویز ہے جس میں مارکس اور اینگلس کی عظیم الشان تعلیمات کا مکمل اور مرتب بیان ہے۔ لینن کا کہنا ہے کہ ''اس تصنیف میں کمال وضاحت اور سلاست کے ساتھ دنیا کا ایک نیا تصور پیش کیا گیا ہے۔ مادیت کے مستقل نظریات دئے گئے ہیں جن میں سماجی زندگی کا دائرہ بھی شامل ہے، جدلیات کا بیان ہے کہ وہ تبدیلیوں کا نہایت ہی جامع اور گہرا نظریہ ہے، طبقاتی کش مکش کا نظریہ بیان ہوا ہے اور یہ کہ نئے کمیونسٹ سماج کا جنم داتا پرولتاریہ طبقہ عالمی تاریخ میں انقلابی رول رکھتا ہے۔،،

''کمیونسٹ پارٹی کا مینیفسٹو،، پرولتاریہ کو اس علمی ثبوت کا ہتھیار دے گیا کہ سرمایہداری نظام کا دم توڑ دینا لازمی ہے اور پرولتاری انقلاب کی فتح بہرحال ہوکر رہےگی۔ اس نے نقشہ تیار کر دیا کہ مزدور طبقے کی انقلابی تحریک کو کیا مقاصد اور کون سے فریضے درپیش ہیں۔ صفحہ ۴۳

۳ - کمیونسٹ لیگ — پرولتاریہ کی پہلی کمیونسٹ انٹرنیشنل تنظیم، جس کی بنیاد مارکس اور اینگلس نے رکھی تھی۔ ۱۸۴۷ء سے ۱۸۵۲ء تک قائم رہی۔ ملاحظہ ہو اینگلس کا مضمون ''کمیونسٹ لیگ کی تاریخ پر،، (تیسری جلد میں)۔ صفحہ ۴۳

۴ - اس کا اشارہ ہے فرانس میں ۱۸۴۸ء کے فروریوالے انقلاب کی طرف۔ صفحہ ۴۳

۵ - «The Red Republican» (سرخ ریپبلکن) — ہفتہوار چارٹسٹ اخبار کا نام جو لندن سے جارج ہارنی نے جاری کیا اور جون سے نومبر ۱۸۵۰ء تک چلا۔ ۲۱ سے ۲۴ شمارے تک اسی اخبار میں ''مینیفسٹو،، کا خلاصہ شائع ہوا تھا۔ صفحہ ۴۴

۶- پیرس کے مزدوروں نے جو ۲۳ جون سے ۲۶ جون ۱۸۴۸ء تک علم بغاوت بلند کیا اس کی طرف اشارہ ہے۔ فرانسیسی بورژوازی نے اس بغاوت کو انتہائی بےرحمی سے کچل ڈالا۔ یہ بغاوت بورژوازی اور پرولتاریہ کے درمیان پہلی زبردست خانہ جنگی تھی۔ صفحہ ۴۳

۷- «Le Socialiste» (سوشلسٹ) — ایک ہفتہوار اخبار تھا جو نیویارک سے اکتوبر ۱۸۷۱ء سے مئی ۱۸۷۳ء تک فرانسیسی زبان میں شائع ہوتا رہا۔ انٹرنیشنل کا جو شمالی امریکی فیڈریشن تھا یہ اخبار اس کے فرانسیسی سیکشن کا ترجمان تھا۔ ہیگ میں انٹرنیشنل کی کانگرس کے بعد وہ انٹرنیشنل سے الگ ہو گیا۔ ''کمیونسٹ پارٹی کے مینیفسٹو،، کے جس فرانسیسی ترجمے کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے وہ اسی اخبار ''لے سوشلستے،، میں ۱۸۷۲ء کے جنوری سے مارچ تک کے شماروں میں چھپا تھا۔ صفحہ ۴۳

۸- ۱۸۷۱ء کا پیرس کمیون — یہ مزدور طبقے کی انقلابی حکومت تھی جو ۲۸ مارچ سے ۲۸ مئی ۱۸۷۱ء تک چلی۔ عام طور سے پیرس کمیون کا مطلب یہی لیا جاتا ہے کہ ۱۸ مارچ ۱۸۷۱ء کا پرولتاری انقلاب اور اس کے فوراً بعد قائم ہونےوالی پرولتاری ڈکٹیٹرشپ کا زمانہ۔ ''فرانس میں خانہ جنگی،، اسی پیرس کمیون کی تاریخ سے بحث کرتی ہے اور اس کے خاص خاص نکتوں پر تفصیل سے بحث کرتی ہے۔ (ملاحظہ ہو موجودہ مجموعے کی دوسری جلد۔) صفحہ ۴۴

۹- کولون میں کمیونسٹوں پر مقدمہ — ۴ اکتوبر سے ۱۲ نومبر ۱۸۵۲ء تک چلنےوالا یہ مقدمہ کمیونسٹ لیگ کے گیارہ ممبروں پر ایک بناوٹی مقدمہ تھا جو پروشیائی حکومت نے چلوایا تھا۔ جعلی دستاویزوں اور فرضی گواہیوں کے بل پر انقلاب حکومت کی سازش کا الزام رکھ کر ان گیارہ

میں سے سات کو تین سے چھ سال تک قید کی سزا سنا کر ایک قلعے میں قید کر دیا گیا۔ پروشیا کے پولیس راج نے مزدور طبقے کی انٹرنیشنل تحریک پر جو کیچڑ اچھالی اور اشتعال دلایا اس کی حقیقت مارکس اور اینگلس نے کھول کر رکھ دی۔ صفحہ ۳۶

۱۰- یہ اشارہ ہے پیرس میں جون ۱۸۴۸ء کی بغاوت کی طرف (ملاحظہ ہو نوٹ نمبر ٦)۔ صفحہ ۳۸

۱۱- یہ دیباچہ اینگلس نے پہلی مئی ۱۸۹۰ء کو لکھا تھا۔ یہ وہ دن ہے جب دوسری انٹرنیشنل کی پیرس کانگرس کے فیصلے (جولائی ۱۸۸۹ء) کے مطابق یورپ اور امریکہ کے کئی ملکوں میں جلسے، جلوس اور ہڑتالوں کے پروگرام پر عمل ہوا۔ مزدوروں نے اس مطالبے کی آواز بلند کی کہ آٹھ گھنٹے سے زیادہ کام نہ لیا جائے اور کانگرس کے طے کئے ہوئے دوسرے مطالبے بھی پیش کئے۔ تب سے آج تک ہر سال پہلی مئی کا دن تمام ملکوں میں مزدوروں کی طرف سے پرولتاریہ کی اخوت کا تہوار سمجھ کر منایا جاتا ہے۔ صفحہ ۳۸

۱۲- صلیبی جنگوں کا یہ اشارہ ہے اس طرف کہ گیارھویں سے تیرھویں صدی تک مغربی یورپ کے بڑے بڑے والیان ریاست نے، جنگجو سرداروں نے اور اطالیہ کے تجارتی شہروں نے مشرق پر غلبہ قائم کرنے کے لئے فوجی چڑھائی کی تھی اور مذہبی غرض یہ بتائی تھی کہ یروشلم اور دوسرے مقدس مقامات کو مسلمانوں سے چھین لیاجائے۔ ان صلیبی جنگوں کی پشت پر کیتھولک چرچ کا اور کلیسائی نظام کا ہاتھ تھا، اسی نے جنگوں کے حق میں فتوی دیا اور کوشش کی کہ دنیا بھر کو اپنے زیر اقتدار لایا جائے۔ جنگجو سرداروں نے ان لڑائیوں کے لئے تن من لگایا اور وہ کسان جو جاگیرداروں کے جوئے سے آزادی کے طلبگار

تھے، وہ بھی ان جنگوں میں شریک ہوگئے۔ مجاهدین جن جن ملکوں سے گزرے وهاں انهوں نے مسلمان اور مسیحی آبادیوں پر قتل و غارت کا بازار گرم کردیا۔ ان کے غاصبانہ حملے کا نشانہ صرف وہ مسلم حکومتیں هی نہیں بنیں جو شام (سیریا)، فلسطین، مصر اور تیونس میں قائم تھیں بلکہ بازنطین کی مسیحی سلطنت بھی زد میں آئی۔ بحرروم کے مشرق میں جہاں جہاں انہوں نے فتح کے جھنڈے گاڑے وہ زیادہ عرصے نہیں لہرائے اور مسلمانوں نے انہیں وهاں سے بےدخل کر دیا۔ صفحہ ۵۵

۱۳ - بعد کی تحریروں میں مارکس اور اینگلس نے زیادہ قطعی لفظ استعمال کئے هیں۔ ''محنت کی لاگت،، اور ''محنت کی قیمت،، کے بجائے مارکس نے ''قوت محنت کی لاگت،، اور ''قوت محنت کی قیمت،، کے لفظ اختیار کئے۔ (اس سلسلے میں ملاحظہ هو مارکس کے مضمون ''مزدوری اور سرمایہ،، پر اینگلس کا دیباچہ، اسی جلد کے صفحات ۹۶ — ۱۰۸ -) صفحہ ۶۰

۱۴ - یہ اشارہ هے انقلاب فرانس کی طرف، جو فرانسیسی بورژوازی نے ۱۸ ویں صدی کے آخر میں کیا تھا۔ صفحہ ۶۹

۱۵ - یہاں انگلینڈ کے انتخابی قانون کی اصلاح کا حوالہ دیا گیا هے۔ لوگوں کے دباؤ سے دارالعوام نے ۱۸۳۱ء میں انتخابی قانون کی اصلاح کی تھی اور دارالامرا نے آگے چل کر جون ۱۸۳۲ء میں اس کی منظوری دےدی تھی۔ اوپر کے جاگیرداری اور مالیاتی شرفا کو جو سفید و سیاہ کا اختیار حاصل تھا، اصلاح کا رخ اسی کے خلاف تھا اور جب نیا انتخابی قانون بن گیا تو صنعتی بورژوازی کے نمائندوں کے لئے پارلیمنٹ کے دروازے کھل گئے۔ اصلاح کے لئے زور لگانے والی اصل طاقت پرولتاریہ اور چھوٹی حیثیت کی بورژوازی تھی اور قانون بن جانے پر اعتدال پسند بورژوازی نے انھی طبقوں

کو دھوکے میں رکھا، انہیں انتخاب کا اختیار نہیں ملنے دیا۔ صفحہ ۷۹

۱۶ - شاہی کی بحالی — ۸۹ — ۱۶۶۰ء میں انگلینڈ میں اسٹوارٹ شاہی خاندان کی حکمرانی کا دوسرا دور جسے بورژوا انقلاب نے ۱۷ ویں صدی کی ابتدا میں بےدخل کردیا (اسی سلسلے میں ملاحظہ ہو نوٹ نمبر ۱۰۵)۔

شاہی کی بحالی ۱۸۱۴ء سے ۱۸۳۰ء تک — فرانس میں بوربون شاہی خاندان کے اختیارات کا دوسرا دور۔ بوربون گھرانے کی رجعت پرست حکومت امیروں اور پادریوں کے مفادوں کی نمائندہ تھی۔ ۱۸۳۰ء کے انقلاب نے اس کا خاتمہ کردیا۔ صفحہ ۷۹

۱۷ - "ینگ انگلینڈ" — یہ ایک گروہ تھا سیاسی لیڈر اور صاحب قلم انگریزوں کا جو ٹوری پارٹی سے (نوٹ نمبر ۸۲ ملاحظہ ہو) تعلق رکھتے تھے۔ ۱۸۴۰ء کے فوراً بعد یہ گروپ قائم ہوا۔ اوپر کے جاگیرداروں کو بورژوازی کے بڑھتے ہوئے معاشی اور سیاسی غلبے سے جو ناگواری تھی، اس کا اظہار کرنے میں "ینگ انگلینڈ" کے لیڈروں نے لفظوں کا طومار باندھ دیا تاکہ مزدور طبقہ ان کے اثر میں آجائے اور وہ اسے بورژوازی کے مقابلے میں اپنا آلۂ کار بنائیں۔ صفحہ ۸۰

۱۸ - "جائزوارث والے" (Legitimists) — اسی بوربون خاندان کی بادشاہت کے حمایتی تھے جو ۱۸۳۰ء میں بےدخل کی گئی اور جب تک رہی اوپر کے جاگیرداروں کا دم بھرتی رہی۔ پھر اورلین خاندان کی حکومت (۱۸۳۰ء — ۱۸۴۸ء) قائم ہوگئی تو اس کا تکیہ تھا اوپر کے مالیاتی شرفا اور بڑی حیثیت کی بورژوازی پر۔ ان کا زور توڑنے کے لئے جائز وارث والوں کے ایک حصے نے سماجی حقوق کی لفاظی

سے کام لیا اور بڑے سرمایہداروں کی لوٹ کھسوٹ کے مقابلے میں محنت کرنےوالوں کے طرفدار بن کر کھڑے ہوگئے۔ صفحہ ۸۰

۱۹ - یونکر — محدود معنوں میں اس لفظ کا مطلب ہے مشرقی پروشیا کے صاحب جائداد شرفا، عام طور سے یہ لفظ جرمن جاگیرداروں کے طبقے کےلئے استعمال ہوتا ہے۔ صفحہ ۸۱

۲۰ - یہاں اس بورژوا جمہوری انقلاب کا حوالہ دیا گیا ہے جو ۱۸۴۸ء — ۱۸۴۹ء میں جرمنی میں ہوا تھا۔ صفحہ ۸۷

۲۱ - یروشلم — فلسطین کا مشہور مذہبی شہر جہاں یہودیوں اور مسیحیوں کے مقدس مقامات ہیں۔
نیا یروشلم — مسیحی روایات میں جنت کا هم معنی۔ صفحہ ۸۸

۲۲ - چارٹزم — ۱۹ ویں صدی کے انگلینڈ میں یہ برطانوی مزدوروں کی سیاسی تحریک تھی جو ۳۰ء سے ۵۰ء تک چند سال کے دوران چلی۔ یہ تحریک مزدوروں کی معاشی حالت کی ابتری اور سیاسی حقوق سے محرومی نے برپا کی تھی۔ اس تحریک کا شناختی لفظ تھا چارٹزم — یعنی عوامی چارٹر پر عمل کرانے کی کوشش کی جائے۔ اس چارٹر میں عام رائے دهندگی کا حق اور کئی ایسی شرطیں شامل تھیں جن سے مزدوروں کو یہ حق حاصل ہو۔ لینن کے لفظوں میں چارٹزم ''پرولتاریوں کی پہلی انقلابی تحریک تھی جو وسیع، صحیح معنوں میں عوام تک پھیلی ہوئی اور سیاسی لحاظ سے منظم رہی''۔ صفحہ ۹۲

۲۳ - یہ اشارہ ہے پیٹیبورژوا ریپلکن جمہوریت پسندوں کی طرف اور پیٹی بورژوا سوشلسٹوں کی طرف جو فرانسیسی اخبار «La Réforme» (اصلاح) کے ماننےوالے تھے۔ یہ لوگ ریپلک کے حق میں اور جمہوری سماجی اصلاحوں کی تائید میں کھڑے ہوئے۔ صفحہ ۹۲

۲۴ - «La Réforme» (اصلاح) پیرس سے شائع ہونےوالا فرنچ روزنامہ جو ۱۸۴۳ء سے ۱۸۵۰ء تک چلا۔ صفحہ ۹۳

۲۵ - فروری ۱۸۴۶ء میں تیاری تھی کہ پولینڈ کے سارے علاقوں میں بغاوت اٹھ کھڑی ہو تاکہ قومی آزادی حاصل کی جائے۔ پولینڈ کے انقلابی ڈیموکریٹ (دیمبوفسکی وغیرہ) اس شورش کے بانی‌مبانی تھے۔ لیکن شریف‌زادوں کے ایک حصے نے راز کھول دیا اور پروشیا کی پولیس نے بغاوت کے رہنماؤں کو گرفتار کرلیا جس کے کارن صرف چند مقامات پر شورش ہوکر رہ گئی۔ البتہ کراکف کے مقام پر، جہاں آسٹریا، روس اور پروشیا کا ملاجلا کنٹرول تھا، ۲۲ فروری کی تاریخ میں باغیوں کو فتح نصیب ہوئی۔ انھوں نے قومی حکومت قائم کرلی اور مینی‌فسٹو نکالا جس میں جاگیرداروں کی بیگار کو منسوخ کردیا گیا تھا۔ کراکف کی بغاوت مارچ ۱۸۴۶ء کے شروع میں کچل دی گئی۔ نومبر ۱۸۴۶ء میں آسٹریا، روس اور پروشیا نے ایک صلح‌نامے پر دستخط کئے جس کی رو سے کراکف آسٹریائی سلطنت میں ملا دیا گیا۔ صفحہ ۹۴

۲۶ - ''مزدوری اور سرمایہ،، شائع کرتے وقت مارکس نے یہ مدنظر رکھا کہ انؐ معاشی رشتوں کو عام فہم زبان میں پیش کیا جائے جو سرمایہ‌داری سماج میں طبقاتی کش‌مکش کی مادی بنیاد ہوتے ہیں۔ مقصد یہ تھا کہ پرولتاریہ کے ہاتھ میں نظریاتی ہتھیار دے دیا جائے، اسے اچھی طرح یہ ذہن‌نشین کردیا جائے کہ سرمایہ‌داری سماج میں بورژوازی کے طبقاتی اقتدار کی جڑ بنیاد یہی مزدوروں کی اجرتی غلامی ہے۔ قدرزائد کے اپنے نظریے کی داغ بیل ڈالنے کے بعد اسے آگے بڑھاتے ہوئے مارکس نے ایک مجموعی نظریہ تیار کیا کہ سرمایہ‌داری میں مزدور طبقہ نسبتاً

بھی مفلس ہوتا جاتا ہے اور اس کا افلاس قطعی طور سے بھی بڑھتا ہے۔

سوجودہ ایڈیشن میں ۱۸۹۱ء والی اس عبارت کو لفظ بلفظ شائع کیا جا رہا ہے جسے اینگلس نے ترتیب دیا تھا۔ صفحہ ۹۶

۲۷ - «Neue Rheinische Zeitung. Organ der Demokratie» جرمن زبان کا روزنامہ تھا جو کولون شہر سے مارکس کی ایڈیٹری میں پہلی جون ۱۸۴۸ء سے ۱۹ مئی ۱۸۴۹ء تک نکلتا رہا۔ اس کی ادارت میں مارکس کے ساتھ اینگلس بھی شریک تھا۔ صفحہ ۹۶

۲۸ - جرمن مزدوروں کی سوسائٹی — بروسلز میں مارکس اور اینگلس نے اگست ۱۸۴۷ء کے آخر میں یہ سوسائٹی اس مقصد سے قائم کی تھی کہ ان جرمن مزدوروں میں سیاسی بیداری پھیلائی جائے جو بلجیم میں رہتے ہیں، انھیں علمی کمیونزم کے نظریات سے آشنا کیا جائے۔ مارکس، اینگلس اور ان کے حامیوں کے زیراثر یہ سوسائٹی بلجیم کے اندر رہنےوالے جرمن انقلابی مزدوروں کو اکٹھا کرنے کا ایک قانونی مرکز بن گئی۔ اس سوسائٹی کے خاص خاص ممبر ''کمیونسٹ لیگ،، کی بروسلزوالی شاخ کے بھی ممبر ہوگئے۔ فرانس میں فروری ۱۸۴۸ء کا بورژوا انقلاب چھڑتے ہی بلجیم کی پولیس نے گرفتاری اور جلاوطنی کا ہنگامہ اتنا گرم کیا کہ آخر جرمن ورکرز سوسائٹی کی سرگرمی ٹھنڈی پڑ گئی۔ صفحہ ۹۶

۲۹ - یہ اشارہ ہے اس طرف کہ ۱۸۴۹ء میں زار روس کی فوج نے ہنگری میں قدم بڑھایا تاکہ وہاں بورژوا انقلاب کو دبا دیا جائے اور آسٹریا کے ہپسبورگ شاہی خاندان کا اقتدار پھر بحال کردیا جائے۔ صفحہ ۹۶

۳۰ - مطلب یہ کہ مئی سے جولائی ۱۸۴۹ء تک جرمنی میں عام شورش ہوگئی تھی۔ فرینکفورٹ کی پارلیمنٹ نے ۲۸

مارچ ۱۸۴۹ء کو ایک شاہی قانون منظور کیا تھا جسے کئی جرمن ریاستوں نے نامنظور کردیا، یہ شورش اسی کی حمایت میں تھی۔ مگر چوں کہ شورش خودبخود اٹھی تھی اور اس میں کوئی ترتیب و تنظیم نہیں تھی، اسے جولائی ۱۸۴۹ء میں کچل دیا گیا۔ صفحہ ۹۶

۳۱ - مارکس کے کاغذات میں سے بعد میں ایک مسودہ ملا۔ اجرتی محنت (مزدوری) اور سرمائے کے مسئلے پر مارکس نے جو لکچر دئے تھے ان کا سلسلہ یکجا کرکے اس پر خاتمہ لکھنا تھا اور یہ اسی کا کچا خاکہ تھا جسے ''اجرتیں،، کے عنوان کے تحت رکھا گیا تھا۔ تحریر کے اوپر ''بروسلز، دسمبر ۱۸۴۷ء،، کے الفاظ بھی درج تھے۔ مضمون پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسودہ بھی اسی مقالے کی ایک کڑی تھی جو ''مزدوری اور سرمائے،، کے عنوان سے لکھا گیا مگر اس تحریر کے آخری باب، جو پریس میں بھیجنے کے لئے تیار تھی، مارکس کے کاغذات میں کہیں دستیاب نہیں ہوئے۔ صفحہ ۹۶

۳۲ - مارکس نے اپنی تصنیف ''سرمایہ،، میں لکھا ہے کہ ''کلاسیکی سیاسی معاشیات سے میرا مطلب ہے وہ معاشیات جس نے ولیم پیٹی کے زمانے سے آج تک یہ چھان‌بین کی ہے کہ بورژوا سماج میں پیداوار کے اصل رشتے کیا ہیں۔،، کلاسیکی سیاسی معاشیات کے بڑے ترجمان برطانیہ میں یہ دو آدمی گزرے ہیں: آدم اسمتھ اور ڈیوڈ ریکارڈو۔ صفحہ ۹۸

۳۳ - اینگلس نے اپنی تصنیف ''اینٹی ڈیورنگ،، میں لکھا ہے ''سیاسی معاشیات کا علم اگرچہ ۱۷ ویں صدی کے آخر میں کچھ غیرمعمولی دماغوں کے اندر ابھرا تھا، تاہم اپنے محدود معنوں میں جیسا کہ اسے سرمایہ‌دارانہ کاشتکاری کے حامیوں (physiocrates) نے اور آدم اسمتھ نے معین کردیا

ہے، اصل میں اٹھارویں صدی کی ہی پیدائش کہنا چاہئے۔،،
صفحہ ۹۹

۳۴ - اینگلس کا اشارہ ہے ۱۸۹۱ء کے یوم مئی کے تہوار کی طرف۔ بعض ملکوں مثلاً برطانیہ اور جرمنی میں پہلی مئی کا تہوار مئی کے پہلے اتوار کو منایا گیا۔ ۱۸۹۱ء میں ۳ مئی کو پہلا اتوار پڑا تھا۔ صفحہ ۱۰۸

۳۵ - ۱۸۴۸ء کے مارچ میں پروشیا میں انقلاب برپا ہوا تھا، یہاں اس کی طرف اشارہ ہے۔ صفحہ ۱۰۹

۳۶ - شہنشاہ آسٹریا کی فوج نے ہفتہ بھر کی زبردست خون ریزی کے بعد پہلی نومبر ۱۸۴۸ء کو ویانا کی عوامی شورش بزور شمشیر دبا دی اور شہر چھین لیا۔

نومبر– دسمبر ۱۸۴۸ء میں پروشیا میں رجعت پرستوں نے حکومت کا تختہ الٹدیا۔ پہلی نومبر کو انقلاب کی کھلی مخالف حکومت نے اقتدار سنبھالا۔ ۹ نومبر کو پروشیائی نیشنل اسمبلی کا اجلاس برلن سے برنڈنبرگ کے شہر منتقل کردیا گیا۔ اسمبلی کے ممبروں کی اکثریت جو برلن میں ہی اجلاس کئے جا رہی تھی فوج بھیج کر ۱۵ نومبر کو منتشر کردی گئی۔ اس انقلاب حکومت کا انجام یوں ہوا کہ ۵ دسمبر کو نیشنل اسمبلی توڑ دی گئی اور ایک رجعت پرستانہ آئین کی منظوری کا اعلان ہو گیا۔ صفحہ ۱۱۰

۳۷ - یہاں مارکس کا مطلب ہے قومی آزادی کی ان شورشوں سے جو ۱۸۴۸ء اور ۱۸۴۹ء میں ہنگری، اٹلی اور پولینڈ میں اٹھی تھیں۔ صفحہ ۱۱۰

۳۸ - اشارہ ہے ایک پرانی داستان کی طرف جس میں بتایا گیا ہے کہ شاہ فریگیا گوردی نے رتھ کے ڈنڈے سے ایک جوا باندھا تھا اور باندھنے میں پیچ در پیچ گانٹھ لگادی تھی۔ کہتے ہیں کہ جو کوئی اس گانٹھ کو کھول سکتا وہی

ایشیا کا بادشاہ بن جاتا۔ سکندر اعظم نے گانٹھ کھولنے میں سر کھپانے کے بجائے اسے تلوار سے کاٹ‌ڈالا۔ صفحہ ۱۱۹

۳۹ - ''لوئی بوناپارٹ کی اٹھارویں برومیئر،،— فرانس میں ۱۸۴۸ء سے ۱۸۵۱ء تک جو انقلابی واقعات پیش آئے ان کے ٹھوس تجزیے میں مارکس کی یہ تصنیف خود مارکسی تحریروں میں بڑی اھمیت کی مالک ھے۔ یہاں مارکس نے تاریخی مادیت کے تمام اصل اصول، یعنی طبقاتی جدوجہد اور پرولتاری انقلاب، ریاست اور پرولتاری ڈکٹیٹری کا نظریہ زیادہ کھول کر بیان کئے ھیں۔ پرولتاریہ کو بورژوا ریاست کے ساتھ کیسے پیش آنا چاھئے اس بحث کا مارکس نے جو نتیجہ نکال کر دکھایا ھے، وہ بے‌مثال اھمیت رکھتا ھے۔ مارکس کا کہنا ھے کہ ''تمام انقلابات اس مشین کو توڑنے کے بجائے اسے اور پکا کر دیتے تھے،،۔ مارکس کے ثابت کئے ھوئے اس نتیجے کو لینن نے کہا ھے کہ یہ ریاست کے بارے میں مارکسی تعلیمات کا ایک نہایت بنیادی اور اھم نکتہ ھے۔

''لوئی بوناپارٹ کی آٹھارویں برومیئر،، میں مارکس نے اسی سوال کا تجزیہ جاری رکھا ھے کہ جب انقلاب نزدیک ھو تو کسان کو مزدور طبقے کے دوش بدوش چلنا ھوگا، سماج کی زندگی میں سیاسی پارٹیوں کا مصرف بتایا ھے اور بوناپارٹزم کی اصل حقیقت کھول کر رکھ دیا ھے۔ صفحہ ۱۵۰

۴۰ - دوسری دسمبر ۱۸۵۱ء کو فرانس میں مخالفین انقلاب لوئی بوناپارٹ اور اس کے حواری حکومت کا تختہ الٹنے میں کامیاب ھوگئے۔ صفحہ ۱۵۰

۴۱ - Renaissance (ریناساں، یا نشاۃ ثانیہ)— مغربی اور وسطی یورپ کے کئی ملکوں میں تہذیبی اور نظریاتی ترقیوں کا زمانہ جو سرمایہ‌داری تعلقات رونما ھونے کا نتیجہ تھا۔ یہ زمانہ ۱۵ ویں صدی کے نصف آخر اور ۱۶ ویں صدی میں

پھیلا ہوا ہے۔ اس زمانے کی خصوصیت یہ ہے کہ علوم و فنون میں جان پڑ گئی، یونان قدیم اور رومۃ الکبری کی تہذیت کا ذوق و شوق پھر بیدار ہوا (اسی ازسرنو زندگی سے اس دور کا یہ نام پڑا)۔ اس دور کی خصوصیات کا مطالعہ کرنے کے لئے اینگلس کی تصنیف ''فطرت کی جدلیات،، پڑھنا چاہئے۔ (منتخب تصانیف، جلد دوم۔) صفحہ ۱۰۱

۴۲ - فرانس میں دوسری ریپبلک ۱۸۴۸ء سے ۱۸۵۲ء تک قائم رہی۔ مارکس نے اس دور کا تفصیلی بیان اپنی دو تصنیفوں میں دیا ہے ـــ ایک ''فرانس میں طبقاتی جدوجہد ۱۸۴۸ء سے ۱۸۵۰ء،،، دوسری ''لوئی بوناپارٹ کی اٹھارویں بروميئر،،۔ صفحہ ۱۰۲

۴۳ - Montagne (مونٹین) پارٹی ۱۷۹۳ء سے ۱۷۹۵ء تک ـــ اٹھارویں صدی کے آخری برسوں میں جب فرانسیسی بورژوازی نے انقلاب کیا ہے، اس وقت نیشنل کنونشن میں یہ ایک انقلابی جمہوریت پسندوں کا گروپ تھا۔ یہ نام اس لئے پڑا کہ وہ اجلاس کے وقت کنونشن کے ہال میں سب سے اوپر کی کرسیوں پر بیٹھا کرتے تھے۔ صفحہ ۱۰۳

۴۴ - لفظ بروميئر کا مطلب ہے فرانس کے ریپبلکن کیلنڈر کا ایک مہینہ۔ اٹھارویں بروميئر یعنی ۹ نومبر ۱۷۹۹ء کا وہ دن جب نپولین بوناپارٹ نے حکومت کا تختہ الٹا اور بعد میں فوجی ڈکٹیٹری قائم کی۔ ''اٹھارویں بروميئر کا دوسرا ایڈیشن،، کہنے سے مارکس کا اشارہ ہے دوسری دسمبر ۱۸۵۱ء کے انقلاب حکومت کی طرف۔ صفحہ ۱۰۳

۴۵ - مطلب ہے سترھویں صدی میں انگلینڈ کا بورژوائی انقلاب۔ صفحہ ۱۰۵

۴۶ - عہدنامہ عتیق (اولڈ ٹسٹامنٹ) ـــ موجودہ انجیل کا وہ بڑا حصہ جس میں پیغمبروں اور قوانین کی کتب شامل ہیں یال

ہے کہ لوگوں کی ذھانت نے مختلف زبانوں میں جو دینی اور دنیاوی عقائد کو فنی حسن عطا کیا ہوگا، بعد میں پادریوں نے اسی کو مانجھ کر حکمراں طبقوں کی خاطر مخصوص لفظوں میں مرتب کردیا۔ صفحہ ۱۰۵

۴۷ - بیڈلم — لندن کا مشہور پاگل خانہ۔ صفحہ ۱۰۶

۴۸ - ۱۰ دسمبر ۱۸۴۸ء کو عام رائے شماری کے ذریعے لوئی بوناپارٹ کو فرانسیسی ریپبلک کا صدر چنا گیا۔ صفحہ ۱۰۷

۴۹ - ''مصری سالن کو پچھتانا،، — یہ محاورہ انجیل کی داستانوں سے چلا آرہا ہے۔ انجیل میں بیان ہوا ہے کہ جب بنی اسرائیل کو مصر سے نکلنا پڑا تو سفر کی مصیبتوں سے تنگ آکر بعض کم حوصلہ لوگ فریاد کرنے لگے اور انھیں پھر وھی قید کا زمانہ یاد آنے لگا جب پیٹ بھرنے کو سالن روٹی بےفکری سے مل جاتی تھی۔ صفحہ ۱۰۷

۵۰ - «Hic Rhodus, hic salta!» (یہ رھا روڈس، اب لگاؤ چھلانگ) — یہ فقرہ یونان قدیم کے داستان گو ایزوپ کی کہانیوں سے چل پڑا ہے۔ کہانی میں آیا ہے کہ ایک شیخی خورا ھمیشہ گواہ پیش کرکے یہ ثابت کیا کرتا تھا کہ وہ ایک دفعہ روڈس جزیرے پر زبردست چھلانگ لگا چکا ہے۔ اس کو جواب دیا گیا کہ گواہ لانے کی ضرورت ھی کیا ہے — ''یہ رھا روڈس، اب لگاؤ چھلانگ،،۔ مطلب یہ کہ ''ھاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے!،، صفحہ ۱۰۹

۵۱ - فرانسیسی آئین ۱۸۴۸ء کی رو سے ریپبلک کے صدر کا انتخاب ھر چوتھے سال مئی کے دوسرے اتوار کو ھونا چاھئے۔ مئی ۱۸۵۲ء میں لوئی بوناپارٹ کی میعاد صدارت ختم ھونےوالی تھی۔ صفحہ ۱۰۹

۵۲ - ''خلیاست،، (لفظ خلیاس سے مشتق ہے، معنی ایک ھزار) — ایک مذھبی فرقہ جس کا عقیدہ تھا کہ یسوع مسیح پھر

نمودار ہوں گے اور دنیا میں انصاف، مساوات اور شادمانی کا ہزار سالہ دوردورہ ہو جائے گا۔ صفحہ ۱۵۹

۵۳ - In partibus infidelium (لفظی مفہوم ہے ''دیارکفر میں،،) — یہ خطاب ان کیتھولک پادریوں کے نام کے ساتھ جوڑا جاتا تھا جو غیرمسیحی ملکوں میں محض برائے نام تبلیغی خدمت پر مقرر کئے جائیں۔ مارکس اور اینگلس کی تحریروں میں یہ اصطلاحی لفظ ایسی حکومتوں کے لئے استعمال ہوا ہے جو اپنے ملک سے باہر پناہ گزینی کی حالت میں قائم ہوں اور جنھیں اندرون ملک کے حالات سے کوئی سروکار نہ ہو۔ صفحہ ۱۶۰

۵۴ - کیپٹول (Capitol) — روم کی پہاڑیوں میں سے ایک پر وہ قلعہ جس کے اندر مشتری کی عبادت‌گاہ یا مندر تھا۔ کہتے ہیں کہ ۳۹۰ قبل مسیح میں جب گیلیوں نے شبخون مارا تو روم والے صرف اس لئے محفوظ رہے کہ وہیں جونو کی عبادت گاہ پر بطخوں کی کٹکٹاہٹ سے کیپٹول کے پہرہ‌دار جاگ اٹھے اور خبردار ہوگئے۔ صفحہ ۱۶۰

۵۵ - ''افریقی،، یا ''الجیریائی،، کے نام سے وہ فرانسیسی جنرل اور افسر مراد ہوتے ہیں جنھوں نے اپنی آزادی کی خاطر لڑنے‌والے الجیریائی (الجزائری) قبیلوں پر یورش کرکے غاصبانہ جنگوں میں نام پیدا کیا ہو۔ قانون‌ساز اسمبلی میں یہ افریقی جنرل کوےنیاک، لموری‌سیئر اور بیدو رپبلکنوں کے سربراہ تھے۔ صفحہ ۱۶۰

۵۶ - سوروثی خاندانی اپوزیشن — جولائی کی بادشاہت کے دنوں میں فرانس کی پارلیمنٹ میں اس نام کا ایک حزب مخالف تھا۔ اس گروہ کے نمائندے آزاد خیال صنعتی اور کاروباری بورژوازی کی ترجمانی کرتے ہوئے اس بات کے حق میں تھے کہ اوسط درجے کی کچھ انتخابی اصلاحیں کرکے انقلاب

کی روک تھام کی جائے اور اس طرح سے اورلین شاہی خاندان کا اقتدار بنا رہے ۔ اس حزب مخالف کا سربراہ اودی لوں بارو تھا ۔ صفحہ ۱۶۱

۵۷ - جولائی کی بادشاہت — یہ لوئی فلپ کی بادشاہت کا زمانہ ہے جو ۱۸۳۰ء سے ۱۸۴۸ء تک چلتا رہا ۔ جولائی ۱۸۳۰ء کے انقلاب سے اس کا نام پڑ گیا تھا ۔ صفحہ ۱۶۲

۵۸ - ۱۵ مئی ۱۸۴۸ء کو پیرس کے مزدوروں اور کاریگروں نے ایک عام مظاہرہ کیا اور جس ہال میں آئین ساز اسمبلی کا اجلاس ہو رہا تھا، وہاں زبردستی گھس کر اسمبلی کے توڑنے اور ایک انقلابی حکومت قائم کئے جانے کا اعلان کردیا ۔ نیشنل گارڈ اور فوج نے اسمبلی کے بچاؤ کے لئے حملہ کیا اور مظاہرین کے ہجوم کو تتربتر کردیا ۔ مزدوروں کے لیڈر (بلانکی، باربیس، البیر، رسپیل، سوبریو وغیرہ) گرفتار کرلئے گئے ۔ صفحہ ۱۶۳

۵۹ - گشتی گارڈ کو عارضی حکومت نے ۲۵ فروری ۱۸۴۸ء کو ایک فرمان کی رو سے قائم کیا تھا تاکہ جو عام لوگ انقلابی جوش وخروش میں ڈوبے ہوئے ہیں ان کا توڑ کیا جائے ۔ آوارہ گرد اور فالتو قسم کے آدمیوں (lumpenproletariat) کی صف بندی سے بنایا ہوا یہ گشتی گارڈ جون کی عام شورش دبانے میں کام آیا ۔ صفحہ ۱۶۳

۶۰ - روسی مورخ یوسی بیس کیساریسکی کا بیان ہے کہ شہنشاہ قسطنطین اول نے ۳۱۲ء میں، جب اسے اپنے مخالف میکسین تیس پر فتح ہونے والی تھی، آسمان پر ایک غیبی صلیب کا نشان دیکھا جس پر لکھا تھا ''اس صلیب کے سائے میں فتح پاؤگے،، ۔ صفحہ ۱۶۶

۶۱ - «Le National» (''نیشنل،،) — فرانسیسی روزنامہ جو پیرس میں ۱۸۳۰ء سے ۱۸۵۱ء تک نکلتا رہا ۔ یہ اعتدال پسند بورژوا ریپبلکنوں کا ترجمان تھا ۔ عارضی حکومت میں اس

رجحان کے جو نمایاں لوگ شامل ہوئے، ان میں مراست، بستید اور گارنئے پاژیس خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ صفحہ ۱٦٧

٦٢ - «Journal des Débats politiques et littéraires» (''سیاسی اور ادبی بحثوں کا اخبار،،) — فرانسیسی زبان میں بورژوازی کا روزنامہ، جس کی شروعات ۱۷۸۹ء میں پیرس سے ہوئی تھی۔ جولائی کی بادشاہت کے دنوں میں وہ اورلین‌والوں کا ترجمان سرکاری اخبار بن گیا۔ جب ۱۸۴۸ء کا انقلاب ہوا تو یہ اخبار انقلاب کی مخالف بورژوازی یعنی ضابطہ پارٹی کی زبان بولنے لگا۔ صفحہ ۱٦٧

٦٣ - ویانا کے صلح نامے — مصنف کا اشارہ ہے ۱۸۱۵ء کے ان صلح ناموں کی طرف جن پر ویانا شہر میں مئی جون کے مہینے میں دستخط ہوئے اور ان ملکوں نے شرکت کی جو نپولین بوناپارٹ کی جنگوں کی لپیٹ میں آئے تھے۔ ۱۸۱۴ء — ۱۸۱۵ء کی ویانا کانگرس کے فیصلے کے مطابق فرانس کو ۱۷۹۲ء کی سرحدوں میں بحال کر دیا گیا اور دوسری ریاستوں کی کڑی نگرانی لگا دی گئی۔ اس پر یہ پابندی بھی عائد کی گئی کہ یورپ کے کسی علاقے کو وہ اپنی سرحدوں میں نہیں ملا سکتا۔ صفحہ ۱٦٨

٦٤ - آئینی چارٹر — فرانس میں ۱۸۳۰ء کے بورژوا انقلاب کے بعد یہ چارٹر منظور کیا گیا اور جولائی کی بادشاہت نے اسے ایک بنیادی قانون کی حیثیت سے پیش نظر رکھا۔ ظاہرا اس چارٹر نے قوم کا اقتدار اعلا تسلیم کیا اور بادشاہ کے اختیارات پر کچھ پابندیاں مان لی تھیں۔ صفحہ ۱۷۰

٦٥ - یلی‌سےئی کے سبزہ زار (جو فرانسیسی میں Champs Elysées کہلاتے ہیں)، پیرس کی وہ شاہراہ جس پر یلی‌سےئی کا محل واقع ہے اور ۱۸۴۸ء کے آئین کی رو سے فرانسیسی ریپبلک

کے صدر کی سرکاری قیام‌گاہ مقرر تھی۔ یہاں اس موقع پر مارکس نے لفظ یلی‌سےئی کی تہہ میں ایک طنزیہ اشارہ کیا ہے کہ وہ پیرس میں صدر کا محل بھی ہے اور پرانی داستانوں میں اسی نام کا ایک جنت کا قصر بھی۔ صفحہ ۱۷۳

۶۶ - کلیشی — پیرس میں نادہند قرضداروں کی جیل جو ۱۸۲۶ء سے ۱۸۶۷ء تک قائم رہی۔ صفحہ ۱۷۴

۶۷ - فرانس کی ریپبلک قائم ہونے کے فوراً بعد یہ سوال اٹھا کہ قومی جھنڈا کیسا ہونا چاہئے۔ پیرس کے انقلابی مزدوروں نے مطالبہ کیا کہ جون ۱۸۳۲ء کی مسلح بغاوت کے وقت شہر کے مضافات میں مزدوروں نے جو لال جھنڈا اٹھایا تھا وہی قومی جھنڈا مقرر کیا جائے۔ بورژوازی کے نمائندوں نے چاہا کہ ترنگا جھنڈا اپنایا جائے جس میں نیلے، سفید اور لال رنگ کی پٹی ہو کیوں‌کہ ۱۸ ویں صدی کے ختم پر بورژوا انقلاب کے وقت اور نپولین اول کے عروج کے دنوں میں وہی فرانس کا قومی نشان تھا۔ ان بورژوا ریپبلکنوں کا پرچم بھی ایسا ہی ترنگا تھا جو ۱۸۴۸ء کے انقلاب سے پہلے تک ''Le National'' اخبار کے حامی تھے۔ مزدور نمائندوں کو مجبوراً ترنگے قومی جھنڈے پر راضی ہونا پڑا، البتہ علم یا چھڑ کے ساتھ ایک لال پھندنا بھی نتھی کردیا گیا۔ صفحہ ۱۷۶

۶۸ - پری‌ٹورین — روم قدیم میں سپہ سالار یا بادشاہ سلامت کے محافظ خاص پری‌ٹورین کہلاتے تھے۔ انہیں کچھ خصوصی اختیارات بھی حاصل تھے۔ اندرونی ہنگاموں میں بھی ان لوگوں کا بڑا ہاتھ رہتا تھا اور بارہا ایسا ہوا کہ اپنے جی حضوریوں کو تخت پر بٹھا دیا کرتے تھے۔ یہاں مارکس نے اس پرانے لفظ سے ''۱۰ دسمبری سوسائٹی'' والوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ صفحہ ۱۷۷

٦٩ - مئی ١٨٤٩ء سے جولائی تک کے اس زمانے کا ذکر ہے جب نیپلز کی سلطنت نے آسٹریا سے مل کر روم کی رپبلک کے علاقے میں فوج بڑھائی۔ صفحہ ١٧٧

٧٠ - مارکس نے یہاں لوئی بوناپارٹ کی زندگی کے چند واقعات گنائے ہیں: ١٨٣٢ء میں اس نے تورگاؤ علاقے میں سوئٹزرلینڈ کی شہریت اختیار کی۔ ١٨٤٨ء میں جب وہ برطانیہ میں مقیم تھا، اپنی خدمات ''اسپیشل کانسٹبلری،، کے لئے پیش کر دیں (برطانیہ میں رواج ہے کہ شہریوں میں سے کچھ لوگوں کی رضاکارانہ پولیس ریزرو بنائی جاتی ہے)۔ صفحہ ١٧٨

٧١ - اورلین والے — یعنی اورلین گھرانے کے حمایتی۔ اورلین — بوربون شاہی خاندان کی ایک نوجوان شاخ تھی۔ ١٨٣٠ء کے انقلاب نے اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں دے دیا تھا اور ١٨٤٨ء کے انقلاب نے وہ چھین لیا۔ یہ لوگ مالیاتی شرفا (بڑے پیمانے پر روپیے کا کاروبار کرنے والے) اور اوپر کی بورژوازی کے جاں نثار تھے۔ صفحہ ١٧٩

٧٢ - ضابطہ پارٹی — قدامت پسندانہ خیالات والی اوپر کی بورژوازی نے یہ پارٹی ١٨٤٨ء میں بنائی تھی۔ اس میں فرانس کی دو خاندانی بادشاہتوں کے طرفدار گروہ ملے ہوئے تھے — ایک جائزوارث (Legitimist) اور دوسرے اورلین والے۔ ١٨٤٩ء سے دوسری دسمبر ١٨٥١ء تک (جب لوئی بوناپارٹ نے اندر سے حکوست کا تختہ الٹا) فرانس کی دوسری رپبلک کی قانون‌ساز اسمبلی میں اس پارٹی کا بول بالا تھا۔ صفحہ ١٧٩

٧٣ - کلی گولا — روم کا شہنشاہ (سنہ ٣٧ سے ٤١ تک) جسے پری‌ٹورین گارڈ نے تخت پر بٹھایا تھا۔ صفحہ ١٨٢

٧٤ - اپریل ١٨٤٩ء میں فرانسیسی حکوست نے آئین‌ساز اسمبلی سے یہ منظوری حاصل کرلی کہ اٹلی میں فوجی سہم بھیجنے

کے لئے مسلح کی جائے۔ فوجی مہم بھیجنے کا عذر یہ پیش کیا گیا تھا کہ آسٹریا کے مقابلے پر پیے‌مونٹ کی حمایت اور رپبلک آف روم کی حفاظت کرنی ہے۔ اندرونی غرض یہ تھی کہ رپبلک کے علاقے میں فوجی چڑھائی کرکے پاپائے روم کا اقتدار بحال کر دیا جائے۔ صفحہ ۱۸۳

۷۵ - «Le Moniteur universel» (اخبار عام) — فرانسیسی روزنامہ، حکومت کا سرکاری ترجمان، پیرس میں ۱۷۸۹ء سے ۱۹۰۱ء تک نکلتا رہا۔ سرکاری احکام، پارلیمنٹ کی کارروائی اور مختلف سرکاری اعلان وغیرہ اسی اخبار میں شائع ہوا کرتے تھے۔ صفحہ ۱۸۳

۷۶ - کوئسٹر (Quaestor) — قانون‌ساز اسمبلی کا ''کوئسٹر،، ان ممبروں کو کہا جاتا تھا جنھیں اسمبلی کی طرف سے معاشی اور مالی معاملات کی دیکھ بھال اور اسمبلی کی سلامتی کا خیال رکھنے کی ذمہ‌داری سپرد ہو (روم قدیم میں لفظ کوئسٹر کی مناسبت سے یہ نام پڑا تھا)۔ یہاں مارکس نے اس واقعے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ۶ نومبر ۱۸۵۱ء کو شاہی کے طرفدار کوئسٹر نے ایک مسودہ قانون پیش کیا جس کی غرض یہ تھی کہ قومی اسمبلی کے صدر کو فوج طلب کرنے کا اختیار دیا جائے۔ پیش کرنے‌والوں میں لےفلو، باز اور پنا کے نام تھے۔ گرما گرم بحث کے بعد یہ مسودہ قانون ۱۷ نومبر کو رد کر دیا گیا۔ صفحہ ۱۸۴

۷۷ - آئین‌پسند (Constitutionalists) — آئینی بادشاہت کے حامی، بادشاہ سے نزدیکی تعلق رکھنے‌والی اوپر کی بورژوازی کے نمائندے جو آزاد خیال شرفا کی طرف سے بولتے تھے۔

ژیروندیست — ۱۸ ویں صدی کے آخر میں فرانس کے بورژوا انقلاب کے وقت یہ ایک بورژوا سیاسی گروپ تھا،

اعتدال پسندوں کے مفاد کا خیال رکھنے والا، انقلابی اور انقلاب کی مخالف طاقتوں کے درمیان ڈانواڈول۔ اس گروپ نے شاہ پرستوں سے سمجھوتہ کرلیا۔ اس گروپ کا یہ نام پڑا ژیروندی حلقے کی وجہ سے کیوں کہ جو لوگ اس حلقے سے چن کر قانون ساز اسمبلی میں اور قومی کنونشن میں آتے تھے، زیادہ تر وہی اس گروپ کے لیڈر تھے۔

جیکوبی (Jacobins) — ۱۸ ویں صدی کے آخر میں بورژوا انقلاب کے وقت بائیں بازو کا بورژوا سیاسی گروپ۔ یہ اپنے فیصلوں میں پختہ تھے اور بےباکی سے یہ آواز بلند کرتے تھے کہ فرانس سے جاگیرداری کا خاتمہ اور مطلق العنانی کا صفایا کر دینا چاہئے۔ صفحہ ۱۸۴

۷۸ - ۱۶ اپریل ۱۸۴۸ء وہ تاریخ ہے جب پیرس کے مزدوروں نے ایک پرامن جلوس نکال کر عارضی حکومت کے سامنے اپنی یہ مانگ پیش کرنی چاہی کہ ''مزدوروں کو تنظیم کا حق،، ہو اور ''آدمی کے ہاتھوں آدمی کا استحصال بند کیا جائے،،۔ اس جلوس کو بورژوائی نیشنل گارڈ نے جو خاص اسی غرض سے بنایا گیا تھا، منتشر کر دیا۔ صفحہ ۱۸۵

۷۹ - فروندے کی تحریک — فرانسیسی شرفا اور بورژوازی میں پھیلی ہوئی ایک تحریک مطلق العنان بادشاہی کے خلاف۔ یہ تحریک ۱۶۴۸ء سے ۱۶۵۳ء تک تیز رہی۔ اشرافیہ میں اس تحریک کے لیڈروں کو اپنے حواریوں اور غیر ملکی فوجیوں پر تکیہ تھا۔ اس زمانے میں جو کسان بغاوتیں ہوئیں اور شہروں میں جمہوری تحریکوں نے زور باندھا، انھیں بھی اس تحریک کے لیڈروں نے اپنی غرض کے لئے استعمال کیا۔ صفحہ ۱۸۶

۸۰ - فریگین ٹوپی — زمانہ قدیم کے فریگیوں کی لال ٹوپی۔ جیکوبی والوں نے (اوپر دیکھئے نوٹ نمبر ۷۷) اسی کو اپنے

ہیٹ کے لئے نمونہ بنایا اور بورژوا انقلاب فرانس کے بعد سے یہ ٹوپی آزادی کی علامت شمار ہونے لگی۔ صفحہ ۱۸۷

۸۱ - نیلوفر — بوربون شاہی خاندان کا اپنا اعلانی نشان۔ صفحہ ۱۹۰

۸۲ - ٹوری — انگلینڈ کی سیاسی پارٹی ۱۷ ویں صدی کے آخر میں بنی، بڑے بڑے جاگیرداروں اور اوپر کے کلیسائی رہنماؤں کے حقوق کی حمایتی، جسے پرانے زمانے کی جاگیردارانہ قدریں عزیز تھیں۔ یہ پارٹی آزادخیال اور ترقی‌پسند مطالبوں کے خلاف آواز بلند کرتی رہی اور ۱۹ ویں صدی کے وسط میں اسی پارٹی کی بنیاد پر انگلینڈ کی کنزروٹیو پارٹی قائم ہوئی۔ صفحہ ۱۹۲

۸۳ - شہر ایمس — مغربی جرمنی کا وہ شہر جہاں گراف شمبور کا مستقل صدر مقام بن گیا۔ یہ شخص فرانسیسی تخت کا دعویدار اور بوربون شاہی خاندان کی ایک شاخ کا چشم و چراغ تھا اور خود کو ہنری پنجم کہا کرتا تھا۔
کلیرمونت — لندن کے نزدیک ایک محل، جہاں فرانس کے بادشاہ لوئی فلپ نے انقلاب فروری ۱۸۴۸ء سے بھاگ کر قیام کیا۔ صفحہ ۱۹۲

۸۴ - یری‌ہون — انجیل کی داستان کے مطابق کہا جاتا ہے کہ یہ پہلا شہر تھا جو بنی اسرائیل نے فلسطین میں داخل ہونے کے بعد قبضایا۔ محاصرہ کرنےوالوں نے اس زور زور سے نقارے بجائے کہ شہر کی دیواریں گر گئیں۔ صفحہ ۱۹۸

۸۵ - یہاں مصنف کا اشارہ لوئی بوناپارٹ کے منصوبوں کی طرف ہے، جسے امید تھی کہ اسقف اعظم پوپ نہم کے ہاتھوں فرانس کی بادشاہت کا تاج پہنےگا۔ انجیل سے روایت ہے کہ بنی اسرائیل کے بادشاہ حضرت داؤد کو پیغمبر سیموئیل نے تاج پہنایا تھا۔ صفحہ ۲۰۳

۸۶ - ۲ دسمبر ۱۸۰۵ء کو سوراویہ علاقے کے مقام آسٹرلٹز پر گھمسان کی لڑائی ہوئی تھی جس میں نپولین اول نے روس اور آسٹریا کی فوج کو شکست دی تھی۔ صفحہ ۲۰۳

۸۷ -. یہاں مطلب ہے جولائی ۱۸۳۰ء کے انقلاب سے۔ صفحہ ۲۰۳

۸۸ - اشارہ ہے لوئی بوناپارٹ کی کتاب ”نپولینی نکات،، (”Des idées napoléonniennes،،) کی طرف۔ صفحہ ۲۱۰

۸۹ - بورگ گراف (چودھری یا پٹیل) کے نام سے وہ سترہ آدمی مراد ہیں جو اورلین والوں اور جائزوارث والوں میں پیش پیش تھے۔ قانون ساز اسمبلی نے انتخابی قانون کا خاکہ تیار کرنے کے لئے جو کمیٹی بٹھائی تھی، یہ لوگ اس کے ممبر تھے اور خواہ مخواہ اختیارات کے دعویدار بن بیٹھے تھے، رجعت پرستانہ نیت رکھتے تھے۔ وکٹر ہیوگو کے مشہور تاریخی ڈرامے سے بورگ گراف کا نام لیا گیا جس میں وسطی دور کے جرمنی کے قلعہ داروں (بورگ، یعنی فصیل بند قلعہ یا گڑھی) کی تصویر کھینچی گئی ہے جنھیں بادشاہ کی طرف سے یہ منصب ملا کرتا تھا۔ صفحہ ۲۱۶

۹۰ - پریس کا نیا قانون اخبار جو ۱۸۵۰ء کے جولائی میں قانون ساز اسمبلی نے پاس کیا، اس کی رو سے اخبار شائع کرنے والوں کو زیادہ زر ضمانت رکھنا پڑتا۔ اخبار اور پمفلٹ نکالنے کے لئے اسٹامپ لکھ کر دینا پڑتا تھا۔ صفحہ ۲۱۸

۹۱ - «La Presse» — پیرس میں اس نام کا اخبار ۱۸۳۶ء سے نکلنا شروع ہوا۔ جولائی کی بادشاہت کے زمانے میں وہ حزب مخالف کے ہاتھوں میں رہا، ۴۹ — ۱۸۴۸ء میں بورژوائی ریپبلکنوں کا ترجمان بن گیا اور بعد میں بوناپارٹ کی طرف سے لکھنے لگا۔ صفحہ ۲۱۸

۹۲ - Lazzaroni (سوالی) — اٹلی میں اپنے طبقوں سے کٹے ہوئے آوارہ گرد متفرق لوگوں کا یہ نام پڑ گیا تھا۔ خاندانی

بادشاھی کے حامی رجعت‌پرستوں نے ان لوگوں کو باربار اپنی طرف ملایا اور آزاد خیال جمہوریت پسندوں کے خلاف استعمال کیا۔ صفحه ۲۲۳

۹۳ - یہاں لوئی بوناپارٹ کی زندگی کے دو اھم واقعات کی طرف اشارہ ھے: ۳۰ اکتوبر ۱۸۳۶ء کو اس نے توپ‌خانے کی دو رجمنٹوں کو ملاکر استراسبورگ میں شورش اٹھانی چاھی لیکن شورش پسندوں سے ھتھیار رکھوا لئے گئے اور لوئی کو گرفتار کرکے امریکه جلاوطن کر دیا گیا۔ ۶ اگست ۱۸۴۰ء کو اس نے پھر ایک قدم اٹھایا که بولون کی چھاونی کے فوجیوں میں بغاوت اٹھ کھڑی ھو، اس میں بھی ناکامی ھوئی۔ اسے عمر قید کی سزا سنائی گئی لیکن وہ ۱۸۴۶ء میں انگلینڈ کو فرار ھو گیا۔ صفحه ۲۲۴

۹۴ - اس موقع پر مارکس کا مطلب ھے ان اخباروں سے جو بوناپارٹ کے حامی بن گئے تھے۔ لوئی بوناپارٹ صدر کے سرکاری محل یلی‌سےئی میں رھتا تھا، وھیں سے یه لفظ لیا گیا ھے۔ صفحه ۲۲۷

۹۵ - جرمن شاعر شیلر کی نظم «Lied an die Freude» (شادمانی کی شان میں) سے ایک مصرعه لےکر مارکس نے اسے دو معنی استعمال کیا ھے۔ نظم میں شاعر نے شادمانی کو ایلی‌زیم کی بیٹی کہا ھے۔ قدیم مذھبی داستانوں میں ایلی‌زیم یلے‌سےئی اور دونوں کے معنی ھیں فردوس بریں۔ پیرس میں صدر کے سرکاری محل والے علاقے کا بھی یہی نام تھا۔ صفحه ۲۳۴

۹۶ - ۱۷۸۹ء کے بورژوا انقلاب کے وقت تک فرانس میں پارلیمنٹوں کا مقام ملک کی سب سے اونچی عدالت کا تھا جہاں شاھی احکام پر مہر لگتی تھی اور انھیں یه حق بھی حاصل تھا که ایسے فرمانوں کی تصدیق سے انکار کر دیں جن

سے ملک کے رسم و رواج اور قانون سازی کی خلاف ورزی ہوتی ہو۔ صفحہ ۲۴۰

۹۷ - بیل ایل — خلیج بسکئے میں ایک جزیرہ تھا جہاں سیاسی قیدیوں کو کالے پانی کی سزا کاٹنی پڑتی تھی۔ صفحہ ۲۴۴

۹۸ - مارکس نے دوسری تیسری صدی عیسوی کے قدیم یونانی مصنف اتھینایوس کی کہانی سے فائدہ اٹھایا ہے۔ اس مصنف نے اپنی کتاب ''دسترخوان کے فلسفی'' «Deipnosophistas» میں بیان کیا ہے کہ مصر کے فرعون طاحونس نے اسپارتا ک بادشاہ اگی‌سلائی کے پستہ‌قاست ہونے پر (جو اپنی فوج لے کر فرعون کی کمک پر آیا تھا) ایک پھبتی کسی ''پہاڑ کو حمل ٹھیرا ہوا تھا۔ زیوس دیوتا دیکھ کر ڈر گئے۔ مگر پہاڑ میں سے نکلا چوہا،،۔ اس پھبتی پر اگی‌سلائی نے جواب دیا ''ابھی تو میں تمھیں چوہا نظر آتا ہوں۔ وقت آئے گا کہ میں شیر دکھائی دوں گا۔ ،، صفحہ ۲۴۶

۹۹ - «L'Assemblée nationale» (''قومی اسمبلی،،) — فرانسیسی روزنامہ، خاندانی بادشاہت کے حامیوں اور جانزوارث والوں کا طرفدار۔ یہ اخبار ۱۸۴۸ء سے ۱۸۵۷ء تک نکلتا رہا۔ ۱۸۴۸ء اور ۱۸۵۱ء کے درمیان اس نے اورلین اور جانزوارث‌والوں کے دونوں دعویدار گروہوں کو ملانے کی آواز بلند کی۔ صفحہ ۲۵۰

۱۰۰ - جانزوارث والوں کی طرف سے فرانسیسی تخت و تاج کے دعویدار گراف شمبور نے ۱۸۵۰ء کے بعد کے چند سال وینس میں رہ کر گزارے۔ صفحہ ۲۵۱

۱۰۱ - ۱۸۱۴ء سے ۱۸۳۰ء کی بادشاہی بحالی کے دور میں جانزوارث والی پارٹی میں اس بات پر اختلاف رہا کہ کیا سیاسی ترکیبیں اختیار کی جائیں۔ لڈوگ ہژدہم ۱۸ کے حامی ویلیل کا خیال تھا کہ رجعت پرستانہ قدم اٹھانے میں

نہایت احتیاط سے کام لیا جائے لیکن پولی‌نیاک کا کہنا تھا کہ انقلاب سے پہلے کا سرکاری بندوبست جوں‌کاتوں پھر قائم کر دیا جائے (یہ شخص گراف دی‌آرتور کا طرفدار تھا جو ۱۸۲۴ء سے شاہ چارلس دہم کہلایا)۔

پیرس میں تویلری محل وہ ہے جہاں لڈوگ ہژدہم ۱۸ رہا کرتا تھا اور جب گراف دی آرتور کا تاج و تخت بحال ہوا تو وہ اس محل کے ایک حصے مرسان پویلین میں رہنے لگا۔ صفحہ ۲۵۳

۱۰۲ - «The Econmist» (ماہر معاشیات) انگلینڈ کا مشہور ہفتہ‌وار سیاسی اور اقتصادی رسالہ، اوپر کی صنعتی بورژوازی کا ترجمان، جو ۱۸۴۳ء سے برابر شائع ہو رہا ہے۔ صفحہ ۲۵۷

۱۰۳ - لندن کی صنعتی نمائش — مئی ۱۸۵۱ء سے اکتوبر تک انٹرنیشنل تجارت اور صنعت کی یہ پہلی نمائش لندن میں ہوئی تھی۔ صفحہ ۲۶۳

۱۰۴ - «Le Messager de l'Assemblée» پیرس سے شائع ہونےوالا روزنامہ جو لوئی بوناپارٹ کا مخالف تھا۔ یہ روزنامہ ۱۶ فروری سے ۲ دسمبر ۱۸۵۱ء تک چلا۔ صفحہ ۲٦۷

۱۰۵ - لمبی پارلیمنٹ جو ۱۶۴۰ء سے ۱٦۵۳ء تک قائم رہی۔ انگلینڈ میں بورژوا انقلاب شروع ہوتے وقت چارلس اول نے یہ پارلیمنٹ طلب کی تھی جو اس انقلاب کا قانون‌ساز ادارہ بن گئی۔ ۱٦۴۹ء میں اسی پارلیمنٹ نے چارلس اول کو سزائے موت کا حکم سنایا اور انگلینڈ کو ریپبلک قرار دے دیا۔ ۱٦۵۳ء میں کرومویل نے یہ پارلیمنٹ توڑ دی۔ صفحہ ۲۷۲

۱۰٦ - Cévennes (سیوینے) — یہ فرانس کے صوبہ لانگےدوک کا پہاڑی علاقہ ہے جہاں ۱۷۰۲ء سے ۱۷۰۵ء تک کسانوں کی بغاوت چلتی رہی۔ پروٹسٹنٹ فرقے پر مظالم کی مخالفت

سے یہ شورش اٹھی تھی، بعد میں جاگیرداری نظام کے خلاف کھلی بغاوت بن گئی۔
مارکس نے فرانس کے مغربی صوبے ''واندیئے،، کا حوالہ اس سلسلے میں دیا ہے کہ فرانسیسی شاہ‌پرستوں نے ۱۷۹۳ء میں یہاں کسانوں کو بھڑکا کر انقلاب فرانس کے خلاف شورش کھڑی کر دی۔ صفحہ ۲۸۴

۱۰۷ - نیشنل کنونشن — ۱۸ ویں صدی کے آخر میں بورژوا انقلاب کے زمانے میں فرانس کا سب سے اعلا نمائندہ ادارہ جو ستمبر ۱۷۹۲ء سے اکتوبر ۱۷۹۵ء تک قائم رہا۔ انقلاب کے ساتھ ساتھ نیشنل کنونشن کا قدم بھی آگے بڑھتا رہا۔ فرانسیسی بورژوازی کی کوشش تھی کہ انقلاب سے جو فیض پہنچ سکتا ہے اسے مستقل کر دیا جائے اور ملک سے جاگیردارانہ سماجی نظام کا صفایا ہو جائے۔ کنونشن کے فیصلوں سے اسی کی تائید ہوتی رہی۔ صفحہ ۲۸۶

۱۰۸ - کوہ طور — جزیرہ نمائے عرب کا وہی مشہور پہاڑی سلسلہ جہاں انجیل کے بیان کے مطابق حضرت موسی سے خدا نے کلام کیا اور ان پر توریت کے احکام نازل کئے۔ صفحہ ۲۹۲

۱۰۹ - کونسل آف کونسٹینس — جب کلیسا میں اصلاحات کی تحریک پھیلی تو کیتھولک کلیسا کی کمزوریاں دور کرنے کے لئے ۱۴۱۴ء سے ۱۴۱۸ء تک یہ کونسل بٹھائی گئی۔ اس کونسل نے مذہبی اصلاحات کے علمبردار جان ویکلف اور جان ہوس کے نظریات کو رد کر دیا، کیتھولک فرقے کے اندرونی اختلاف کا خاتمہ کیا اور کلیسائی اعلا اختیارات کے تین دعویداروں کو برطرف کرکے ایک نئے اسقف اعظم کو چن لیا۔ صفحہ ۲۹۲

۱۱۰ - یہاں ان تحریروں کی طرف اشارہ ہے جو جرمن یا ''سچے سوشلزم،، کے خیالات کی طرف سے پیش کی گئیں۔ یہ خیالات ۱۸۴۰ء کے بعدوالے برسوں میں جرمنی کے نچلے درمیانی

طبقے کے پڑھے لکھے لوگوں میں عام ہوگئے تھے، یہ ایک رجعت پرست رجحان تھا۔ مارکس اور اینگلس نے اپنی تصنیف ''کمیونسٹ پارٹی کا مینیفسٹو،، میں اس رجحان پر روشنی ڈالی ہے۔ صفحہ ۲۹۳

۱۱۱۔ فرانس میں فلپ دی‌اورلین کی ریجنسی ۱۷۱۵ء سے ۱۷۲۳ء تک قائم رہی جب تخت کا وارث لوئی پانزدہم ۱۵ نابالغ تھا۔ صفحہ ۲۹۶

۱۱۲۔ <u>تریر کی عبائے مقدس</u>— کہتے ہیں کہ صلیب پر چڑھتے وقت حضرت عیسی جو عبا پہنے ہوئے تھے، وہی عبا مغربی جرمنی کے پرانے شہر تریر میں کیتھولک گرجا کے اندر آج تک محفوظ ہے۔ اس عبائے مقدس کی زیارت کے لئے دنیا بھر سے زائرین کے ہجوم سالہا سال سے آتے ہیں۔ صفحہ ۲۹۷

۱۱۳۔ <u>ویندوم کی لاٹ</u>— یہ ۱۸۰۶ء اور ۱۸۱۰ء کے درمیان پیرس میں نصب کی گئی۔ نپولین نے جو فتوحات حاصل کیں ان کی یادگار کے طور پر مال غنیمت کی توپوں سے کانسی نکال کر یہ لاٹ ڈھالی گئی اور اس کے اوپر نپولین کا مجسمہ لگایا گیا۔ ۱۶ مئی ۱۸۷۱ء کو پیرس کمیون کے حکم سے یہ لاٹ زمین کے برابر کر دی گئی تھی لیکن ۱۸۷۵ء میں رجعت‌پرستوں کے غلبے نے اسے پھر اپنی جگہ جما دیا۔ صفحہ ۲۹۷

ناموں کا اشاریہ

— الف —

— ت —

— د —

— ش —

— ف —

— گ —

— ل —

— ن —

ادبی اور افسانوی شخصیتیں

اکیلیس (Achilles) — یونانی میں تلفظ اخیل۔ قدیم یونان کا رستم داستان جس نے ٹرائے شہر کا محاصرہ کیا تھا۔ هومر کی ڈرامائی نظم «Illiad» (ایلیڈ) کا هیرو۔ روایت هے که جب تک ایڑی زمین کو لگی رهتی وه فتحیاب هوتا۔ ایڑی میں تیر لگنے سے اس کی جان گئی۔ صفحات ۱۷۲، ۱۷۴

پاول (Paul) — انجیل کی روایت سے ایک مسیحی ولی گزرے هیں۔ صفحه ۱۵۳

ٹھی ٹس (Thetis) — قدیم یونانی روایت سے یه سمندر کی دیوی هے اور اکیلیس کی ماں جس نے بیٹے کو ٹرائے کے کنارے پر پہلے قدم رکھنے کی پیش بندی کر دی تھی کیوں که جو کوئی پہلے قدم رکھتا وه مارا جاتا۔ صفحه ۱۷۴

دیموکلس ((Damocles) — قدیم یونانی روایت هے که چوتھی صدی قبل مسیح میں وه سراکس کے ظالم بادشاه دیونی سس کا مصاحب تھا۔ دیونی سس نے اسے دعوت دی اور اپنے تخت پر بٹھا لیا۔ عین اس کے سر پر گھوڑے کے بال سے بندھی تلوار لٹکتی رهی۔ اس قدردانی اور دهشت کا مطلب یه تھا که دیموکلس اس سے جلنے کے بجائے دیکھ لے که انسانی عیش کے لباس میں هر وقت خطرے کا کانٹا چبھتا هے۔ تب سے یه مثل هو گئی ’’ دیموکل کی تلوار،،

یعنی خطرہ جو تلوار کی طرح برابر سر پر منڈلا رہا ہو۔ صفحہ ۲۱۳

<ins>سیرتسئے</ins> (Circei) جسے کرکا (Circe) بھی کہتے ہیں — جزیرہ ائیا کی پرانی جادوگرنی جس نے اولیس کے ہمراہیوں کو سور کی جون میں ڈال دیا تھا اور اسے سال بھر اپنے جزیرے میں رکھا۔ اس سے مراد ہوتی ہے جان لیوا حسینہ۔ صفحہ ۲۷۷

<ins>سیموئیل</ins> (Samuel) — انجیل کی روایت سے قدیم یہودی پیغمبر (اسماعیل)۔ صفحہ ۲۰۲

<ins>کراپیولینسکی</ins> (Crapulinski) — یہ جرمن شاعر ہائنے کی مشہور نظم ”دو سردار“ کا ہیرو ہے، یعنی دیوالیہ زمیندار۔ یہ نام فرانسیسی لفظ ”کراپولے“ سے لیا گیا ہے جس کے معنی ہیں کنگلا، ندیدہ، ٹوٹ کر پینے والا، نکھٹو وغیرہ۔ مارکس نے لوئی بوناپارٹ پر یہ پھبتی کسی ہے۔ صفحہ ۱۶۶

<ins>کرےویل</ins> (Crevel) — بالزاک کے ناول «La Cousine Bette» کا ایک کردار جو نودولتیے، ژولے پر ہاتھ صاف کرنے والے اور بدچلن آدمی کا نمونہ ہے۔ صفحہ ۲۹۶

— و —

<ins>واکھ</ins> (Bacchus) — واکھ رنگ رلیوں کا رومن دیوتا۔ صفحہ ۲۲۶

<ins>ہیاکوک</ins> — انجیل میں ایک پیغمبر کا نام۔ صفحہ ۱۰۵

<ins>یسوع مسیح</ins> — حضرت عیسی کا دوسرا نام۔ صفحہ ۱۰۹

پڑھنے والوں سے

دارالاشاعت ترقی آپ کا بہت شکر گذار ہوگا اگر آپ ہمیں اس کتاب کے ترجمے، ڈیزائن اور طباعت کے بارے میں اپنی رائے لکھیں۔ اس کے علاوہ بھی اگر آپ کوئی مشورہ دےسکیں تو ہم ممنون ہوں گے۔

ہمارا پتہ: زوبوفسکی بلوار، نمبر ۲۱ - ماسکو، سوویت یونین

21, Zubovsky Boulevard, Moscow, USSR